افسانے ڈرامے



عصمت چغتائی

افسانے، ڈرامے

افسانے، ڈرامے

عصمت چغتائی

مکتبہ اُردو ادب

بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

ناشر ——— سرفراز احمد
مطبع ——— زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
قیمت ——— ۹۰ روپے

ترتیب

مقدّمہ

خزاں کی ایک شام کا ذکر ہے، میں بائیسکل پر سوار اپنے دیہاتی مکان کو جا رہا تھا کہ چُنگی کی چوکی کے قریب سامنے سے پروفیسر "ف" آتے دکھائی دیئے "ف" صاحب ہمارے اُن نوجوان ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں انہیں دیکھتے ہی بائیسکل پر سے اُتر پڑا۔ اور وہ بھی میری طرف جھپٹے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنے کے لئے بے تاب ہو رہے ہیں۔ میرا خیال ٹھیک تھا۔ انہوں نے علیک سلیک کے مراحل بڑی تیزی سے طے کئے اور کہنے لگے۔

"حضرت! آپ جب تک مجھے یہ نہیں بتائیں گے کہ اس عصمتؔ کے پردے میں کون مرد واہے، میں آپ کو یہاں سے ہلنے نہیں دوں گا اور یہ آپ نے کیا وطیرہ اختیار کر رکھا ہے کہ ایسی ناقابلِ برداشت چیزیں شائع کر کے آپ ادب کی کون سی خدمت انجام دے رہے ہیں توبہ توبہ! آپ کا پرچہ اب شریف گھرانوں میں تو جانے کے قابل رہا نہیں کم از کم میں اپنی بیوی کا ایسے مضامین پڑھنا پسند نہیں کروں گا اور میری پسند کا کیا سوال ہے، انہوں نے اسے پڑھا اور بے حد ناپسند کیا۔ ہاں تو بتلایئے نا یہ عصمتؔ صاحبہ ہیں کون بلا؟"

پروفیسر صاحب ذرا جلد جلد بولتے ہیں۔ وہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ گئے ہیں، کہ اس ناگہاں حملے کے لئے تیار نہ تھا۔ کچھ دیر ساکت و ساکن کھڑا رہا اور پھر وہ تمام قوتیں اور جولانیاں مجھ میں عود کر آئیں جو کسی بے گناہ مجرم کی وکالت کے وقت انسانی دل و دماغ میں ایک زلزلہ سا پیدا کر دیتی ہیں اور میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پروفیسر صاحب کے دونوں شانوں کو پکڑ لیا اور اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اگر آپ

یہ کچھ کہتے ہیں۔ آپ، جو نہ صرف ایک روشن خیال معلّم بلکہ ایک کامیاب مصنّف بھی ہیں۔ آپ جن کا قلم ہماری خانگی معاشرت کی منتخب تصویروں میں ایسے دلآویز رنگ بھرتا ہے کہ ہمیں زندگی سے ایک محبّت سی پیدا ہو جاتی ہے اگر آپ کا یہ انداز نظر ہے تو پھر ہمارے آرٹ اور ادب کا خدا حافظ" اور پھر ہم ایک طویل بحث میں اُلجھ گئے جس کا انجام یہ ہوا کہ پروفیسر صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی شریک زندگی کے ساتھ مل کر اس ناقابلِ برداشت مضمون کو پھر سے پڑھیں گے (یہ عصمت کا ڈرامہ "انتخاب" تھا) اور مجھے ہفتہ عشرہ تک اپنی رائے سے مطلع کریں گے ابھی ایک ہفتہ نہ گزرنے پایا تھا کہ مجھے ان کی رائے ان کے ایک ساتھی پروفیسر کی وساطت سے پہنچ گئی پروفیسر "ح" ایک دن تیز تیز قدموں سے میرے دفتر میں داخل ہوئے اور آتے ہی پچھلے مہینے کا پرچہ مانگا۔ میں نے کہا "خیر تو ہے؟" کہنے لگے "کچھ نہیں "ف" صاحب سے سنا تھا آپ کے ہاں ایک غیر معمولی چیز چھپی ہے۔ کوئی لکھنے والی ہیں عصمت چغتائی، اُن کی کہتے تھے۔ یہ مصنّف نہیں سرجن ہے سرجن"—— اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے کمرے کے سب روشندان ایک دم پٹ سے کھل گئے اور روشنی کے ایک سیلاب نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا——

پروفیسر "ف" نے کیا خوب کہا تھا "یہ مصنّف نہیں سرجن ہے سرجن۔"

اور نظریے کی یہ تبدیلی کچھ طباع افراد تک محدود نہیں، ہم نے اکثر لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ گرد سے اٹے ہوئے راستے پر چلنا گوارا کرتے ہیں۔ لیکن اس نازک سی پگڈنڈی پر قدم ڈالتے ہوئے ڈرتے ہیں جسے کسی من چلے کی جرأت نے کسی سبزہ زار میں سے نکالا ہو۔ مگر ایک دفعہ جب ہمت کر کے اُس پر چل پڑتے ہیں تو پھر انہیں حیرت ہوتی ہے کہ ہم اب تک کہاں تھے۔ اگر آپ فن کی نشوونما پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں تو یہ حقیقت آئینہ ہو جائے گی کہ کل تک جو چیزیں ممنوع و معیوب تھیں وہ آج جائز اور مستحسن ہیں۔ پس آج اظہار و بیان کی جو کیفیت ہمیں چونکا دیتی ہے۔ کل یقیناً وہی ہمارے لئے ایک ندائے غیب بن جائے گی۔

عصمت کے فن کی غالباً سب سے نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ وہ اپنی بصیرت کی ایک نہایت بے باک اور صداقت شعار ترجمان ہیں اور اگرچہ ان کی یہ ترجمانی ان کی نگارش کی

پڑکاری کا نقاب اوڑھے رہتی ہے۔ لیکن از بسکہ وہ ایک ہندوستانی عورت ہیں، اس لئے اس نیم پخت دور میں انہیں اپنی جرأت کی وہ داد نہیں مل سکتی جو اُن کا حق ہے۔ داد تو ایک طرف اگر وہ اس بیداد سے بچ جائیں جس کی ارزانی میں معترضوں کے دل ان کی زبانوں کا ساتھ نہیں دیتے، تو بسا غنیمت ہے۔

عصمت کی ادبی زندگی کو شروع ہوئے ابھی بہت کم عرصہ گزرا ہے، خود ان کے برادر معظم جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی کو اپنی ہمشیرہ کے اس جوہر خداداد کا قطعی کوئی علم نہ تھا تا آنکہ ۳۹ء کے اواخر میں ادبی دنیا نے ان کے ایک دو افسانوں کا جو ساقی میں چھپے تھے، جائزہ لیا اور اہلِ ذوق کو نوید دی کہ آسمان ادب پر ایک ایسا ستارہ طلوع ہوا ہے جس کی ضوافشانیاں بہت سے راہ نوردوں کو منزل گہ مقصود کا راستہ دکھائیں گی۔ میں ابھی عرض کر رہا تھا کہ عصمت کی ایک ممتاز خصوصیت ان کی بصیرت اور اس بصیرت کی دلیرانہ ترجمانی ہے۔ موجودہ مجموعہ کے بیشتر افسانے اور مضامین خاص کر اُن کے ڈرامے ان کی اس خصوصیت کے آئینہ دار ہیں۔

انتخاب، سانپ، فسادی اور بنّے موضوع کے لحاظ سے مختلف سہی، مگر ہماری ادھ کچری معاشرت اور ہمارے تعلیم یافتہ اور مہذّب طبقے کے جنسی مسائل کے نہایت گہرے نفسیاتی مرقعے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایک اوسط درجے کا پڑھنے والا بعض بعض مقامات پر چونک پڑتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ کیا واقعی؟ ..... لیکن ڈرامہ کی روانی جب اُسے بہا کر نقطۂ عروج تک لاتی ہے تو بسا اوقات اُسے اپنی رائے بدلنی پڑتی ہے اور وہ کہہ اُٹھتا ہے "بے شک ایسا ہی ہے اور نہیں ہے تو ہوگا، ہو کر رہے گا، آج نہیں تو کل ..... ایسا ہی ہوگا"۔ مگر اُسے معلوم نہیں یہ کل آپ کا ہے۔ فرق محض دیکھنے کا ہے اور بات صرف کہہ دینے میں ہے عصمت وہ کچھ دیکھ لیتی ہیں۔ شاید اپنے عورت ہونے کے باعث جو ایک اوسط درجے کا فنکار نہیں دیکھتا اور وہ کچھ کہہ دیتی ہیں اور یہ اپنے عورت ہونے کے باوجود جو ایک اعلیٰ درجہ کا مرد افسانہ نگار نہیں کہتا اور شاید نہیں کہہ سکتا، غالباً اس لئے کہ اُسے اپنے مشاہدے پر یقین نہیں۔ شاید اس لئے کہ اس نے بعض سچائیوں کو

ایسے قریب سے محسوس نہیں کیا کہ اُن کا اظہار اپنے خلوص کی طاقت سے پڑھنے والے کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ عصمت کے فن کی یہ قابلیت اس کے فن کا سب سے بڑا سہارا ہے اور یہ ہمارے ادب کی خوش قسمتی ہے اُسے صنفِ نازک میں سے ایک ایسی لکھنے والی میسر آئی جس نے نہ صرف اس روایتی بناوٹ تکلف اور خوف کو یکسر دور کر دیا جس نے اس طبقہ کی روح کو دبا رکھا تھا بلکہ اپنی ژرف نگاہی اور حق پرستی سے ہمیں انسانی فطرت کی اُن نازک اور لطیف ترین کیفیتوں سے آشنا ہونے میں مدد دی جن تک کسی تیز سے تیز مرد صاحبِ قلم کی رسائی محال نظر آتی ہے۔

ان ڈراموں میں انتخاب اور سانپ اور افسانوں میں شادی، خدمت گار اور پس پردہ اور مضامین میں اُف یہ بچے اور ڈھیٹ ان کی ایسی تخلیقات ہیں جن میں انہوں نے جدید ہندوستانی عورت، ماڈرن انڈین گرل کی نفسیاتی نشو و نما پر بالکل نئے زاویوں سے روشنی ڈالی ہے اور اس کی زیرِ تعمیر فطرت کے چند ایسے گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔ جو اب تک ناظر اور نقاد دونوں کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ عصمت صرف اپنی صنف ہی کو زندگی کی بے رحم روشنی میں گھسیٹ لاتی ہیں۔ وہ صنفِ مقابل کی نفسیاتی تحلیل پر بھی ویسی ہی قدرت رکھتی ہیں اور تعلیم یافتہ نوجوان کی نبض بھی اسی حذاقت سے ٹٹولتی ہیں۔ جس قدرت اور حذاقت سے وہ صنفِ نازک کا جائزہ لیتی ہیں۔ ہندوستانی معاشرت، خصوصاً مسلمانوں کے طرزِ زندگی کی پابندیوں کو مدِّنظر رکھا جائے تو ہماری مصنّفہ کی غیر معمولی قوتِ مشاہدہ ہمیں حیرت میں غرق کر دیتی ہے اور ہم سوچنے لگتے ہیں کہ یہ مشاہدہ ہے یا تخیل؟ اگر مشاہدہ ہے تو آفرین اور اگر تخیل ہے تو پھر آپ کا اور ہمارا خدا حافظ ع

آج تم کل ہماری باری ہے

عصمت کے بیشتر افسانے (سہولت کی خاطر ہم یہاں اُن کے ڈراموں کو بھی افسانوں ہی میں شامل کئے لیتے ہیں) بادی النظر میں آرٹ برائے آرٹ کے نمونے نظر آتے ہیں۔ اور اگرچہ فن کا یہ رُخ بھی کچھ کم قابلِ قدر نہیں۔ لیکن درحقیقت یہ مصنّفہ بھی ایک عجیب و

غریب ستم ظریفی کا مرقع ہیں۔ جو اس نے خود اپنی ذات سے روا رکھی ہے۔ چشم ظاہر بیں موضوع کی بے باکی اور بیان کی پرُکاری ہی میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے اور افسانے کا اخلاقی پہلو آرٹ کے دُھندلکوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ فن کار کی اصلاحی غرض پوری ہو جاتی ہے لیکن وہ خود لوگوں کی کم نظری کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً شادی ایک ایسا افسانہ ہے جس کا سب سے شاید اہم عنصر اس کا اخلاقی پہلو ہے "میں" ایک ترقی یافتہ ماڈرن گرل ہونے کے باوجود فطرت کے اعتبار سے ہندوستانی نسائیت ہی کی ایک جدید تصویر ہے۔ وہ نور کی سچی الفت سے بے حد متاثر، عزت اور محبت کی اس نفسیاتی سرحد پر کھڑی ہے جہاں سے فقط ایک قدم آگے اُسے کیف و نشاط کی جنت اور ایک قدم پیچھے محرومی و حسرت کے دوزخ میں پہنچایا جا سکتا ہے اور وہ اگلا قدم نہیں اُٹھاتی اور پھر:-

"پرُانا محل گرتا ہے۔ بڑھیا اپنے برتن بھانڈے اُٹھا لے۔ اڑاڑ اڑ ادھم میرے تخیل کا بے بنیاد گھروندا ڈھے پڑا۔ ایک دم بھک سے ساری بجلیاں بُجھ گئیں اور اس مکروہ اندھیرے میں مجھے ایک ننھے سے بچّہ کی خاموش چیخیں سنائی دیں جس کے بال اور ہونٹ تاریکی کی وجہ سے صاف نظر نہ آتے تھے.....
اب ان سیاہ بدصورت بچّوں کی گودی میں مجھے اکثر وہی ننھا سا گھنے گھومے ہوئے بالوں اور بھرے ہوئے خوش رنگ ہونٹوں والا بچہ اپنے سے بہت قریب محسوس ہوتا ہے..... مگر مختار صاحب کو یہ کیا معلوم!"

(شادی صفحہ ۶۷)

شادی کے علاوہ اُن کے اکثر دیگر افسانوں کے پیکر میں تہذیب اخلاق اور اصلاح معاشرت کی ایک ہلکی ہلکی سی برقی رَو جاری رہتی ہے "برقی" کا لفظ میں نے عمداً استعمال کیا ہے۔ اس لئے کہ اگر پڑھنے والا اس رَو کو شعوری طور پر محسوس کرنا چاہے گا تو وہ اُسے جھٹک کر رکھ دے گی۔ عصمت کے ہاں ہمیشہ وہ تحت الشعور میں دبی رہتی ہے اور اُسے کبھی یہ موقع نہیں دیا جاتا کہ وہ افسانے کی سطح تک اُبھر کر اُسے نتائج و سباق کی بے کیفیتوں سے بدنما بنائے۔ لیکن یہاں فن کار خود اپنی قربانی پیش کرتا ہے وہ ایک

زبردست مصلح اخلاق ہونے کے باوجود عوام کے نزدیک عریاں نویسی کا مرتکب ٹھہرتا ہے۔ اور اس کے بے پناہ طنز اور بے مثال تجزیئے سے کچھ وہی لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جو اپنے دماغوں کے روشندان کھول چکے ہیں اور زندگی کے استقبال کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ ورنہ فن کار کو اپنے زمانے سے دو قدم آگے ہونے کے تمام نتائج خاموشی سے بھگتنے پڑتے ہیں اور وہ چُپ چاپ اپنی قربان گاہ کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ مگر یہی ہے وہ مقام جہاں فن کا دھارا دو بالکل مختلف شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ ادنے آرٹ کی شاخ رائے عامہ کے ریگستان کا رُخ کرتی ہے اور تھوڑی دور بہہ کر اُسی کی تپش آفرینیوں میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن فن عظیم کی شاخ مخالفت کی چٹانوں پر سے پٹکتی اور اعتراضات کے خس و خاشاک کو بہاتی ہوئی دیوانہ وار آگے بڑھتی ہے اور بالآخر ایک پُرشکوہ دریا کی صورت میں بقائے دوام کے سمندر سے جا ملتی ہے۔ آرٹ کی قربانی رائیگاں نہیں جاتی۔ آنے والی نسلیں اس کی پوجا کرتی ہیں اور اُسے انسانی فکر کی رہنمائی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ رائے عامہ کو بدلنے کی قوت عطا ہوتی ہے اور فن کی نئی قدریں قائم کرنے کا امتیاز مرحمت ہوتا ہے۔ عصمت اسی قبیل کی ایک ممتاز فن کار ہیں اور اپنی جنس کے اعتبار سے اُردو میں کم و بیش انہیں وہی رتبہ حاصل ہے جو ایک زمانہ میں انگریزی ادب میں جارج ایلیٹ کو نصیب ہوا جس نے وکٹوریائی تصنع اور جھوٹی وضعداری کو بالائے طاق رکھ کر ایک مصنفہ کی حیثیت سے وہ باتیں کہہ ڈالیں جو اُسے کہنی چاہئے تھیں اور جو صرف ایک عورت فن کار ہی موثر طور پر کہہ سکتی تھی۔ ممکن ہے کہ توبۃ النصوح اور شام زندگی کی ماری ہوئی ہماری موجودہ نسل عصمت کی تخلیقات کی اہمیت اور عظمت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔ لیکن یہ یقین ہے کہ کل کی مائیں اور خالائیں اُسے اپنے سینوں میں تڑپتا ہوا پائیں گی اور آج کل کی "پڑھی لکھی" شریف بیبیوں کی طرح اپنے شوہروں اور بھائیوں سے اس کی گرمی سخن کے شکوے نہیں کریں گی۔

عصمت کی ایک اور حیرت انگیز خصوصیت یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں طبقوں کی یکساں ترجمان ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے ہماری

معاشرت کے تقریباً ہر پہلو کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے اس کے لئے دیہاتی جیلنہ نیرا کا کردار بھی کتابِ زندگی کا ایک ویسا ہی کھلا ہوا ورق ہے جیسا فیشن ایبل رفیعہ کا کیریکٹر۔ اس نے محل اور جھونپڑی دونوں کے تاریک گوشوں کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا ہے اور اس کا بیان بھی موضوع کے اعتبار سے گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتا ہے۔ مکالمہ کی چستی اور الفاظ کی موزونی اگر ایک ہی نہ ہو تو کون مانے گا کہ فسادی اور جوانی ایک ہی فن کار کی تخلیقات ہیں۔ مرد مصنفین کا ذکر نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں جو ترقی یافتہ لکھنے والیاں ہیں ان میں سے کسی کے ہاں اس قدر تنوع اور بالکل مختلف مضامین پر ایسا حیرت انگیز اور یکساں قابو نظر نہیں آئے گا۔ جو قلم ڈرائنگ روم کی رنگ برنگ کیفیتوں اور پائیں باغ کے کھلنے والے دریچوں کے رومان پر روانی سے چلتا ہے وہ کسی پلیا کے نیچے بیٹھی ہوئی بھکارن کے آتشیں جذبات کی تصویر کشی سے عموماً عاجز رہ جاتا ہے۔ اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ بورژوا سوسائٹی کے روزمرہ مسائل، خصوصاً متمدن مسلمانوں کی خانگی معاشرت کی تصویر کشی میں ہماری بلند پایہ خاتون افسانہ نگاروں نے خاصی کامیابی حاصل کی ہے۔ مثلاً والدہ افضل علی اور نذر سجاد حیدر نے۔ مگر عالمگیر احساس کی دولت بہت کم افراد کے حصہ میں آئی ہے۔ عصمت ایسے چند خوش قسمت فن کاروں میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔

میں ابھی ابھی ان مکالموں کی چستی کا ذکر کر رہا تھا۔ مجموعۂ زیر نقل میں افسانوں کے علاوہ ان کے چار ڈرامے انتخاب، سانپ، فسادی، بنّے اور ایک گفتگو ڈھیٹ ان کے مکالموں کی برجستگی، چستی، ایجاز و اختصار اور برمحل روزمرّہ کی کامیاب مثالیں ہیں۔ مکالمہ کو کردار کی ذہنی سطح کے مطابق ڈھالنا اور الفاظ کے انتخاب میں ماحول کی بدلی ہوئی کیفیتوں کو مدِنظر رکھنا معمولی فن کاری نہیں ہے عصمت کے ہاں ان کی نہایت شاندار مثالیں نظر آتی ہیں۔

(رشید اور رفیعہ، بہن اور بھائی اپنے باپ کی موت کے چند روز بعد رشید کے کمرے میں بیٹھے اوپر تلے کے بہن بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے الجھ رہے ہیں کہ رفیعہ کے منگیتر غفار کے آنے کی اطلاع ملتی ہے۔)

نوکر: اہم سرکار . . . غفار میاں آتے ہیں۔

سیّد: (غصّے سے کرسی دھکیلتا ہے) اونھ! لاحول ولاقوۃ۔
رفیعہ: کیوں یہ آخر اترانے کیوں لگے؟
سیّد: (ویسے ہی چڑ کر) یہ کہاں کی رسم ہے کہ ایک تو انسان ویسے ہی پریشان ہو، اور اوپر سے لوگ آکر جان کھائیں۔

(ڈریسنگ گاؤن پہن لیتا ہے)

رفیعہ: مگر سیّد غفّار ہیں۔
سیّد: (گھٹی ہوئی آواز میں) غفّار نہیں اس کا باپ بھی ہو تو میں کیا کروں مجھے ان پرسہ دینے والوں سے چڑ ہے۔ بار بار گویا چھیڑ جلانے چلے آرہے ہیں۔
رفیعہ: (طعن سے) صبح سے نہ جانے کون کون تمہارے دوست چلے آرہے ہیں تو کچھ نہیں۔ اب غفّار کے آنے سے جل گئے!
سیّد: (جھلّا کر) تم اور مجھے جلا رہی ہو۔ جو بھی آرہے ہیں بے وقوف ہیں مانا کہ غفّار تمہارا منگیتر ہے تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ وہ ہر وقت سر پہ ہی سوار رہے۔
رفیعہ: (چڑ کر) واہ! شرم نہیں آتی بس سب کے سامنے میرا منگیتر کہہ دیا کرتے ہو۔
سیّد: اوہو تو گویا آپ شرماتی ہیں اپنے منگیتر سے۔
رفیعہ: یوں تو نہ کہو کافی شرماتی ہوں۔
سیّد: بڑی شرماتی ہو۔ میں کہتا ہوں جب اس سے تمہیں شادی ہی نہیں کرنی تو پھر اس سے چالیں کیوں چلا کرتی ہو۔
رفیعہ: اے ہے سیّد بھائی لے نہ بنو (آہٹ سن کر) ششش۔ چُپ!

(آہستہ سے پردہ ہلتا ہے اور غفّار اندر آتا ہے۔ حسین اور بھولے چہرے کو غم اور گھبراہٹ نے اور بھی معصوم بنا دیا ہے۔ تھوڑی دیر تک بے تُکی خاموشی چھائی رہتی ہے۔ تینوں بے چین۔ سیّد کو غصّہ بھی)

غفّار: (سمجھ میں نہیں آتا کیا کرے۔ ہمّت کر کے) اُف! کس قدر اُداسی چھائی ہوئی ہے۔

سیّد: (رکتے ہوئے لہجہ میں) معاف کرنا.... غفّار یہی بالکل یہی جملہ تم صبح دہرا چکے ہو۔

غفّار: (سٹ پٹا کر رحم طلب نگاہوں سے رفیعہ کو دیکھتا ہے جو سیّد کو "تنبیہاً" گھورتی ہے۔ ہمت کر کے) رفیعہ! آپ کا ارادہ تعلیم جاری رکھنے کا ہے؟

سیّد: (رفیعہ کے بولنے سے پہلے ہی) کیوں بھلا ایسی کیا خوشی کی بات ہوئی ہے جو پڑھنا چھوڑ بیٹھیں گی۔ خوب!

غفّار: (گھبرا کر) یہ میرا مطلب نہیں..... میرا مطلب یہ ہے کہ اماں جان تنہا ہو جائیں گی۔

سیّد: اونہہ! جیسے یہ اُن کے پہلو ہی سے تو لگی بیٹھی رہتی ہیں۔

غفّار: انہیں ایک غمخوار اور ہمدرد کی تو ضرورت ہوگی۔

سیّد: (جل کر) کس قدر بے وقوف ہو تم۔ بھلا یہ بیگم صاحبہ اماں جان کی کیا دلجوئی کریں گی۔ بھئی اُن کے شوہر کا انتقال ہوا ہے اور یہ قطعی نعم البدل نہیں ہو سکتیں۔

رفیعہ: (تنبیہاً) سیّد!

غفّار: (مردہ آواز میں) بھئی سیّد نہ میں تمہاری طرح چالاک اور چرب زبان۔

سیّد: تو پھر آپ کو پرسہ دینے کی آفت کیا پڑی ہے۔

رفیعہ: (ذرا ڈانٹتے ہوئے) سیّد! تم تو انسان کے پیچھے پڑ جاتے ہو۔

سیّد: (لڑائی کے لہجہ میں) تم کون! غفار کی حمایت لینے والی اس کے منہ میں کیا زبان نہیں ہے۔

رفیعہ: زبان تو ہے پر تمہاری طرح منہ میں تلوار نہیں ہے۔ میں کیوں نہ لوں حمایت۔

غفّار: (ذرا سنبھل کر) اگر رفیعہ میری حمایت بھی لیں تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟ یہ اُن کی مہربانی ہے!

سیّد: (جل کر) حمایت...... تم...... تمہیں اُس سے بہت مہربانیوں کی اُمید ہے۔

رفیعہ : (جلدی سے) سیّد دیکھو تم نے پھر میرا دل دُکھانے کی باتیں کیں۔ ابا جان کے انتقال کے بعد سے تم بہت ہی وہ ہو گئے ہو۔

سیّد : اونھ! یہ سب مکاّری ہے۔

رفیعہ : (روہانسی ہو کر) ہر وقت میرے پیچھے ہی پڑے رہتے ہو۔

سیّد : (جل کر) تمہارے؟.... تمہارے! ارے کیوں... بس..... یہ سب ہمدردی وصول کرنے کے لیئے ہے...... (اسے واقعی رونے پر تیار دیکھ کر) اچھا بھئی شروع کرو تم اپنی تقریر..... ہاں کیا کہہ رہے تھے...... کہ بڑی...... وہ اُداسی چھا رہی ہے ہاں اور کیا؟ (سانپ)

یہ پہلا منظر تھا۔ اب سین بدلتا ہے اور اس کے ساتھ ہی فضاؤں میں بھی ایک انقلاب سا رونما ہو جاتا ہے۔ تیسرے سین کے آخری ٹکڑے میں رفیعہ اپنے عروج پر ہے:۔

خالدہ : مگر اب تو رفیعہ نے فیصلہ کر لیا۔

غفار : (چونک کر) کیا فیصلہ کر لیا۔

خالدہ : یہی کہ وہ تمہیں نہیں نگلے گی۔

رفیعہ : ہاں اب تو میں ظفر کو نگلوں گی۔ یہ ہے تو پھر ہی سہی۔

(ظفر پریشان ہو کر مسکراتا ہے)

غفاّر : (سمجھ کر) تو...... تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم مجھے ٹھکرا رہی ہو۔

رفیعہ : اونھ! اب تم نے بھی غلیظ شاعری شروع کر دی۔

غفاّر : (پریشانی سے انگلیاں چٹخا کر) اور ظفر تم مجھے دھوکا دیتے رہے۔

ظفر : غفاّر! بچے نہ بنو۔ یہ فتنہ تمہارے بس کا نہیں تھا۔ شکر کرو کہ میرے ہی اوپر بیتی اور تم بچ گئے۔ تم دیکھنا وہ میری گت بنائے گی۔

غفاّر : کاش میری ہی وہ گت بن جاتی۔

خالدہ : مگر غفار سوچو تو ــــــــ

غفاّر : ایک عرصہ دراز سے یہ بات بزرگوں نے طے کر دی تھی۔

خالدہ: یہ تو ٹھیک ہے کہ آبائی حق تو تمہارا ہے۔ پر یہاں تو رفیعہ کا معاملہ آن پڑا ہے۔ وہ ایک ضدّی ہے۔

غفّار: (اندوہگیں ہوکر) میں ۔۔۔ جا رہا ہوں (نہایت اُداسی سے) رفیعہ خدا کرے تم خوش رہو۔ (دکھڑا ہو جاتا ہے)

ظفر: مجھے کوئی دعا نہیں دیتا (بڑبڑا کر) جیسے رفیعہ کو بڑی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ لوگ مجھے دعا نہیں دیتے۔

رفیعہ: (غفّار کے پاس جاکر پیار سے) غفّار تم غصّے تو نہیں ہو؟

غفّار: (غصّہ سے) نہیں۔

رفیعہ: اور رنجیدہ؟

غفّار: (رقّت سے) نہ رنجیدہ۔

رفیعہ: (ایک دم اس کا حسین چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑی محبّت سے دیکھتی ہے) تم بڑے پیارے ہو غفّار۔ تم نہیں جانتے مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔

سیّد: (زیرلب) پھر پھیلایا جال!

رفیعہ: (ویسے ہی اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے) تم کون ہوتے ہو سیّد بیچ میں بولنے والے (غفّار سے) میں تمہیں بچپن سے پسند کرتی ہوں بہت ہی پسند کرتی ہوں۔

(ظفر متحیّر آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا ہے)

غفّار: (اُمید بھری آواز میں) رفیعہ!

رفیعہ: (بڑی رومنٹک آواز میں) ہاں۔

غفّار: (اس کے بازوؤں پر ہاتھ پھیر کر) تم نے ابھی کہا کہ تم مجھ سے محبّت کرتی ہو۔

رفیعہ: ہاں اور ہمیشہ اسی طرح محبت کرتی رہوں گی (اس کا منہ قریب کرکے) تمہیں یاد ہے غفّار بچپن میں میں کس قدر تمہاری شرارتیں پسند کرتی تھی۔

سیّد: جھوٹی۔ غفّار نے کبھی شرارت کی ہی نہیں۔

غفّار: (سیّد کی پرواہ نہ کرکے جوش سے) تو پھر ۔۔۔ تو پھر ۔۔۔ رفیعہ۔

رفیعہ : ہاں پھر اب میں نے فیصلہ کر لیا۔ ظفر سے شادی کرنے کے بعد میں فوراً تمہیں گود لے لوں گی۔ کیوں ظفر! (غفّار کا چہرہ جھکا کر پیار کرنا چاہتی ہے)

(ظفر ایک دبی ہوئی اطمینان کی سانس لیتا ہے۔ اور آرام کرسی پر لیٹ جاتا ہے)

غفّار : (جسم میں ایک دھکا سا محسوس کرتا ہے) اور خاموش دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے) سانپ!! (بغیر دوسری نگاہ ڈالے ایک دم پہلے دروازے سے نکل جاتا ہے)

رفیعہ : (حیرت سے مسکراتے ہوئے اپنے خالی ہاتھ دیکھتی ہے) ارے

(ظفر، سیّد اور کچھ کچھ خالدہ بھی حیرت سے منہ پھاڑے بیٹھے ہیں)

ظفر : (گھٹی ہوئی مردہ آواز میں) سانپ! (سانپ)

آپ نے دیکھا فن کار نے سیّد، غفّار اور رفیعہ کے کرداروں کی ان کی مختلف خصوصیات میں کس طرح سمو کر رکھ دیا ہے۔ مکالمہ کی خوبیوں کے علاوہ یہ مختصر ڈرامہ اس ابدی سوال کا ایک لطیف جواب ہے کہ عورت شکاری ہے یا شکار۔ مغربی فن کاروں میں غالباً شا نے عورت کو شکاری کہا ہے لیکن ہمارے لئے عصمت کی شہادت زیادہ معتبر ہے۔ اب اسی اقتباس سے ملتا جلتا ایک اور ٹکڑا ملاحظہ کیجئے۔ جس میں کالج کی پس پردہ لڑکیوں کی ایک بے تکلف صحبت کو نہایت بے رحمی سے بے نقاب کیا گیا ہے۔ منظر لیکچر روم کی زنانہ گیلری ہے جس کے سامنے پردہ لٹک رہا ہے۔ نیچے پروفیسر صاحب لیکچر دیا کرتے ہیں جن سے طلبا کے علاوہ طالبات بھی یوں مستفیض ہو رہی ہیں۔

"اور وہ ـــ نیلی شیروانی!" طفیّل اپنی معصوم آنکھیں گھما کر بولی۔

"کون؟ وہ بطخا!" میں نے برا مان کر کہا۔

"کوئی نہیں بطخا تو نہیں ہے وہ" طفیّل اور بھی بگڑی۔

"بطخا نہیں تو پھر کون ہے۔ کیسے چیختا ہے گلا پھاڑ کے" میں نے کہا۔

"واہ اس کی تو اس قدر مردانہ آواز ہے۔ اتنا اچھا اسپیکر نکلے گا" طفیّل شرمائیں۔

"اچھا۔ آ۔ اہیں اہیں" ہم سب نے طفیّل کو گھسیٹ مارا۔

"آپ لوگ تو ظاہری شکل و صورت پر جاتی ہیں" طفیل نے بی اے میں فلسفہ

لیتے لیتے چھوڑ دیا تھا۔

"اور پیٹ کے گُن اس کے تم جانتی ہوگی۔" میں نے جل کر کہا اور۔۔۔۔۔

"رنگت!" مجھے سانولی یا کالی رنگت سے چڑ ہے۔

"اونہہ رنگت سے کیا ہوتا ہے" عذرا کی اور میری ایک گھڑی نہیں بنتی۔ یہی اس وقت ہوا۔

"جی ہاں رنگت کا سوال کیوں نہ کریں ہوتا کیوں نہیں؟" میں نے دقیق بحث شروع کی۔

"اور کیا ہوتا کیوں نہیں گھر میں کالے کالے تمباکو کے ڈھیمے بچے لڑھکتے پھریں"

"توبہ میں تو گلا گھونٹ دوں" نفاست پسند نمبر ۲ زہرہ بولیں۔

"تو کوئی ہم تمہاری بات سے کہ جا رہے ہیں اس کے لئے" میں نے کاٹ کی۔

"تم اپنی اپنی کہو۔ میں تو خیر اتنی کالی بھی نہیں۔" زہرہ نے اپنی سفید جلد کو سُرخ کر کے کہا "سفید جلد، چینی سے زیادہ سفید جلد۔۔۔۔۔"

"میں کہتی ہوں یہ نوٹ لئے جا رہے ہیں یا بر دکھوے ہو رہے ہیں۔" عذرا نے ڈانٹا۔

"وہ گیا بھینگا" سعیدہ بولیں۔

"کہہ دیا کتنی دفعہ کہ وہ بھینگا نہیں، بھینگا نہیں کل ہی میں نے ادھر سے دیکھا تھا۔ بالکل سیدھی تارا جیسی آنکھیں ہیں" میں نے زخمی شیرنی کی طرح بپھرنا شروع کیا۔

"اور وہ ––– وہ جو ہے ––– وہ کیا نام ہے ذرا گنجا سا" عذرا باوجود کوشش کے نام نہ یاد کر سکی۔

"اونہہ بختو گنجے سے تو۔" میں منہ پھلا کر بنچ پر دراز ہو کر اونگھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"گنجا بڑا خوش قسمت ہوتا ہے،" میں نے کہا تاکہ طفیل نے فلسفہ لینے کا پختہ ارادہ کر کے چھوڑ دیا تھا۔

"معاف کرو بابا، ہم بد قسمت ہی بھلے۔" عذرا نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

اس دن ہم میں سے کسی کا دل نہ لگا نہ ہی نوٹ لئے۔ نہ لیکچر سُنا۔ کیا سُننے۔

مندرجہ بالا اقتباس میں بیان کے بے ساختہ پن اور زبان کی لطافتوں کے علاوہ جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ موضوع کی نزاکت سے فن کار کی عہدہ برآئی ہے کون نہیں جانتا کہ عورتیں بھی انسان ہوتی ہیں اور تعلیم یافتہ لڑکیاں فطرت کی سوتیلیاں نہیں ہوتیں کہ وہ انہیں ان تمام ذہنی جولانیوں اور جذباتی کیفیتوں سے محروم رکھے جو وہ اس فراخدلی سے اپنے بیٹوں کو بانٹتی ہے۔ لیکن غضب ہے کہ ہمارے ہاں آج تک اس حقیقت کے اظہار کی خفیف ترین کوشش کو بھی نہایت ناپسندیدگی سے دیکھا گیا ہے شاید اس لئے کہ سوسائٹی اپنے بلند بانگ دعووں کے باوجود عورت کو اب تک انسانی درجہ دینے پر تیار نہیں ہوئی یا شاید اس لئے کہ خود طبقہ نسواں نے چند مسئلہ مسائل بتانے والی خادماؤں یا ہفتہ وار "زنانہ" پرچوں میں جواب لکھنے والی انشاپردازوں کے سوا کوئی ایسی جری مفکرہ اور کوئی ایسی دلیر راہبر پیدا نہیں کی۔ جو اُسے آزادی فکر کے ساتھ ساتھ جرأت سخن سے بھی آشنا کرتی عصمت نے اپنی موجودہ کاوشوں سے ہمارے سماج کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس نے عورت کو وہ باتیں سوچنے اور بیان کرنے کا راستہ دکھایا ہے جنہیں وہ اب تک اپنے نفس کی گہرائیوں میں محسوس کرتی تھی لیکن جن کے اظہار پر اُسے قدرت نہیں تھی بلکہ جنہیں شاید وہ سوچتے ہوئے بھی ڈرتی تھی اور خوبی یہ ہے کہ فن کار نے زندگی کی یہ مستور حقیقتیں ایسے دلاویز اور بے ضرر طریقے سے پیش کی ہیں کہ ہمارے اوسط درجے کے پڑھنے والے جو ہمارے چھوٹے اور ادنیٰ ادب کے تکلفات اور تصنعات کے عادی ہو چکے ہیں اس تیکھے میوے کو چکھ کر بے مزہ نہیں ہوتے بلکہ آہستہ آہستہ اس سے لطف اندوز ہونے لگتے ہیں۔ موضوع کو سلیقے سے نبھانے کی یہ حیرت انگیز قدرت مجھے اُردو کے کسی اور مصنف میں ایسی فراوانی سے نظر نہیں آتی، ایک مثال دیکھئے:۔

گیارہ بارہ برس کی دو لڑکیاں جن میں سے ایک مالکن اور دوسری دھوبن کی لڑکی ہے۔ جنس کی اُبھرتی ہوئی کیفیتوں سے متاثر ہو رہی ہیں۔ دھوبن کی بیٹی مالکن کے جوان لڑکے کی نظروں میں سما چکی ہے اور آگے چل کر اپنے مقام زندگی کی مخصوص کیفیتوں کا شکار ہو جائے گی۔ مالکن کی بیٹی اپنے اندر جو ایک مبہم سی کمی محسوس کرتی ہے اس کے اظہار میں فنکار نے اعجاز دکھایا ہے۔

" اسے ہے۔ یہ کیا ہے؟" بھیّا نے نفرت سے پسی ہوئی اینٹ کی ڈھیری کو جوتے

سے بکھیر کر کہا۔ ان کی اُجلی قمیص بھی خراب ہو گئی۔ وہ اسی پر چڑھ بیٹھے تھے " یہ تو سیندور ہے، ہم نے بنایا ہے" میں نے فخر سے کہا۔

بھیّا اُنگلی سے سیندور سے کھیلنے لگے اور اپنے پیر سے گیندا کا پیر دبایا۔

" لائیں تیرے لگاؤں" بھیّا نے سیندور لے کر گیندا کے لگا دیا۔

" اوں" اور اس نے ہتھیلی سے سیندور چھٹا دیا۔

" بھیّا گیندا تو بدھوا ہے، وہ سیندور کب لگاتی ہے" میں نے اپنی قابلیت جتائی۔

" لگائے گی کیسے نہیں چڑیل!" اور اُنہوں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر پیچھے دھکیلا۔ اُس نے اپنا منہ چھپا لیا۔

" گیندا! پھر میں تجھ سے بولوں گا بھی نہیں۔" اور گیندا نے آخر کو مُنہ کھول ہی دیا۔

" گیندا!" بھیّا نے اس کے قریب سرک کر کہا" بیاہ کرے گی؟"

" ہٹ" اور وہ شرما گئی۔ میں بھی حرص میں شرمانے کی کوشش کرنے لگی۔

" گیندا!" بھیّا نے برآمدے سے پُکارا" یہ کوٹ استری کے لئے لے جا"

وہ میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مُسکراتی ہوئی چلی۔ گیندا کیسے چلی تھی جیسے لچکی جا رہی ہو۔ میں جب چلتی تھی تو دھپا دھپ جیسے گھوڑا دوڑ رہا ہو۔ میں تو ..... اونہہ میرا جی گھبرانے لگا۔ اور میں جل کر باغ میں پانی دینے کی ہودی میں ایک لکڑی اُٹھا کر گھنگولنے لگی۔ صبح کی پیسی ہوئی گیندا کا سیندور اب وہیں پڑا تھا بھیّا نے گیندا کے تو لگایا اور میرے لگانا شاید بھول گئے۔ بھول کیوں گئے، جان کر ہی نہیں لگایا۔ حالانکہ میں ان کی سگی بہن ہوں اور گیندا ..... وہ تو ان کی کوئی بھی نہیں ہے۔ مجھے بھیّا سے نفرت ہو گئی اور میں زور زور سے لکڑی ہلانے لگی۔

" ہاں ہاں کیا کرتی ہو بی بی" میوہ رام نے پیچھے سے آکر کہا۔

میں غور سے میوہ کو دیکھنے لگی۔ میوہ بھی تو میرا کوئی نہیں۔ میں نے سوچا۔ مگر میں اس کے ہاتھ دیکھ کر اداس ہو گئی۔ کیا مجال جو یہ کمبخت ذرا اپنے ہاتھ مانجھ کر میل چھڑائے۔ ہر وقت مٹی کھودتا رہتا ہے مگر خیر۔

" میوہ!" میں نے نرمی سے کہا" ذرا یہاں آ" اور میں غور سے لکڑی میں سے بوندیں ٹپکتی ہوئی

دیکھنے لگی۔

"کیا؟" وہ لاپروائی سے مڑا اور ٹوپی آنکھوں پر سرکا کُدّی کھجانے لگا۔

"یہ..... یہ سیندور میرے ماتھے پر لگا دے" میں نے لجاجت آمیز لہجہ میں حکم دیا۔

"یہ سیندور ہے" وہ گھے گھے ہنسنے لگا اور چلا مڑ کر۔

"سن بھئی — میں تو — میوہ — ذرا ٹھہر جا" ایک نئے خیال کے ماتحت میں نے کہا۔

"کیا ہے بی بی؟" وہ ذرا سا مڑ کر بولا۔

"میوہ..... بیاہ کرے گا۔" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"بیاہ! میرا تو بیاہ ہو بھی گیا" وہ کھرپی کا دستہ پیڑ کے تنے سے ٹھونکنے لگا۔

"کب؟" میں نے مُردہ آواز سے کہا۔

"ارے رام! مدتیں گجر گئیں۔" اس نے ایسے کہا گویا کوئی بات ہی نہیں۔

"اچھا تو تُو بدھوا ہے" میں نے فیصلہ کیا۔

"ارے نہیں" وہ ہنسنے لگا۔ "کون کوٹھریا میں مالن بیٹھی ہے۔"

"کیا مالن سے تیرا بیاہ ہوا تھا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہوں" اور وہ چل دیا۔

اچھا تو وہ بڑھیا جسے میں میوہ رام کی اماں سمجھی تھی اس کی بیوی تھی۔ "کیسی عجیب دنیا ہے" میں نے سوچا اور پھر ہودی میں لکڑی ڈال کر زور زور سے گھمانے لگی..... میں نے جھک کر اپنا گریبان سونگھا کہ شاید وہاں بھی کسی عطر کی خوشبو ہو۔ مگر دور دور کہیں خوشبو کا نام نہ تھا۔ ہاں صبح جو سالن گر گیا تھا۔ البتہ اس کی بساندھ تھی۔ میں چڑ گئی۔

نفسیات طفلی اور اس کے نازک ترین پہلو یعنی جنسی نشو و نما پر ایسا ماہرانہ عبور کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن اس سے بھی حیرت انگیز بات فن کار کی وہ صناعی ہے جس سے وہ ایسے موضوع کو اس خوبی سے قابو میں لاتی ہے کہ ذوقِ سلیم پر کوئی اشارہ یا کنایہ گراں نہیں گزرتا۔ ہاں خوب یاد آیا۔ عصمت کے آرٹ کی ایک بہت بڑی خوبی اس کی کنائیت ہے۔ اس طلسم کی مدد سے وہ بہت سے دشوار گزار مرحلے چٹکیوں میں طے کر لیتی ہیں اور بہت سی اَن کہی باتیں محض ایک

اشارہ سے اس طرح سمجھا دیتی ہیں کہ دوسرے کے ہزار الفاظ بھی اس خوبی سے نہیں سمجھا سکتے۔ انتخاب سانپ، تاریکی خدمت گار اور کافران کی اس کنایئت کے کمالات سے بھرپور ہیں ۔کاش میں ایک مختصر مقدمہ کی بجائے ان کے فن پر ایک کتاب لکھ رہا ہوتا۔ پھر آپ کو ایک ایک کنائے کی بہار دکھاتا۔ لیکن کیا کروں دامان نگہ کی تنگی سے عاجز ہوں۔ صرف ایک کنائے کا لطف اُٹھاتے جایئے۔

(جاں نثار خادم اور اپنے ابّا جان کی چہیتی بیٹی کی گفتگو ہے:)

"کیا دُکھ بڑے کٹھن ہوتے ہیں ؟"

"ہاں ایک ننگے بھوکے خدمت گار کے لئے،" اُس نے انگلیاں چٹخا کر کہا۔

"اور جو بھوکے ننگے خدمت گار نہیں ہوتے انہیں کیا دُکھ ہی نہیں ہوتا؟"

"کیا ان کو بھی دُکھ ہوتا ہے؟" وہ امید بھری آواز میں بولا اور سیدھا ہو بیٹھا۔

"ہاں"

"کیا وہ بھی اپنی ٹوٹی ہوئی کوٹھری.... نہیں.... میرا مطلب ہے صاف ستھرے کمرے میں چھپ چھُپ کر رویا کرتے ہیں؟" اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"ہاں۔"

"اور کیا وہ بھی اُن ..... وہ بھی ایک امیر اور طاقتور انسان کو دیکھ کر کہ وہ ..... کہ جب وہ ...... اس کو دیکھتے ہیں تو گھنٹوں جلا کرتے ہیں" اس نے چبا چبا کر بے ترتیبی سے کہا۔

"کون سے طاقتور امیر انسان کو ؟ رشید کو ؟" میں نے شرارت سے کہا۔

"ہاں" اور وہ شرمندہ ہو کر زور سے بولا۔

"تم.... طاقتور انسان کی یہی تو پہچان نہیں کہ وہ موٹا ہو اور بہت سا روپیہ کھاتا ہو۔ بلکہ .... بعض.... بلکہ...."

میں الفاظ ڈھونڈھنے لگی۔

"بلکہ ؟" اس نے شوق سے پوچھا۔

"تم بے وقوف ہو!" میں نے اُسے دور دھکیل کر کہا۔

آقا اور خادم کا رشتہ کبھی کا ٹوٹ چکا تھا۔ (خدمت گار)

اور اب ایک لفظ عصمت کی تشبیہات کے متعلق۔ افسانوی ادب میں تشبیہات محض زیبائشِ سخن کا کام نہیں دیتیں بلکہ ایک مخلص فن کار کے استعاروں اور تشبیہات کو تاثرات کے خزانوں کی کنجیاں کہا جا سکتا ہے۔ وہ چپکے سے اس تحت الشعور میں سے نکلتی ہیں اور نہایت خاموشی اور بے تکلفی سے اپنی جگہ پر جا بیٹھتی ہیں۔ ایسی تشبیہیں ادب کے انمول جواہر ریزوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ عصمت کے ہاں ان کی بہتات ہے اور وہ اس اعتبار سے اپنے ہمعصروں سے بہت زیادہ خوش قسمت اور صاحبِ ثروت ہیں۔ وہ انہیں براہِ راست زندگی کے معدن سے حاصل کرتی ہیں۔ اسی لئے وہ تصنع اور تکلف سے بری اور ایک اچھوتے کیف سے معمور ہوتی ہیں میں نے چاہا تھا کہ یہاں ان کی کچھ مثالیں بھی دوں۔ لیکن جب اس ہیرے بھرے خوان پر نظر پڑتی ہے تو نگاہِ انتخاب کام کرنے سے جواب دے دیتی ہے۔ اس لئے یہ خوشگوار کام آپ ہی کے لئے چھوڑتا ہوں۔

یہ سطور لکھ چکا تھا کہ اچانک "انتخاب" کے آخری صفحے پر نگاہ گئی اور معاً ایک لاجواب تشبیہہ نظر پڑ گئی۔ اب آپ اسے دیکھتے ہی جایئے۔

(خالہ بی درمیانی عمر کی ایک دل شکستہ خاتون ہیں جن کا پریم سپنا پریشان ہوا چاہتا ہے ڈرامے کا آخری منظر آپ کے سامنے ہے)

خالہ بی کچھ دیر حیرت سے اُسے جاتا دیکھتی ہیں۔ اس کے جاتے ہوئے پیروں کی آواز کو ایک نغمے کی طرح کان لگا کر سنتی ہیں۔ ذرا دیر میں ان کی نظر اُس کی ٹوپی پر پڑتی ہے، جو وہ گھبراہٹ میں بھول گیا ہے۔۔۔۔ وہ عجیب انداز میں بڑھ کر اُسے اُٹھا لیتی ہیں۔ ایک متبرک اور نازک مجسمے کی طرح اُسے دیکھتی ہیں۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں پھیکی ہو کر بند ہونا شروع ہوتی ہیں اور بڑے بڑے بے رونق آنسو رخساروں پر ڈھلک آتے ہیں۔ گردن ذرا پیچھے گر جاتی ہے اور وہ ٹوپی کو آہستہ آہستہ ایسے سہلاتی ہیں۔ جیسے شکستہ ماں اپنے بچے کو ٹٹولتی ہے۔

خالہ بی کی عمر ان کی بے اولادی اور ان کی پہلی اور آخری محبت کی بد انجامی پر غور کیجئے اور

پھر اس نادر تشبیہہ کی داد دیجئے۔ عالم کی ٹوپی فن کاری کے جس کمال سے "سمبل ازم" کی تمام منزلیں طے کر کے ادھیڑ اور خوب صورت بیوہ کا بے جان بچہ" بن جاتی ہے وہ کچھ عصمت ہی کا حصّہ ہے۔

اُردو میں جدید انشا یعنی ماڈرن ایسّے پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ ہمارے ہاں ٹھوس مقالے تو اب کافی تعداد میں نظر آنے لگے لیکن قابلِ ذکر ایسّے بہت کمیاب ہیں۔ موجودہ مجموعے میں دو تین اعلیٰ پائے کے ایسے مضامین شامل ہیں جو انگریزی جیسی ترقی یافتہ زبان کے بہترین ایسّے (ESSAY) کے مقابل رکھے جا سکتے ہیں "اُف یہ بچے"، "بچپن"، اور "ڈھیٹ" انشا پردازی کے نہایت قابلِ قدر نمونے ہیں اُن کا ہلکا ہلکا مزاح اور طنز، عصمت کے اسٹائل کی ممتاز خوبیوں میں سے ہے اور ہمیں امید ہے کہ انہیں اس صنفِ ادب میں بھی ویسی ہی کامیابی اور مقبولیت حاصل ہوگی جیسی انہیں افسانہ نگاری کے میدان میں ہوتی ہے۔

اس مختصر تمہید کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک بار پھر عصمت کی فن کاری کے ایک نمایاں پہلو کا ذکر کر دینا چاہتا ہوں اور وہ اُن کی کردار نگاری کا کمال ہے۔ ڈرامہ ہو یا افسانہ، وہ اپنے کردار کو انسانیت کا مکمل نمونہ بناتی ہیں یاد رہے کہ میں انسانیت کا لفظ عمداً اس کے محدود معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ یعنی میں اُسے ماورائے انسانیت اور حیوانیت سے ایک علیحدہ چیز تصوّر کرتا ہوں۔

عصمت اپنی تخلیقات میں کوئی معیاری ہستیاں پیش نہیں کرتیں۔ وہ محض گوشت اور خون کے پُتلے ہمارے سامنے لاکھڑے کرتی ہیں جن میں محاسن و معائب کا ویسا ہی قدرتی امتزاج ہوتا ہے اور کمزوریوں اور خوبیوں کی ویسی ہی نفسیاتی ترکیب پائی جاتی ہے جیسی حقیقی دنیا میں دیکھنے والوں کو قدم قدم پر ملتی ہے۔ اسی لئے اوسط درجے کے پڑھنے والے جنہیں افسانوی ادب میں آئیڈیل شخصیتوں سے دوچار ہونے کی ایک عادت سی ہے عصمت کے افسانوں میں بعض اوقات ایک مایوسی اور تلخی سی محسوس کرتے ہیں مجھے یاد ہے کہ جب اُن کا افسانہ "نیرا" پہلے پہل چھپا تو مجھ سے ایک بہن اور کئی پڑھے لکھے لوگوں نے اس کی بدانجامی کی شکایت کی کیونکہ اس سے ان کا وہ معیار چُور چُور ہوتا تھا جو ایک ستم رسیدہ اَلھڑ لڑکی کی سیرت کے متعلق عوام پسند افسانہ نگاروں نے قائم کر رکھا ہے وہ

غالباً یہ چاہتے تھے کہ نیرا خودکشی کر لے یا جوگن بن جائے اور ہوا یہ کہ جب اس کے بہکانے والے محبوب نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو نیرا نہ روئی نہ پیٹی۔ اس نے خاموش ہو کر ایک طرف ڈال دیا۔ وہ اُسے دیر تک پُچکارتا رہا۔
"میں سال پر تمہیں روپیہ بھیج دیا کروں گا۔ تم بڑی سُکھی رہو گی۔"
"سُکھی، سُکھی تو وہ کبھی رہی ہے نہ رہے گی۔ ہاں یہ چند ماہ اس کی زندگی میں ہمیشہ ستاروں کی طرح جگمگاتے رہیں گے۔ ایک بار ہی، پر اس نے سکھ دیکھ تو لیا اوروں کی طرف دیکھو جنہیں یہ بھی نہیں ملتا۔
اُسے لچھمی کا خیال آیا۔ دھتکاری ہوئی کتیا کی طرح اپنے بچے کو لٹکائے کونے کونے میں مُنہ چھپاتے پھرتی ہے کہنے کو تو یہ گنوار بڑے غریب ہیں، پر ایسی باتوں میں نہ جانے کدھر سے شرم آنے لگتی ہے۔ کچھ نہیں تو "عزت عزت" ہی پکارنا شروع کر دیا۔ وہ گاؤں تو نہ جائے گی۔ پھر کہاں؟"

روپا کی سرد ہوئی دُکان چل نکلی اور نیرا اس کی ہو گئی تندرست جسم اور چکنے ہوئے گالوں سے اس نے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ یہی ایک عورت کی دولت ہے چاہے وہ لونڈی ہو چاہے رانی، جب تک بدن چُست ہے اور گال چکنے ہیں سب کچھ ہے اور پھر؟ پھر تو کچھ بھی نہیں۔ نیرا کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ سوائے گوبر تھاپنے اور گھاس چھیلنے کے کسی اور مصرف کی بھی ہو سکتی ہے اب یہاں تو اس کی یہ حالت تھی کہ کیا امیر اور کیا غریب ہر ایک کے لئے اُس کے آشرم کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ایک چھوڑ دس سُندر، بیس سیتل اور ان گنتی سیٹھ موجود تھے۔ جب شہر کے نوجوان اور تندرست لوگ اپنے اُجڑے ہوئے گھر یا سڑی بُسی چرچڑ بیویوں سے عاجز آ جاتے تو سکونِ قلب کی تلاش میں اسی کے در کی خاک چاٹتے۔
کبھی ایک آدھ تھکا مارا مرگھلا سا کلرک دو چار ٹوٹی ہوئی بیڑیاں جیب میں ڈالے

اس کے دربار دکرم سے بخشش چاہتا تو روپا بھیڑنی کی طرح اس پر غرا کر دوڑتی اور وہ جلی کٹی باتیں کہتی کہ وہ اپنا سا منہ لے کر چل دیتا تو نیرا کا جی بے چین ہو جاتا۔ اگر وہ روپا سے نہ ڈرتی ہوتی تو اس مردہ دل دکھی کو پکڑ کر واپس لے آتی اور اس کا تھکا ماندہ سر اپنے معطر سینے سے لگا کر اسے تسکین دیتی۔ وہ بھی تو کبھی دکھی تھی،

ایک سندر نے اسے بیوی نہ بنایا تو کیا ہوا کیا مرغ نہیں ہوتا تو اذان نہ ہوتی اب وہ سارے جگ کی بیوی تھی۔ ایک چھوڑ دس سندر، بیس سینتل موجود تھے۔ پر جب کوئی نیا مہمان آتا تو وہ کسی سوچ میں پڑ جاتی۔ مقدس آگ کے گرد وہ بھانوریں پڑتے دیکھتی اور اپنا سر ایک نئی دلہن کی طرح جھکا لیتی اور وہی آگ ایک دم بھڑک اٹھتی اور پھر سکھ ہی سکھ! اور پھر سکھ کیا ہوتا ہے؟ سب ہی آتے تھے۔ پر سندر اس کا سب سے پہلا سندر کبھی نہ آیا۔ نہ جانے وہ کہاں تھا، شاید کسی نئی نیرا کے سنگ۔ مگر نیرا کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ ماضی کے متعلق سوچ سکے۔ حال اور مستقبل ہی اس کے لئے بہت تھے اور پھر اس کی نئی ساڑھی میں فیتہ بھی تو نہیں لگا تھا۔۔۔

زندگی کی بے رحم زندگی کی الجھنوں کا نفسیاتی حل اس ٹکڑے میں فن کار نے پیش کیا ہے۔ اپنی حقیقت نوازی کے لحاظ سے یقیناً بے مثال ہے اور اس کا سب سے خوبصورت پہلو نیرا کی بظاہر کمزور سیرت کی وہ تڑپا دینے والی کیفیت ہے جس کے زیر اثر وہ روپا سے نہ ڈرتی ہوتی تو ضرور اس مردہ دل دکھی کو پکڑ کر واپس لے آتی اور اس کا تھکا ماندہ سر اپنے معطر سینے سے لگا کر اسے تسکین دیتی وہ بھی تو کبھی دکھی تھی۔" کردار نگاری کی ایسی کامیاب مثالیں ہمارے ادب میں بہت کمیاب ہیں۔

اور اب آئیے اس چمنِ بے خزاں کی بہاروں میں کھو جائیں۔ آپ پہلی بار اور میں خدا جانے۔۔۔۔۔۔

صلاح الدین احمد

پردے کے پیچھے سے

" دیکھیں — دیکھیں — ذرا ہٹو تو!" زہرہ نے مجھے قریب قریب پیچھے لٹاتے ہوئے کہا۔ اور اپنی زبردست ناک نعمت خانے جیسی باریک نالی سے چپکا دی اور دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ بالکل ہکا بکا۔ لیکن فوراً سنبھلی۔

"اُہو تو! کوئی بھی نہیں، ایسا تو کوئی حبشن بھی نہیں۔ سوکھا مارا۔" زہرہ نے عینک پھڑکا کر کہا۔

" سوکھا! یہ سوکھا ہے؟ ذرا دیکھنا عذرا،" میں نے عذرا کو اپنے اوپر لٹایا۔

" کوئی بھی نہیں! — مگر وہ — اُدھر ذرا اُدھر" عذرا نے بالکل دوسری طرف ہم لوگوں کو متوجہ کیا۔

" کون وہ داڑھی ہے — لعنت!" زہرہ ہٹ گئی۔ میں نے بھی دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

" ارے نہیں وہ — ایک — دو — تین — وہ چوتھے نمبر پر، ہیں نا زہرہ!" عذرا نے تڑپ کر کہا اور زہرہ کی گردن بالکل دائیں طرف کو مروڑ دی۔

" کیا بطخا؟" زہرہ بگڑ گئی۔

" ارے وہ نہیں — وہ پچھلی لائن میں — وہ — دور — ہ —" عذرا نے کہا

" اچھا وہ سا۔ میں نے کل ہی دیکھا تھا،" طفیل نوٹ بک الٹ کر بولیں ستم نے

" اے وہ کل تھا بھی۔ ہونہہ،" عذرا کو برا لگا کہ کل وہ کچھ نہ دیکھ سکی۔

" لو — کل تھا کیسے نہیں!" سعیدہ بھی بول ہی دیں۔

" لو اور لو" ہم سب جل گئے۔ "یہ دونوں کل ہی سے دیکھ رہی تھیں اور ہمیں ذرا جو پتہ ہو۔ اچھا خیر۔"

زہرہ نمبر ۲ ہماری مجلس سے باہر دُور کونے سے، ناک اُٹھائے ایک سفید ہاتھ کو تیزی سے قلم چلاتے دیکھ رہی تھی ہم نے مُسکرا مُسکرا کر ایک دوسرے کو ٹھوکے دیئے اور سوں سوں ناکیں بجانے لگے۔

"ارے — ارے" میں نے ایک دم مجروح ہو کر کہا۔ زہرہ سمجھی اس کے ملڑی نما بوٹ سے میرا پیر کچل گیا۔

میں نے زہرہ اور عذرا کی گردنیں ایسی زور سے بائیں طرف جھکائیں کہ سکھنو سے تانگے کے کفر شکن جھٹکوں سے تین دن تک دکھاکیں۔

"اچھا — ہاں — اوئی — مگر ہنستا کیسے ہے!" زہرہ نے بہ غور دیکھ کر کہا۔

"ہاں ساری داڑھیں تک نظر آتی ہیں۔" عذرا نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"اور کچلی پر سونا کیسے چمک رہا ہے۔" زہرہ نے ناک سکیڑی۔

"لو وہ پھر ہنسا۔ سچ کہتی ہوں کوا تک نظر آ گیا"، عذرا کھسکنے لگی دور —

"ہوں — کوا نہیں تمہیں تو اُس کے پھیپھڑے نظر آنے لگے"، میں چڑ گئی۔

"اور وہ — نیلی شیروانی؟" طفیل اپنی معصوم آنکھیں گھما کر بولی۔

"کون؟ وہ بطخا!" میں نے بڑا مان کر کہا۔

"کوئی نہیں بطخا تو نہیں ہے وہ" طفیل بگڑی۔

"بطخا نہیں تو پھر کون ہے — کیسے چیختا ہے گلا پھاڑ کے" میں نے کہا۔

"واہ۔ اس کی تو اس قدر مردانہ آواز ہے۔ اتنا اچھا اسپیکر نکلے گا" طفیل شرمائیں۔

"اچھا — آ — آہیں آہیں آہیں"، ہم سب نے طفیل کو گھسیٹ مارا۔

"آپ لوگ تو ظاہری شکل وصورت پر جاتی ہیں۔" طفیل نے بی۔اے فلسفہ میں لیتے لیتے چھوڑ دیا تھا۔

"اور پیٹ کے گن اس کے تم جانتی ہوں گی"، میں نے جل کر کہا اور بار بار گر جانے والے پردے کو پن سے اُٹھایا۔

"آپ لوگ تو پھر گاندھی جی کو نہ جانے کیا سمجھیں گی" طفیل کی مدد سعیدہ نے کی۔

"بھلا گاندھی جی کو ہم کیوں "کچھ" سمجھنے لگے۔ وہ ہمارے باپ کے برابر ہیں واہ"، ہم سب بڑا ماننے پر تُل گئے۔

"جب گاندھی جی دیکھنے کی چیز تھے تب تو انہیں "کچھ"، سمجھ بھی سکتے تھے" عذرا بولیں اور مسکرائیں۔

"اور اب وہ دیکھنے کی چیز نہیں" طفیل لڑ پڑیں۔

"تم بھی دیوانی ہو۔ بھئی اس وقت اُن کا کیا ذکر ہے اور ویسے تم جو یہ پوچھو کہ وہ حسین ہیں تو ہم ہاں کہنے سے رہے۔ چاہے یہودیوں کی طرح ہندوستان سے باہر کر دیئے جائیں" انصاف پسند زہرہ بولی۔

"غضب!" زہرہ نمبر ۲ پھڑک کر بولیں ہم سمجھے پروفیسر صاحب آ گئے اور جلدی جلدی قلم ڈھونڈھنے کے لئے گریبان اور جیبیں ٹٹولنے لگے۔

"وہ" زہرہ نمبر ۲ نے نہ جانے کدھر اُنگلی نچائی "وہ ــــ عشرت صاحب کی بائیں مونچھ کی نوک کی سیدھ میں"، سب نے عشرت صاحب کی مونچھ کی سیدھ لی اور غور سے دیکھا۔ پھر سب آہستہ آہستہ اپنی ناکوں کو جالی پر ٹھلانے لگے۔ ہاں بات تبھی بھی تھی اور کام کی بھی۔ ایک کھلبلی سی مچ گئی اور ہم ایک دوسرے کے بازو دبانے لگے۔

"رنگت"، مجھے سانولی یا کالی رنگت سے چڑ ہے۔

"اوہو۔ رنگت سے کیا ہوتا ہے" عذرا کی اور میری ایک گھڑی نہیں بنتی اور یہی اس وقت ہوا۔

"جی ہاں رنگت کا سوال کیوں نہ کریں۔ ہوتا کیوں نہیں؟" میں نے اپنی دقیق بحث شروع کی۔

"اور کیا ہوتا کیوں نہیں۔ گھر میں کالے کالے تمباکو کے ڈھیمے بچے لڑھکتے پھریں تو یہ میں تو گلا گھونٹ دوں"، نفاست پسند نمبر ۲ زہری کر لیں۔

"تو کوئی ہم تمہاری بات لے کر جا رہے ہیں۔ اس کے لئے"، میں نے کاٹ کی۔

"تم اپنی اپنی کہو۔ میں تو خیر اتنی کالی بھی نہیں۔" زہرہ نے اپنی سفید جلد کو سُرخ کر کے

کہا ـــ سفید جلد۔ چینی سے زیادہ سفید جلد۔

"سشش۔ شی۔ شی۔ جیب صا ـــ کھڑ کھڑ بنچیں سرکیں اور سیاہ شیروانیاں جیسے کھونٹیوں پر لٹک گئیں، سب کھڑے ہو گئے۔

"اور قد ڈیڑھ فیٹ"، میں نے باہر جھانک کر خوشی سے مڑتے ہوئے کہا عذرا کو دی۔

دُوسرا سین

"لکس سوپ"، سعیدہ بولیں۔

"اِنوسینٹ آئز"، زہرہ نے چوٹ کی۔ سعیدہ شرما گئیں۔

"اور۔ وہ تو ... مجھے کہا ہے"، میں نے اِٹھلا کر کہا۔

"اے چلو ـــ دھنیا جیسی آنکھیں"، عذرا بڑبڑائی۔

"او ہو۔ عینک کی وجہ سے ذرا ویسی لگتی ہیں۔ یہ دیکھو۔ میں نے عینک ہٹا کر کوئے تک آنکھیں پھاڑ دیں۔

"ہاں ہوں گی بڑی"، عذرا نے بے دیکھے بک دیا۔ بیہودہ کہیں کی۔

"ہاں مگر اِنوسینٹ تو ہرگز بھی نہیں جیسے قبر کے بجّو کی سی تو آنکھیں ہیں"، زہرہ پر ہذیان کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور میرا جی چاہا سعیدہ کی بڑی بڑی آنکھیں کسی پھنسی پھوڑے سے پٹم ہو جائیں۔

"گلشن کہہ رہی تھیں کسی نے انہیں بتایا ہے کہ میرے ہی لئے کمبختوں نے کہا ہے۔" سعیدہ اِترائی۔

"تم مر بھی جاؤ تو تمہارے لئے نہیں کہا۔ ہم مان ہی نہیں سکتے"، میں نے کہا اور سب نے مان لیا۔

"اگر کہا بھی ہوگا تو عذرا کو کہا ہوگا"، زہرہ نے رائے دی۔ عذرا کی زہرہ سے بڑی دوستی ہے

"خیر عذرا کے لئے تو کبھی نہیں کہہ سکتے"، عذرا کے لئے کہنے میں سعیدہ کی اُلّو جیسی آنکھوں کی ہتک ہوتی تھی۔ اس لئے اس کا بگڑنا حق بجانب تھا۔

"اے ہے اس چرخ سے تو میری جان جلتی ہے۔"، میں نے باہر جھانک کر موضوع بدل دیا۔

اور سب نے جھک کر ایک باریک شکل کی چڑیا جیسی مونچھوں کو گھورنا شروع کر دیا۔

"اسے ہے نیل ڈال کر بال کیسے جما لئے ہیں جیسے چپاتیاں"، زہرہ نے ناک پھڑکائی۔

"امتحان کی وجہ سے بھئی۔" طفیل تو کاش ڈاکٹری پڑھتیں۔

"امتحان کیسا، پٹیوں کا؟" میں نے کہا۔

"نہیں بھئی، نیل سے دماغ روشن ہوتا ہے" طفیل نے کہا۔ "امتحان سر پہ آ رہے ہیں"

"ہاں بھئی سالانہ امتحان کی تیاری ہے،" زہرہ میرے خلاف ہو گئیں۔

"ہوں۔ چاہے زندگی کے امتحان میں فیل ہو جائیں،" میں نے بڑبڑانا شروع کیا۔

"یہ کیسے؟" "دیکھ لینا اوّل آئے گا۔ فیل کیوں ہوگا؟" سعیدہ کی اور طفیل کی دوستی کی انتہا ہو گئی۔

"فیل ہی ہوگا۔ بھلا ان چپکتے ہوئے بالوں کو دیکھ کر کوئی لڑکی سو میں سے دس نمبر بھی بمشکل دے گی،" میں نے اُکتا کر کتاب پر ناخونوں سے چار خانہ بنانا شروع کر دیا۔

"مگر محمود تو بھینگا ہے۔" زہرہ ہمیشہ بے کہے سُنے موضوع بدل دیتی ہے یہی تو اُس میں ایک عیب ہے۔

"کوئی بھینگا نہیں" میں نے برا مان کر لڑائی پر آمادگی ظاہر کی۔

"بیچ کھیت بھینگا۔" سعیدہ جلدی جلدی نوٹ نقل کرتی ہوئی بولیں۔

"لیکن "اس سے تو اچھا نہیں،" زہرہ نمبر ۲ نے باہر جھانک کر ہمارے تازہ ترین موضوع کی طرف آنکھ ماری۔

"اب تو بس "اس کی" تو سائیکل کے نیچے ایک دن آ کر مر جاؤ،" میں نے جل کر کہا اور طفیل کی ضروری نوٹ بک میں سے کاغذ پھاڑ کر ناؤ بنانے لگی۔

"میں کہتی ہوں یہ نوٹ لئے جا رہے ہیں یا بر دکھوے ہو رہے ہیں۔" عذرا نے ڈانٹا۔

"مر مٹ کے جا رہی ہیں، خاک جو لیکچر سُنائی دے رہا ہو،" طفیل نے اپنا مُنّا سا پاؤں ڈیسک پر رکھ کر لیٹتے ہوئے کہا۔

ہم نے اسی دن سوچ بچار کے بعد پرنسپل صاحب کو لکھا کہ لیکچر نہ تو ہماری سمجھ میں

آئیں نہ سُنائی دیں۔ ہمیں چھپے چھپلئے نوٹ دیں تاکہ امتحان کے لئے رٹ لیں۔

تیسرا سین

"اس کی تو شادی بھی ہو گئی ہے اور دو تین لڑکیاں ہیں۔" زہرہ نے ماتمی لہجہ میں کہا۔

"اسے!" اور ہم سب کے مُنہ اُتر گئے۔

"اور اس نمبر ۴ کی منگنی ہو گئی۔ آئندہ سال ولایت جا رہا ہے" زہرہ نمبر ۲ پر طفیل نے گُرز چلایا۔ وہ غریب چھ روز سے ہم سے بہت دور کونے میں بیٹھ کر چپکی نوٹ لیا کرتی تھی۔ ذرا سا مُنہ نکل آیا بے چاری کا۔

"اور وہ ــــ وہی سا" ہم سمجھ گئے "پرسوں اس کے گھر سے تار آیا ہے کہ لڑکا ہوا ہے" زہرہ نے سُبکی ضبط کر کے کہا۔

"اسے ہے لڑکا۔" ہمیں کبھی خواب میں بھی یہ سوچنے کا موقع نہ ملا تھا۔ ہم تو سمجھتے تھے۔ خیر۔

"وہ بھینگا" سعیدہ بولیں۔

"کہہ دیا کتنی دفعہ کہ وہ بھینگا نہیں۔ بھینگا نہیں۔ کل ہی میں نے ادھر سے دیکھا ہے۔ بالکل سیدھی تارا جیسی آنکھیں ہیں" میں نے زخمی شیرنی کی طرح بڑبڑانا شروع کیا۔ جی ویسے ہی دکھا ہوا تھا۔

"اور وہ چرخ" سعیدہ نے پھر چھیڑا۔

"اور وہ چرخ! ہوں! یوں تو دس ڈاڑھیاں موجود ہیں۔" زہرہ کاٹنے پر تُلی ہوئی تھی۔

"تمہیں کیسے معلوم کہ اس کی تین لڑکیاں ہیں" میں نے سوچا شاید۔ شاید کوئی غلطی ہوئی ہو۔

"مجھے اچھی طرح معلوم ہے" نفیس نے بتایا۔ وہ اسے جانتے ہیں۔ کہا چلبٹ چلبٹی تین لڑکیاں ہیں اس کی۔" زہرہ نہ جانے نفیس سے کیسی کیسی واہیات خبریں لا کر ہم سب کا دل دکھایا کرتی تھی۔

"رہ گیا لبطنا، سو وہ ہم نے طفیل کو سونپا۔" عذرا نے ٹھنڈی سانس لے کر پہلو بدلا۔

"خواہ مخواہ لبطنا، وہ سُن پائے تو!" طفیل نے دھمکی دی۔

"سُن کیا پائے گا۔ تم ہی اس سے جڑ دو گی تو سُن لے گا۔ کرے گا کیا۔ چار انگلی کھائے گا۔

"اور وہ ــــ وہ جو ہے۔ وہ کیا نام ہے۔ ذرا گنجا سا" عذرا باوجود کوشش کے نام

نہ یاد کر سکی۔

"اوہ بخشو گنجے سے تو" میں منہ پھلا کر بنچ پر دراز ہو کر اونگھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"گنجا بڑا خوش قسمت ہوتا ہے" میں نے کہا تا کہ طفیل نے فلسفہ لینے کا پختہ ارادہ کر کے چھوڑ دیا تھا۔

"معاف کرو بابا ہم بد قسمت ہی بھلے۔" عذرا نے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

اس دن ہم میں سے کسی کا دل نہ لگا، نہ ہی نوٹ لئے۔ نہ لیکچر سُنا۔ کیا سُنتے!

چوتھا سین

"چتے باہر سے دکھائی بھی دیتا ہے کہ نہیں" زہرہ نمبر ۲ نے اپنی سفید انگلیوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

ہم میں سے کئی کو دکھائی دینے کے خیال سے ہی پھریری آئی اور اپنے کھردرے خشک پیروں کو ساڑھی کے کنارے سے چھپا لینے پر مجبور ہو گئے کہ شاید نیچے سے نظر آتے ہوں۔

"نہ جانے کیسا دکھائی دیتا ہوگا" زہرہ نے پھر ایک لمبی سانس لے کر کہا۔

"چلو کچھ بھی نہیں دکھتا ہوگا" میرا دل چاہا۔ کاش نہ دکھائی دیتا ہو۔ رنگ تو شاید نہ دکھائی دیتا ہوگا۔ میں نے اپنے رنگ سے ڈر کر کہا۔

"ذرا دیکھیں۔ ہیں۔ جب سب چلے جائیں تو باہر جا کر وہاں سے دیکھیں۔ دکھائی بھی دیتا ہے یا نہیں" زہرہ بڑی بڑی ترکیبیں بتایا کرتی ہے۔ ویسے بڑی چھچکی ہے۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" سب نے یقین سے کہا۔

"تم سب یہاں بیٹھنا اور میں وہاں سے دیکھ کر بتاؤں گی" میں نے رائے دی۔

اور جیسے ہی کلاس ختم ہوئی اور بورڈنگ کی طرف جاتے ہوئے لڑکوں کی قطاریں آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔ زہرہ اور طفیل کے کندھے کا سہارا لے کر کھڑکی میں لٹک گئی اور لگر پر پیر اٹکا کر اس تختے کو پھاند گئی جو پردے کے لئے کھڑکی میں لگایا گیا تھا۔ ساری کہنیوں پر کھرونچے آگئے اور گٹا الگ چھل گیا۔ نئی وارنش سے دونوں ہاتھ چپچپانے لگے۔ میں ذرا بڑبڑاتی ہوئی اندر

"ار - رے" میں نے حیرت سے منہ پھاڑ دیا۔ "افوہ۔ سب دکھائی دے رہا ہے۔"

سب نے تڑپ تڑپ کر ایک دوسرے کو دھکیل کر سامنے آنے کی کوشش کی۔

"ذرا ٹھیک سے بیٹھو تو دیکھوں بھی" میں نے کرسی پر چڑھ کر کہا اور سب سچ مچ جیسے تصویر کھچوانے بیٹھ گئیں۔

"افوہ ـــ بالکل صاف۔" میں نے مبالغہ کیا اور سب مسکرائیں۔

"زہرہ تم ـــ تم تو بس صاف "لکس سوپ" اور ـــ مگر "اتو سینٹ آئنہ" کا پتہ نہیں ـــ شاید ـــ شاید ـــ خیر" میں ترسانے کی کوشش کرنے لگی۔

اندر سے سب نے بغاوت پر آمادگی ظاہر کی۔ شاید میری زیادتی پر۔

"اور سنو تو" میں نے بلوے سے ڈر کر کہا۔ "اور تمہاری ناک زہرہ نہ چپٹی لگے اور نہ اُرد کے چھلکوں کی پھلکی جیسی۔ بس کنارا سی نظر آ رہی ہے۔"

زہرہ نے خوشی سے عذرا کے چٹکی لی۔

"مگر تمہارے پیر سعیدہ اور چپلوں میں کتھئی موزے" میں رُک گئی۔

"لو میں موزے کب پہنے ہوں" سعیدہ نے شرما کر پیر اونچے کر لئے۔

"سنو تو" زہرہ کے گالوں کی سرخی دھوئے گلاب کی طرح چمکی "ادھر سے تو دیکھو ذرا، وہاں سے" ہم لوگ "کیسے دکھائی دیتے ہیں" وہ ذرا آنکھیں جھکا کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی اونچی ہو کر۔

"کوئی خاص نہیں ـــ ہا ـــ آں۔ مگر تمہارا دہانہ اِدھر سے ذرا پھیلا پھیلا نظر آ رہا ہے۔" میں نے گپ ماری اور جلدی سے زہرہ نے دہانہ سکیڑ لیا۔

"اور تمہاری آنکھیں تو دکھائی ہی نہیں دیتیں۔" میں نے سعیدہ کا دل دکھایا۔

"اور نہ تمہارے بالوں کی لٹیں" میں نے سعیدہ کے بڑبڑانے کی پروا نہ کرتے ہوئے طفیل کو جلایا۔

"اور وہاں سے ـــ وہاں دیکھو" عذرا نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"کہاں سے؟ ـــ بھینگے کی سیٹ پر سے" میں نے دوسری لائن میں آ کر کہا۔ عذرا ہٹ گئی۔

" لاؤ تمہارے بیٹھنے کی سیٹ پر سے بھی دیکھوں"، میں نے طفیل پر چھینٹا پھینکا۔

" اور وہاں سے پروفیسر صاحب کی کرسی کے پاس سے"، سعیدہ نے شوق کو چھپا کر کہا۔

" اوہو۔ سعیدہ ہمیشہ اونچا ہاتھ مارتی تھی ہمت تو دیکھو"

" یہاں سے ۔ یہاں سے تم تو دکھائی بھی نہیں دیتیں"، میں نے جھوٹ بول کر جی ٹھنڈا کیا۔

سعیدہ نے پورا پردہ ہٹا دیا۔ مگر میں نے اُسے دیکھنے سے قطعی انکار کر دیا۔

" اونہہ اول تو دکھائی نہیں دیتیں۔ جو ذرا سا دکھائی بھی پڑتی ہو تو بہت کالی، موٹی اور بھدی"

سعیدہ نے دوڑ کر پردہ گرا دیا۔

سعیدہ موٹی بھی تو کیا تھا۔ کمزور تو حد سے زیادہ تھی بچاری۔ لوگ جسم دیکھتے ہیں یہ نہیں دیکھتے جی کیسا ہر وقت خراب رہتا ہے۔

" دیکھو میں بتاؤں تم لوگ کیسے کیسے ہر وقت بیٹھا کرو"، میں نے میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں!"، سب شوق بھری آواز سے راضی ہو گئیں۔

" دیکھو تم ذرا ادھر سرکو زہرہ ـــــ ادھر ـــــ ادھر بھی"، میں نے اُسے دونوں طرف سے روکا اور پھر کہا، بھئی اُدھر نہیں اِدھر اور اُدھر نہیں اُدھر"

" او نھ تو کدھر سرکوں بھئی" زہرہ عاجز آ گئی۔ سرکتی سرکتی عاجز آ گئی پر میری نظر میں نہ جچی۔

" اور تم دائیں طرف سرکو عذرا ـــــ ہاں اور سرکو ذرا۔"

" بھئی ـــــ میرے اوپر کیوں چڑھی چلی آتی ہو، ہٹو"، زہرہ اپنی جگہ سے ہل جانے کے خوف سے لڑ پڑی۔

" ارے بہن تو ذرا اِدھر ہٹو نا"، عذرا نے زہرہ پر لد کر کہا۔

دونوں ایک ہی جگہ پر اڑ کر ایک دوسرے کو بھینچنے لگیں۔

" بھئی کیا مصیبت ہے عذرا"، زہرہ غرائی مگر عذرا ڈٹی رہی۔

" اور میں کدھر بیٹھوں؟"، سعیدہ نے آہستہ سے پوچھا۔ بچاری مجھ سے ڈرتی تھی۔

" اگر تم طفیل کی جگہ بیٹھو تو صاف اور اچھی دکھائی پڑو"

" ہٹنا ذرا بہن طفیل"، سعیدہ نے ذرا پیار سے کہا۔

" بھئی میری کتابیں ادھر رکھی ہیں" طفیل اپنی جگہ ہاتھوں سے کیوں دیتی، اچھی اور عمدہ جگہ۔
" اے ہے ایسا بھی کیا۔ ذرا سرک جاؤ نا اُدھر" سعیدہ نے خوشامد کی۔
" کوئی اور جگہ نہیں ہے جو میرے ہی سر پر چڑھو گی" طفیل چیخی اور ننھے سے جسم کو اکڑا کر۔
" اچھا تم زہرہ نمبر ۲ کے دائیں ہاتھ پر آجاؤ" میں نے دونوں دوستوں کی لڑائی سے ڈر کر کہا۔

زہرہ نمبر ۲ جھٹ پھدک کر اپنے ہی دائیں ہاتھ پر آن بیٹھی۔

" لو" سعیدہ نے مردہ آواز میں کہا " بھئی کہہ دیا ہم لوگوں میں ذرا بھی وہ نہیں"

" تو تم عذرا کی جگہ آجاؤ" میں نے رائے دی۔

" بھئی میں کیوں اپنی جگہ سے ہٹوں واہ۔" عذرا بھویں چڑھا کر مسکرائی۔

" اچھا تم وہاں سیڑھیوں کی طرف روشنی میں بیٹھو" میں نے کہا۔

سب رشک سے دیکھتے ہی رہ گئے اور سعیدہ عین روشنی میں اپنا مسکراتا ہوا چہرہ جالی سے لگا کر انتظار میں بیٹھ گئی کہ میں اب بولوں اور اب بولوں۔

میں نے ایک دو دفعہ اِدھر اُدھر جھک کر دیکھا اور منہ بنایا۔

"میں اب بھی صاف دکھائی نہیں دیتی ؟" سعیدہ نے اُمید بھری آواز سے پوچھا۔

" نہیں" میں نے جیسے ذلیل ہو کر کہا اور اس کی مسکراہٹ کس قدر اُداس ہو گئی۔ میں نے اُسے دیکھ کر ہی نہ دیا۔

چاپ — چاپ — چر — چر — اور قہقہہ — !

لڑکے دوسری میٹنگ سے واپس آرہے تھے۔ سعیدہ کا بڑا صبر پڑا۔ میں پر کٹی چڑیا کی طرح بنچوں پر چھلانگیں مارنے لگی۔ کرسی اور اس کے اوپر ایک اور کرسی کھڑکی میں آئی۔ ساڑھی چٹخنی میں پھنس گئی اور یہ بڑا کھونٹا صدری میں لگا۔ مگر میں کود پڑی۔ چوڑیاں ٹوٹ کر اندر ہی رہ گئیں اور چورا میری کلائی میں پیوست ہو گیا وہ تو کھو عینک بچ گئی۔

" دھڑ .... دھڑ .... دھڑڑ ...." کوئی باہر دروازے کو کوٹ رہا تھا۔

ارے! باوجود اس سیاہی کے اس وقت میں سفید پڑ گئی۔ میں اندر سے دروازہ بند کر آئی تھی۔

سُنا ہے دوسرے دن لڑکوں پر ڈانٹ پڑی کہ کرسیوں پر چڑھ کر لڑکیوں کو جھانکتے ہیں۔ بیچارے بچّے کچھ نہ بولے۔

گیندا

"جیسے یہ جھونپڑی ہے۔ ہے نا!" میں نے اور گیندا نے بالکیری کی گھن دار جھاڑی کے نیچے رینگتے ہوئے تصوّر کیا اور ہم دونوں جھکے جھکے دونوں ہاتھوں سے زمین صاف کرنے لگے۔ ذرا سی دیر میں پیلی پیلی مٹی کے صاف اور چکنے فرش پر ہم نہایت بے تکلفی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ذرا سوچ بچار کے بعد، ہم اپنا مرغوب ترین کھیل دلہن دلہن، کھیلنے لگے۔ گیندا نے اپنی بدبودار سرخ اوڑھنی کا لمبا سا گھونگھٹ مار لیا اور گڑی مڑی ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے آہستہ سے گھونگھٹ اٹھا کر "دلہن" کا منہ دیکھا۔ گیندا کا گول مٹول چہرہ خون کے ایک دم دوڑ جانے کی وجہ سے بیر بہوٹی کی طرح لال ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے بے چینی سے پھڑپھڑا رہے تھے اور وہ بمشکل اپنی ہنسی کو دبائے ہوئے تھی۔

"اب ہم.... گیندا بھئی اب ہم" میں نے رشک سے تڑپ کر کہا۔

"اہا!" بھیا نے ٹہنیاں ہٹا کر ہمیں دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

گیندا نے ہڑبڑا کر گھونگھٹ پھینک دیا اور سہم کر بیٹھ گئی۔ ہمارے دل دھک دھک کرنے لگے۔

بھیا کیا کسی کو بھی معلوم ہو جاتا کہ ہم "دلہن" کا کھیل کھیل رہے تھے تو یقیناً ہم پر مار پڑتی۔ یہ پر شوق کھیل تو، ہم ہمیشہ چھپ کر ہی کھیلا کرتے تھے۔ نہ جانے کیوں؟

"آں.... ں".... میں نے اٹھلا کر کہا۔ "ہم تو کھیل رہے ہیں"

بھیا شاید نیکی کے دم میں تھے کہ جھکتے ہوئے خود بھی اندر آ گئے اور اکڑوں بیٹھ گئے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ گھبرا گئے۔

"اوں ہوں۔ کمبختو یہاں کیسے بیٹھی ہو؟" انہوں نے ایک ٹہنی سے اپنی ناک بچا کر کہا۔

"اور گیندا!" انہوں نے اس کے پھولے ہوئے گال میں چٹکی لے کر کہا "اور تو یہاں بیٹھی ہے۔ کہتا ہوں نِتّھل سے"

گیندا نے اپنی بڑی بڑی بھوری آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔

"ارے باپ رے" اور وہ اپنا مختصر سا لہنگا سنبھال کر بھاگنے لگی۔

"آں۔ ۔ ۔ ۔ گیندا تو مت جا" میں نے اُسے پکڑ کر مچلتے ہوئے کہا۔

"دادا مارے گا پھر" اُس نے بھیا سے ڈرتے ہوئے کہا۔

"نہیں مارے گا تو نے کام تو کر لیا۔"

"اچھا بیٹھ" بھیا نے نرمی سے گیندا کو اپنے پاس گھسیٹتے ہوئے کہا۔ "مگر بی بی تجھے تو ضرور پٹواؤں گا۔ یہاں زمین میں لوٹ لوٹ کر کپڑے گندے کر رہی ہے۔"

"کہہ دینا، کہہ دینا، میں کوئی ڈرتی ہوں" میں نے ڈر کر کہا اور کپڑے جھاڑنے لگی۔!

"گیندا۔ ۔ ۔ ۔ اری او گیندیا۔ ۔ ۔ ۔ آ۔ ۔ ۔ ۔ کدھر مر گئی۔" بھو کی آواز گونجی اور گیندا بھیا سے ہاتھ چھڑا کر تیر کی طرح بھاگی۔

آن کی آن میں کھیل بگڑ گیا۔ میں بھیا سے اُلجھ پڑی اور کرتی بھی کیا۔

"ایں۔ ۔ ۔ ۔ ں۔ ۔ ۔ ۔ جاؤ یہاں سے" میں نے منمنا کر کہا۔

"بھُتنی" انہوں نے گھُٹی ہوئی آواز میں دانت پیس کر کہا۔ اور ایک دھپ میرے لگا کر چل دیئے۔

۲

"بدھوا کاہے کو سنگھار کرے ہے" گیندا نے فلسفیانہ انداز سے کہا۔

"بدھوا!" میں نے سُرخ اینٹ کو جسے میں سیندور تیار کرنے کے لئے پتھر پہ گھس رہی تھی۔ کوٹنے سے پوچھ کر کہا "بدھوا!"

"ہاں، اور کیا، ہم بدھوا ہیں" مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے گیندا نے فخریہ کہا۔

"اور ہم؟" میں نے حرص کی۔

"تم"، وہ حقارت سے مُنہ بنانے لگی "تم تو کنبیا ہو۔ ہی — ہی — ہی" اُس نے مذاق اُڑایا۔
میرا دل بیٹھ گیا۔ گیندا مجھے ہمیشہ حقیر سمجھتی ہے۔ بس، مجال ہے جو اس کی برابری کر جاؤں پچھلے بیساکھ میں اس کا بیاہ ہوا۔ سُرخ سُرخ کپڑے پہنائے گئے، چمکتے ہوئے چاندی کے زیور بلا شرکتِ غیرے اس کی ملکیت ہو گئے اور وہ کئی دن تک چھم چھم کرتی اٹھلاتی پھری۔ میں بے چاری کسی شمار و قطار ہی میں نہیں، ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا اور حرصیائی بلّی کی طرح اس کے پیچھے لگے رہنا۔ کبھی اس کی چوڑیاں گنتی۔ کبھی اس کے گھونگھرو سنبھالتی، کبھی اس کا جھوٹے گوٹے کا دوپٹہ زمین سے لگ جانے پر تڑپ کر اُٹھا لیتی۔ اماں کی زیادتی دیکھو اگر میں ذرا لحاف کا بھی گھونگھٹ نکال کر بیٹھوں تو ڈانٹ بتاتی ہیں۔ اونہہ۔ آخر کیوں؟"
"کیوں، بچھونے کھو ندر ہی ہے؟" جیسے لحاف گھونگھٹ کے استعمال سے پھٹ ہی تو جائے گا نا۔
جو کبھی دوپٹیا اوڑھنے کو مانگوں تو جھڑک دیتی ہیں۔
"نہیں۔ کیچڑ میں لتھڑنے کو نا!"
یہ مانا کہ میں گیندا سے چھوٹی ہوں، مگر اتنی ننھی بھی نہیں کہ دُلہن نہ بن سکوں۔ مجھ سے کہو ساری عمر گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی رہوں اور ذرا بھی جی نہ گھبرائے۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں۔ گیندا کا میاں برسات میں مر گیا۔ سارا گھر دن رات روتا پیٹتا رہا۔ گیندا کی تو چوڑیاں توڑ دی گئیں اور وہ بھی خوب روئی "ہائے۔ بچاری گیندا"، سب اس کو سمجھاتے بجھاتے اور پیار کرتے اور میرا تو گھر میں کوئی نوٹس بھی نہ لیتا۔ ہر بات میں یہی کہ بس ابھی بچہ ہوں، ابھی چھوٹی ہوں۔ خاک پڑے اس چھوٹے پن کو۔ آخر کب تک چھوٹی رہوں گی؟ اتنی تو بڑی ہو گئی کہ نیلی شلوار بھی اونچی ہو گئی۔ اچھی اچھی چیزوں کے لئے تو میں "ڈھونگڑی" ہو جاتی ہوں اور ویسے مطلب کے وقت مجھے سب چھوٹا بنا دیتے ہیں۔ یہ اب تک مجھے نہیں معلوم کہ چھوٹی ہوں یا بڑی۔ کچھ عجب اُلجھن ہے۔ اُونہہ!
"تو تم سنگھار نہیں کرتیں؟" میں نے بے کار دہرایا۔
"جب پتی ہی مر جائے تو پھر "کس پر" سنگھار کریں"، گیندا نے صوفیانہ لہجہ اختیار کر لیا۔
مانگ کا سیندور ہاتھ کی چوڑی پتی کے لئے ہی ہوتی ہے نا؟" اس نے سُنی سُنائی بات کو یقین

کارنگ دینے کی کوشش کی۔

"دیکھ گیندا کتنا ڈھیر سا سیندور بن گیا" میں نے پسی ہوئی اینٹ کو انگلیوں سے سمیٹتے ہوئے کہا۔ گیندا سیندور کی چھوٹی سی ڈھیری کو ایک مکمل بیوہ کی طرح دیکھنے لگی لیکن جلد ہی ہم دونوں مسکرانے لگے۔

"تو بھابی سے نہ کہنا..... اچھا...... آؤ" اس نے آگے سرک کر کہا اور ہم دونوں سنگھار کے لئے تیار ہو گئے۔ میں نے ایک تجربہ کار مشاطہ کی طرح گیندا کے الجھے ہوئے بالوں کو بمشکل پانی سے چپکایا اور اس میں سیندور بھر دیا۔ اہا۔

گیندا کا چہرہ لال لال ہو گیا اور اس نے شرما کر منہ اوڑھنی میں چھپا لیا اور ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔

"ارے ارے" میں نے اسے تنبیہہ کی "سب بگڑ جائے گا۔ بھئی ہم نہیں۔"

"لاؤ اب تمہارے لگاؤں"، گیندا نے میرے سر پہ پانی چپڑ کر کہا۔

"اور بندی؟" میں نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔

"ہاں.....ں . . . . اور کیا۔" اس نے اطمینان دلایا۔

ایک ذرا سی دیر میں ہم دونوں سیندور سے مانگ بھر اور بندیاں لگا سر پہ اوڑھنیاں منڈھ کر سلیقے سے ایک کونے میں بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھ دیکھ کر اپنے حسن کا اندازہ لگا کر شرمانا ہی پڑا۔

سامنے سے بھیا نظر آتے اور گیندا سرخ ہو گئی۔ ہم نے جلدی جلدی ماتھے کی بندیاں چھٹا ڈالیں اور کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے۔

بھیا مجھے دھکیل کر گیندا کے پاس بیٹھ گئے وہ شرمانے لگی۔ بھیا نے دانت پیس کر اس کے دونوں گالوں میں چٹکی لی اور وہ اوں، اوں کر کے سکڑ گئی۔

"اے ہے۔ یہ کیا ہے؟" بھیا نے نفرت سے پسی ہوئی اینٹ کی ڈھیری کو جوتے سے بکھیر کر کہا ان کی اجلی قمیص بھی خراب ہو گئی وہ اسی پہ چڑھ بیٹھے تھے۔

"یہ تو سیندور ہے۔ ہم نے بنایا ہے۔" میں نے فخریہ کہا۔

بھیا انگلی سے سیندور سے کھیلنے لگے اور اپنے پیر سے گیندا کا پیر دبایا۔

"لا میں تیرے لگاؤں،" بھیا نے سیندور لے کر گیندا کے لگا دیا۔

"اوں" اور اس نے ہتھیلی سے سیندور چھٹا دیا۔

"ر بھیا۔ گیندا تو بدھوا ہے وہ سیندور کب لگاتی ہے" میں نے اپنی قابلیت جتائی۔

"لگائے گی کیسے نہیں چڑیل۔" اور انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے پیچھے دھکیلا۔ اُس نے اپنا مُنہ چھپا لیا۔

"گیندا، پھر میں تجھ سے بولوں گا بھی نہیں۔" اور گیندا نے آخر کو منہ کھول ہی دیا۔

"گیندا،" بھیا نے اس کے قریب سرک کر کہا "بیاہ کرے گی؟"

"ہٹ" اور وہ شرما گئی۔

میں بھی حرص میں شرمانے کی کوشش کرنے لگی۔ ہم دونوں گھنٹوں بیاہ کی باتیں کر کے شرمایا کرتے تھے۔ بھیا کو تو وہ باتیں معلوم بھی نہ ہوں گی جو ہم نے آپا اور ننھی کو کرتے ہوئے پلنگ کے نیچے چھپ کر سُنی تھیں۔

"ہٹ کیسی!" بھیا نے کہنی کا ٹھوکا دے کر کہا "بول کرے گی بیاہ!"

بہو کے چھڑوں کی جھنکار سے ہم تینوں چونک پڑے۔ وہ کنوئیں پر آ رہی تھی۔

"گیندا!" اس نے پکارا اور دوسرے لمحے ہمارے سروں پر آ گئی۔

"ارے رانڈ، یہاں بیٹھی ہے۔ چل استری دھر کا،" وہ غرائی۔

گیندا جلدی سے کترا کر جانے لگی۔ مگر اس نے لپک کر اُسے جا لیا اور بال پکڑ کر دو جھٹکے دیئے۔

"اور یہ مانگ چوٹی تو نے کیسی کر ہی ہے؟" اُس نے دھول مار کر کہا۔ گیندا غوطہ مار کر نکل گئی۔ میں اور بھیا تڑپ اُٹھے۔

بہو سے میرے بدن میں آگ لگی تھی۔ وہ جب گیندا کو مارتی میں ضرور کچھ نہ کچھ اس کا نقصان کر دیتی۔ آج بھی جیسے ہی اس کی آنکھ بچی میں نے مُٹھی بھر کے راکھ اس کے صاف ستھرے کلف میں جھونک دی اور بھیا نے شام کو کالروں پر خراب استری کرنے کے قصور میں نتھا کے دو چھاپڑ کس کس کر لگائے۔

۳

"سُونگھو" گیندا نے اپنی پھٹی ہوئی کرتی کا گریبان میری ناک سے لگا کر کہا۔

"سوں ۔ ۔ ۔ ۔ ہا! عطر کہاں سے آیا؟" میں نے بلبلا کر پوچھا۔

"بھیا" اور وہ زور سے کھلکھلانے لگی۔ میں بھی رشک کو دبا کر ہنس دی۔

"گیندا!" بھیا نے برآمدے سے پکارا "یہ کوٹ استری کے لئے لے جا" وہ میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مسکراتی ہوئی چلی۔

"گیندا کیسے چلی تھی؟ جیسے لچکی جا رہی ہو، میں جب چلتی تھی تو وہ جیسے گھوڑا دوڑ رہا ہو۔ میں تو۔ ۔ ۔ ۔ اونھ میرا جی گھبرانے لگا اور میں جل کر باغ میں پانی دینے کی ہودی میں ایک لکڑی اٹھا کر گھنگو لنے لگی۔ صبح کی پیسی ہوئی اینٹ کا سیندور اب تک وہیں پڑا تھا۔ بھیا نے گیندا کے تو عطر لگایا اور میرے لگانا شاید بھول گئے۔ بھول کیوں گئے۔ جان کر ہی نہیں لگایا۔ حالانکہ ان کی سگی بہن ہوں اور گیندا وہ تو ان کی کوئی بھی نہیں۔ مجھے بھیا سے نفرت ہو گئی اور میں زور زور سے لکڑی گھمانے لگی۔

"ہاں ہاں۔ کیا کرتی ہو بی بی۔" میوہ رام نے پیچھے سے آ کر کہا۔

میں غور سے میوہ کو دیکھنے لگی "میوہ بھی تو میرا کوئی نہیں!" میں نے سوچا۔ مگر میں اس کے ہاتھ دیکھ کر اداس ہو گئی۔ کیا مجال جو یہ کمبخت ذرا اپنے ہاتھ مانجھ کر میل چھڑائے ہر وقت مٹی کھودتا رہتا ہے۔ مگر خیر۔

"میوہ!" میں نے نرمی سے کہا "ذرا یہاں آ" اور میں غور سے لکڑی میں سے بوندیں ٹپکتی ہوئی دیکھنے لگی۔

"کیا؟" وہ لاپروائی سے مڑا اور ٹوپی آنکھوں پر سرکا کر گدی کھجانے لگا۔

"یہ۔ ۔ ۔ ۔ سیندور میرے ماتھے پر لگا دے" میں نے لجاجت آمیز لہجے میں حکم دیا۔

"یہ سیندور ہے" وہ گھگھے ہنسنے لگا اور چلا مڑ کر۔

"سن بھئی ___ میں تو ___ میوہ ___ ذرا ٹھہر نا" ایک نئے خیال کے ماتحت میں

نے کہا۔

"کیا ہے بی بی؟" وہ ذرا مڑ کر بولا۔

"میوہ۔۔۔ بیاہ کرے گا؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"بیاہ! میرا تو بیاہ ہو بھی گیا" وہ کھرپی کا دستہ پیڑ کے تنے سے ٹھوکنے لگا۔

"کب؟" میں نے مردہ آواز میں کہا۔

"ارے رام! مدتیں گزر گئیں۔" اس نے ایسے کہا گویا کوئی بات ہی نہیں۔

"اچھا تو تو بڈھا ہے" میں نے فیصلہ کیا۔

"ارے نہیں" وہ ہنسنے لگا "کون کوٹھریا میں مالن بیٹھی ہے۔"

"کیا مالن سے تیرا بیاہ ہوا تھا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہوں۔" اور وہ چل دیا۔

اچھا تو وہ بڑھیا جسے میں میوہ رام کی اماں سمجھتی تھی اس کی بیوی تھی "کیسی عجیب دنیا ہے"
میں نے سوچا اور پھر ہودی میں لکڑی ڈال کر زور سے گھمانے لگی۔۔۔ میں نے جھک کر اپنا گریبان سونگھا کہ شاید وہاں بھی کسی عطر کی خوشبو ہو، مگر دور دور کہیں خوشبو کا نام نہ تھا۔ ہاں صبح جو سالن گر گیا تھا البتہ اُس کی بساندھ تھی۔ میں چڑ گئی۔

۴

گیندا اُچکے چُکے بھیا کے کمرے میں تولیہ میں لپٹے ہوئے کپڑے رکھنے جا رہی تھی۔ میرے دل میں کھدبدی ہوئی اور دبے پاؤں بلی کی طرح میں بھی پہنچی اور دروازہ میں سے جھانکنے لگی۔

گیندا فرش پر بیٹھی کپڑے گن گن کر الگ کر رہی تھی۔ بھیا کونے میں کھڑے سر کھجا رہے تھے۔

"دہٹ۔ غلط گن رہی ہے۔" بھیا نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا۔ اس نے ایک نظر بھیا کو دیکھا اور تیوری پر بل ڈال کر ہنس دی۔ انہوں نے اُسے کھینچا تو وہ سکڑ کر دری پہ اوندھے منہ لیٹ گئی اور کسی طرح نہ اُٹھی۔ بھیا نے اس کی کمر میں جو گدگدی کی تو تڑپ اُٹھی۔ بھیا جو آگے آئے تو اس نے ایک تھپڑ اُن کے گال پر رسید کیا۔

تعجب ہے کہ میں چونک کر نیچے نہ گر گئی۔ بھیا کے تھپڑ؟ بھیا! جن کے خوف سے سارا

گھر گھرا رہا ہے، ان کے گیندا نے بچھڑ مار دیا۔ میں بھاگنے کے لئے تیار ہو گئی۔ میں نے سوچا اب بھیا نے اس کا گلا گھونٹا اور اب گھونٹا۔ انہوں نے لپک کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ میں نے سانس روک لی...... مگر..... ارے لو..... میں حیرت اور خوف سے ملے جلے جذبات سے مجروح ہو کر سرپٹ بھاگی اور کمرخ کے گھنے درخت کے نیچے آ کر دم لیا۔ میرا کلیجہ بلیوں اچھل رہا تھا۔ کانوں میں جیسے کوئی انجن چل رہا ہو۔ بدن لرز رہا تھا۔ اور زبان خشک تھی میں دیر تک اسی طرح ڈری بیٹھی رہی۔

آنکھیں بند کر کے سوچا اور پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سوچا۔ مگر خاک جو سمجھ میں آیا ہو۔ آخر کیوں میری سمجھ میں اتنی ڈھیر سی باتیں نہیں آتیں۔ خاموش اور گرم دوپہر میں میں نڈھال ہو کر عجیب عجیب معموں سے لڑتی رہی۔ ایک بھی تو حل نہ ہوا۔ رونا آنے لگا۔ جیسے کسی نے مجھے خوب ہی تو مارا ہے۔

گیندا برآمدے میں سے لپک کر اُتری۔ میں سمجھ گئی کہ میرے سوالوں کے جواب وہی دے سکتی ہے۔ گیندا مجھے کتنی باتیں بتاتی تھی۔

"کیا ہوا" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ مکاری سے اترائی۔ مگر فوراً ہی ایک تنہا گوشے میں بیٹھ کر ہم دونوں "عجیب عجیب" باتیں سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ گیندا نے افوہ، کتنی باتیں بتائیں۔

"ارے! مگر آخر کیوں؟" میں نے سب کچھ سن کر سوچا۔

گیندا کلف چڑھانے چلی گئی اور میں پھر ایسی بیٹھی رہ گئی گویا راستہ گم کر دیا ہو۔

میں نے چاہا کہ چھوٹی چھوٹی کمرخیں بین کر ہار ہی بناؤں یا پھر اس نالی کو پورا کر لوں جسے میں نے کل پانی دینے کے لئے کھودا تھا۔ یا پھر ایک نظر بالکمیری کی جھاڑی کے نیچے ہی ڈال آؤں یا نہیں تو لاؤ یہی معلوم کروں کہ "تیترنی" نے انڈے کہاں دینے شروع کئے ہیں۔ مگر نہیں میرا تو دل کسی بات میں نہ لگا۔ نہ جانے کیوں ہر کھیل سے میرا جی اُکتا گیا تھا اور جی چاہتا تھا چپکی آنکھیں بند کئے ہوئے کوئی خواب دیکھتی رہوں جس میں کوئی ننھی منی دلہن ہو۔ اور بس پھر اسی خیال کی دنیا میں گم ہو جاؤں آخر کیا کروں۔ گیندا کو دیکھو اگر میں کیا کروں بیوہ

کے پاؤں کی چاپ سنائی دی اور میں جیسے چونک پڑی ایک خیال، ایک اُمید کی مٹی ہوئی سی جھلک، اور میں زمین پر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر اوندھی لیٹ گئی۔

" پچ...... پچ ہا ہ ۔۔۔ بی بی زمین پہ ؟ اُٹھو، اُٹھو !" اُس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

مجھے ایسا معلوم ہوا کوئی مجھے اُٹھا رہا ہے اور میں نہیں اٹھتی۔ میری پیٹھ میں کسی نے گدگدی سی کی...... مگر..... اونہہ.....

" اُٹھو، نہیں تو کہتا ہوں بھیّا سے کہ کپڑے میلے کر رہی ہیں۔" اُس نے دھمکی دی اور ویسا ہی لٹھ کا لٹھ دور کھڑا رہا۔

وہ نہایت لاپروائی سے بانس کی پھچی چھیل رہا تھا۔ مگر اس انداز سے نہیں جیسے بھیّا سر کھجا رہے تھے۔

" اُٹھتی ہو کہ سچ مچ ہی جا کر کہہ دوں۔" اور وہ چلا شکایت کرنے۔ ذرا سوچئے میرا کیسا جی جلا۔

" سؤر، تو کون ہوتا ہے۔ آں۔ س۔" میں نے چیخ کر کہا اور ایک پتھر کس کے اُس کے گھٹنے پر کھینچ مارا۔

" ارے بار ۔۔۔ ٹھہر تو جاؤ کیسا پٹواتا ہوں۔ دوپہریا پھر گھام میں گھومتی ہیں اور ریتا میں لوٹیں لگاتی ہیں جو کچھ کہو تو...... ٹھہرو۔ وہ سی سی کرتا چلا۔

" یہ کمبخت میوہ رام سدا کا ٹھس ہے۔ کیا مجال جو مجھ سے سیدھے منہ بات کر جائے۔ بُڑھا وہی تو ہے نا!" میں ایسی جلی کہ موتیا کی ساری قلمیں جو اس نے گھنٹوں کی محنت کے بعد لگائی تھیں ایک ایک کر کے کھسوٹ ڈالیں " ایسے انسان کا یہی علاج ہے" میں نے سوچا اور بِسُورتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔

۵

کون تھا جو مجھ سے ہمدردی کرتا؟ بھیا نے تو کبھی منہ نہ لگایا۔ اماں نے کبھی بیلاڈ بھی نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بلا کی ضدّی ہو گئی۔ طبیعت میں جو اُلجھن پیدا ہوئی تو سب سے ہی بَیر باندھ لیا۔ باجی جواب کے آئیں تو انھوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا کیونکہ میں دن بھر

واہی تباہی گھومتی تھی اور لڑتی پھرتی تھی مجھے گیندا کے چھوٹنے کا بڑا افسوس تھا مگر سفر کی خوشی کچھ ایسی سوار ہوئی کہ سب کچھ بھول گئی۔

گیندا۔ بھیا۔ بیوہ اور ساری پرانی باتیں دو سال کے عرصہ میں خواب ہو گئیں اور جب میں واپس آئی تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ بھیا دہلی بھیج دیئے گئے تھے۔ ان کے کمرے میں مہمان ٹھہرتے تھے۔ بیوہ رام نمونیہ سے مر گیا تھا کیونکہ اس نے اپنی مٹی سے کھیلنے کی عادت نہ چھوڑی اور سردی لگ گئی۔ تعجب ہے کہ میں خوشی اور حیرت سے بے ہوش نہ ہو گئی۔ جب میں نے سنا کہ گیندا کے بچہ ہوا تھا۔ اظہارِ مسرت پر مجھے ڈانٹا گیا۔ میں خاک نہ سمجھی کہ کیوں؟ ہاں اتنا تو سنا۔

"اسے ہے بہتری تو اس نے کوشش کی۔۔۔۔ مگر وہ تو۔۔۔۔۔" آگے میں نے نہیں سنا کہ شیخانی نے کیا کہا۔

"اسے ہے وہ تو مارے ڈالتا تھا۔ بڑی آفتیں اٹھیں" بیوی نے کہا "میں نے فوراً اسے دہلی چلتا کیا۔ پڑھنے والا بچہ! یہ بیچ ذات کمینیاں شریفوں کو یونہی۔۔۔۔" اور پھر باوجود سانس روک کے سننے کے میں آگے نہ سمجھ سکی۔

"گیندا کا بچہ!" میں بستر پہ لیٹی رہی بار بار دہرانے لگی مجھے حیرت پہ حیرت تھی۔ مگر یہ بچہ!۔۔۔۔ آخر کیوں؟"

"ورنہ تو اگر سرکار کو خبر ہو جاتی تو جانے کیا ہوتا۔ اسی لئے تو میں نے اسے جلدی سے دفعان کیا" مجھے بیوی کی آواز پھر سنائی دی۔

اب میں سمجھی، اوہو! میری نظروں کے سامنے ساری گزشتہ باتیں سینما کی تصویر کی طرح پھر گئیں اور میرا دل بیٹھنے لگا۔ لیکن فوراً ہی گیندا کے بچے کو دیکھنے کے لئے میں بے قرار ہو گئی۔ میری آنکھوں میں ننھا منّا سا بچہ پھرنے لگا۔ جیسا ہم نے ریل میں لاہور جاتے وقت دیکھا تھا۔ ذرا سا بچہ مگر کتنا پیارا۔ ہمارے یہاں تو کوئی بھی بچہ نہیں۔ کوئی بچہ مہمان بھی نہیں آتا۔ مجھے گیندا کے بچے پر پیار آنے لگا۔ اندھیرے میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی کے ننھے ننھے ہاتھ میری ٹھوڑی اور گردن پر رینگ رہے ہیں۔ میں چپکی لیٹی رہی کہ کہیں

وہ چھوٹی چھوٹی فرشتوں جیسی انگلیاں میرے ہلنے جلنے سے بھاگ نہ جائیں۔

رات کو خواب میں بچے ہی بچے، سینکڑوں بچے عجیب عجیب شکلوں کے گیندا کی شکل کے، میری شکل کے، بھیا کی شکل کے، یہاں تک کہ مرے ہوئے میوہ رام کی شکل کے سینکڑوں بچے، کلبل کرتے۔ کچھ بے بالوں کے، کچھ بالوں دار، گول مٹول سرافرازے ہاتھ۔ ریت کے بے شمار ذرّوں کی طرح ساری کائنات پر بکھرے ہوئے تھے۔

صبح میں چھپ کر گیندا کے بچے کو دیکھنے چلی ہی گئی۔

۶

گیندا اپنی کوٹھری میں دروازے کی طرف پشت کئے جھکی ہوئی کچھ کر رہی تھی، میرے پیروں کی چاپ سُن کر وہ چونک پڑی اور ڈر کر مجھے دیکھنے لگی اور جلدی سے اس نے اپنے کپڑے سمیٹ لئے۔ میں نے سامنے جا کر دیکھا تو ایک مختصر ترین نیم برہنہ انسان اس کے گھٹنے پر پڑا ہوا اپنا کلھیا سا منہ پھاڑ رہا تھا۔

"اوئی کتنا مُنّا سا ہے" میں نے اس کے پاس اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔

گیندا کتنی دُبلی ہو گئی تھی جیسے لکڑی۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ اُس نے میری طرف سے منہ پھیر لیا۔

"ہائے۔ جان ہے تیرا بچہ تو۔" میں نے خوشی سے چیخ کر کہا۔" اور زمین پر بیٹھ گئی۔ جی چاہا گیندا اور اس کے بچے کو اُٹھا کر کلیجہ سے لگا لوں۔ مجھے نہ جانے کیوں رونا آنے لگا۔

"ذرا مجھے دے گیندا" میں نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ مگر وہ خاموش بیٹھی اپنے آنسو پونچھتی رہی۔

"ارے رو رہی ہے تُو" مجھے تو رقت آنے لگی" ایک تو اتنا گڈو بچہ ہے اور پھر رو رہی ہے۔ لا مجھے دے۔"

وہ سر جھکائے منہ پونچھتی رہی اور بچے کو چھوا تک نہیں۔ میں نے چاہا بچے کو گود میں لے لوں۔ اوئی۔ اوئی۔ وہ تو ایسا گلگلا جیسے گوشت کی بوٹی ۔ اور کسی طرح نہ اُٹھا۔

"اونہہ گیندی، ذرا اُٹھا دے۔" میں نے اپنے پرانے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

گیندا نے مجھے غور سے دیکھا۔ جیسے وہ میری آنکھوں میں کچھ تلاش کر رہی ہو۔ شاید جو کچھ وہ ڈھونڈھ رہی تھی اُسے مل گیا اور اُس نے ایسی آسانی سے بچے کو اُٹھا کر مجھے دے دیا کہ میں اس کی مشاقی پر حیران رہ گئی۔ جیسے روئی کا گالا۔ ہلکا پھلکا ڈیلا سا بچہ۔

میں اُسے ٹاٹ پر لئے بیٹھی رہی اور گیندا نے مجھے لاکھوں کروڑوں عجیب عجیب باتیں بتائیں۔ کس طرح وہ مہینوں ماری گئی۔ چودہ پندرہ برس کی گیندا خود بھی بہت سی باتیں نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے کیسے بتاتی۔ ہم دونوں "کیوں" "کیسے" اور "ارے" پر آکر رُک جاتے۔

جب بہو کے کالا کلوٹا بچہ ہوا تھا۔ جو کچھ دن بعد ہی مر گیا تو کیسے گانے بجانے ہوئے تھے۔ بہو کو منوں گھی اور گڑ ٹھنسایا گیا۔ اور اب جو گیندا کا اتنا گورا سا بچہ ہوا تو کچھ بھی نہیں۔ گیندا اپنی اور بھوکی رکھی گئی اور مرتے مرتے بچی۔ تب یہ ننھا سا "للو" آیا۔ للو کے پاس دو ہی کرتے تھے۔ ٹھنڈ میں مرا جاتا تھا۔ رات بھر روتا تھا۔ بہو اُسے ہر وقت کوستی تھی کہ مر جائے تو چھٹی ہو جائے۔ گیندا نے چپکے سے للو کے پیر میں کالا ڈورا بھی باندھ دیا تھا کہ کہیں اُسے نظر نہ لگے۔

اس نے صاف صاف اعتراف کر لیا کہ للو دنیا بھر میں سب سے زیادہ پیارا ہے اور ہاں میں بھی اور بھیا بھی۔ بھیا کے نام پر اس کی آنکھیں اپنی پرانی روشنی سے چمکنے لگیں اور ان کا متواتر ذکر کرتی رہی۔

"وہ اب چھٹیوں میں بھی نہیں آتے؟"

"ہاں اب آئیں گے۔ پار سال مسوری چلے گئے تھے" میں نے بچے کی اُنگلیاں گنتے ہوئے کہا۔

"تم انہیں چھٹی لکھو گی، کیوں بی بی؟" اس نے شوق سے پوچھا۔

"ہاں، ہاں" میں نے زور سے سر ہلایا۔

"ہاں تو لکھ دینا کہ للو تمہیں بہت بہت سلام کہتا ہے اور بہت ہی یاد کرتا ہے"

"اچھا" میں نے کہا۔ حالانکہ للو چوں بھی کرنا نہ جانتا تھا۔

"اور یہ بھی لکھنا کہ اس کے لئے اب کے لال بنیائن لائیں۔ جیسی لبنتی کا چھورا پہنے ہے"

"اور ۔ ۔ ۔ یہ کہ ۔ ۔ ۔" اس نے شوق بھری نظروں سے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب کی بار چھٹیوں میں دو چار دن کے لئے ضرور آنا" جیسے وہ کسی سے التجا کر رہی ہو۔

اور وہ ہلکے سے ہنس دی۔ وہ نہ جانے کیا بکتی رہی اور میں للّو کے بالوں سے کھیلتی رہی۔

"دیکھ..... دیکھ گیندا کیسے چھوڑ رہا ہے.... آآ" میں نے اُنگلی میں گُدگُدی محسوس کر کے کہا۔

"بھوکا ہے۔"

گیندا شرما گئی۔

"لے بھئی۔ نہیں رو دے گا پھر۔"

گیندا نے اپنے دُبلے پتلے ہاتھوں سے بچّے کو اُٹھا لیا اور تھوڑی ہی دیر میں اُسے کلیجہ سے چمٹا لیا اور ساڑھی میں مُنہ چھپا کر ہنستی رہی۔

میں بڑے شوق سے ننّھے للّو کے پتلے پتلے ہونٹوں کو دیکھتی رہی اور وہ لمبی لمبی سانسوں سے دودھ پیتا رہا۔ ننّھی سی ماں پھوٹ پڑنے سے اُسے سنبھال رہی تھی۔

شادی

جیسے ہی لال پیلی جھنڈیوں کی قطاریں اور رنگین کھمبے نظر آنے لگے میں نے تانگے کو رُکوا کر اُترنے کی کوشش کی۔

"ابھی تو بہت دور ہے سرکار!" تانگے والا گھوڑے کو چابک سے سہلا کر بولا۔

"رہنے دو، بس۔ لو کتنے دام ہوئے تمہارے"، میں نے چونّی دیتے ہوئے کہا۔

"گیٹ تک چلوں!" وہ چونّی داب کر بولا۔

"نہیں۔"

میں اُتر پڑی۔ گدھے کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ راجہ کا آتی چرن سے یہاں تانگے میں آنا کس قدر ویسا ہے ذرا غور تو کیجئے تو پتہ چلے کہ اگر مانگے کی سب موٹریں عین موقع پر غائب ہو جائیں اور کرائے کی ٹیکسی ڈھونڈھے نہ ملے تو کیسی مصیبت ہو جاتی ہے۔

بھرے ہال کے سامنے ٹانگیں تھرتھرانے لگیں۔ خیر سے مسٹر دوبے اپنے مخصوص قہقہے کو دبائے ہوئے استقبال کو مل گئے۔

"آپ آگئیں؟" میں کار لے کر جانے ہی والا تھا۔

میں اپنی جلدی پر پچھتائی۔ تانگے کے جھٹکوں کو کوستی آگے بڑھی۔ ہال جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ فرش پر پیر پھسلے جاتے تھے آنکھوں کے سامنے ننھے ننھے تارے تھرکنے لگے۔ دُور کہیں چھپا چھپایا ارغنوں دھیمے اور میٹھے سُروں میں بج رہا تھا۔ میری ناتجربہ کار آنکھوں کے لئے یہ الف لیلہ کے کسی پرستانی سین سے کم نہ تھا۔ مسٹر دوبے نہ جانے کیا بڑبڑائے جا رہے تھے۔ میں تو نئی نئی تراش کے جمپروں کو تکتی، ساریوں کے رم جھماتے جھوم دیکھتی ہی چلی جا رہی

تھی اور دوبے کے کھٹکے دار بے لوچ قہقہے ذرا جگا دیتے تھے۔

کسی نے مجھے پیچھے سے کھینچا اور میں بیلیا کو دیکھتے ہی گھوم پڑی۔ اس کے پاس ہی بیٹھے ہوئے نہ جانے کون صاحب جلدی سے اُچک کر کرُسی خالی کر گئے اور میں بغیر شکریہ ادا کئے بیٹھ گئی۔ دوبے کے قدم آگے نکل گئے جب انہیں پتہ چلا کہ میں راہ میں ہی ٹپک گئی۔ ذرا سے ذرا اُن کا ہاتھ سر کھجانے کے لئے اُٹھا۔ مگر پھر وہ مہمانوں کے ریلے کو سنبھالنے کے لئے بڑھ گئے۔

بیلیا نے بعد میں قاعدہ بتانے کا وعدہ کر کے مجھے بٹے ہوئے پتّوں کی گڈّی پکڑا کر کھیل شروع کر دیا۔ نہ جانے ہم کیا کھیل بڑی تن دہی سے کھیلنے لگے۔ بس قہقہے زیادہ لگانے پڑتے تھے اور ہاتھ کم بنتے تھے۔ وہی صاحب جو کرسی دے کر پاس والے کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گئے تھے۔ ازراہِ کرم مجھے بتانے لگے۔

"ہیں، ہیں! یہ کیا چل رہی ہیں، کٹ نہیں جائے گا؟" وہ میرے ہاتھ سے پتّا لے کر بولے۔

میں قطعی نہیں سمجھی کہ کیا کٹ جائے گا اور ان کی اس گستاخی پر غور کرنے لگی۔ جو انہوں نے پتّہ چھین کر کی تھی۔

"آپ یہ چلئے" وہ میرے پیچھے کھڑے ہو کر بتانے لگے۔

"بھئی بتانے کی نہیں ہے نُور!"

"لیکن بتانے کے خلاف جہاد کرنے والے میرے لئے زبردست معمّہ حل کر گئے۔ یعنی یہ کہ کرسی دینے والے نُور تھے۔ کون نُور؟ یہ مجھے اُسی وقت معلوم ہوا ٹینس کے بہترین کھلاڑی آئی۔ سی۔ ایس کے کامیاب رُکن، سوسائٹی کی جان۔ دوستوں کے ٹھیکیدار اور نہ جانے کیا اَلَم غَلَم۔

اور وہ برابر میرے پتّے چلنے لگے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اگلا پتّہ پکڑتے میں نے خود ہی جلدی سے ڈال دیا اور وہ صرف میری اُنگلی نوچ کر رہ گئے۔ سب زور سے ہنسے اور انہوں نے بھی معافی مانگی۔ بڑی معصومیّت سے۔

اس کے بعد ہم لوگ اُس سے بھی اوندھا اور دیوانہ سا کھیل چند گولیوں اور ایک چوکھٹے کی مدد سے کھیلنے لگے۔ مسٹر دوبے مہمانوں کو شاید ہانک چکے تھے۔ چونکہ وہ بھی اپنے تھوس قہقہوں

سے کھیل کو اور بھی پگلائے دے رہے تھے۔

اس پر میں نے بعد میں غور کیا کہ سارے ہال میں سوائے نور کے سب ہی سیاہ ڈنر سوٹ میں جکڑے ہوئے تھے۔ مجھے یہ معلوم کر کے ذرا بھی تعجب نہ ہوا کہ نور سیدھے ٹینس کورٹ سے پکڑ کر لائے گئے ہیں اور سفید پتلون اور سبز قمیص کی معافی کے لئے ان کا ریکٹ اور مفلر وغیرہ سامنے ہی میز پہ رکھا ہوا بار بار مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ آج ڈنر پر سب کے لئے سبز قمیص اور سفید پتلون پہننا لازمی کیوں نہ رکھا گیا۔ میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اگر اب کے شاید نینی تال جانا ہوا یا مسوری گئی تو سفید پتلون اور سبز قمیص شام کو پہننے میں کیا ہرج ہوگا۔

ڈنر اس قدر دلچسپ رہا کہ جلد ہی مجھے وہ پریشانی جو چاندی کے بوجھل چمچوں کو قابو میں لانے میں اٹھانا پڑ رہی تھی، غائب ہو گئی۔

مسٹر دوبے جو بالکل ہی قریب بیٹھے تھے بار بار گزرے ہوئے کھیل کے بعد سے پن کا ذکر کر کے قہقہے چھوڑ رہے تھے۔ نور کا بھی ذکر آیا وہ ایک بھورے بالوں والوں ہلکی پھلکی چھوکری سے کچھ اس انہماک سے باتیں کر رہے تھے کہ چاندی کے چمچے مجھے پھر بے ڈول، بڑے اور بوجھل معلوم ہونے لگے۔ مسٹر دوبے نے کئی کئی بار لوگوں کو چمچے اور چھری کے جھٹکے سے متعارف کرایا۔

"یہ مسٹر سنگل ہیں، ایم۔ ای۔ ڈی اور وہ؟" آلو کی نوک سے اشارہ کر کے کہنے لگے مسٹر... آں۔ وہ مختار۔" مسٹر مختار بت کی طرح خاموش۔ ذرا پختہ سن کے دراز قد انسان تھے۔ جب ہم لوگ تاش کھیل رہے تھے اس وقت بھی وہ دور میز سے ٹیک لگائے نہ جانے کیا سوچ سوچ کر دھواں اڑا رہے تھے اُن کا لکڑی کے کاروبار کا کچھ جھگڑا تھا۔ کئی دفعہ میں نے اُنہیں اپنے گروہ کی طرف بلکہ خود اپنی طرف دیکھتے دیکھا۔ پتہ نہیں کیوں، وہ ویسے ہی غیر دلچسپ رہے۔

"بڑا شریف آدمی ہے بچارا۔ تین چار جگہ بیوپار چلتا ہے اس کا،" مگر میں مرعوب نہ ہوئی۔ اور ڈنر کے بعد عجیب کھیل شروع ہوئے۔ ہم دو دو ہو کر کھڑے ہو گئے۔ یہاں تک کہ راجہ صاحب جب میرے ساتھی بنائے گئے تو وہ بھی مسکراتے ہوئے دائرے میں آ گئے۔ ہم لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے اور ہمارے ساتھی پیچھے کھڑے ہو گئے۔ مسٹر دوبے اپنی خالی کرسی کی پشت پکڑے

اپنے مخصوص قہقہے لگا رہے تھے۔

"اچھا سنیئے" سیلیا نے تالی بجا کر تھیٹر کے مینیجر کی طرح سب کو متوجہ کر کے کہا۔

تھوڑی دیر کے لئے کھیل بالکل اودھم میں تبدیل ہو گیا۔ نور اپنی کرسی والی بھورے بالوں والی دُبلی حسینہ سے کچھ جُھک کر کہہ رہے تھے اور اس نے ہنس کر آہستہ سے تھپڑ اٹھایا۔ نور سیدھے کھڑے ہو گئے۔ اس عرصے میں میں نے کھیل کے قواعد بھی نہ سُنے، مگر دیکھا کہ خالی کرسی والا آنکھ کے اشارے سے دوسری کرسیوں پر بیٹھی ہوئی موریتوں کو بلاتا ہے اگر اس کے پیچھے والا ذرا ہوشیار نہ ہوا اور عین وقت میں اُسے پکڑ نہ لے تو وہ خالی کرسی پر نظر آتی ہے۔ اور خوب غل پڑتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نور کی بھورے بالوں والی لڑکی دوبے کے سامنے کرسی پر اڑی بیٹھی ان کے سُریلے قہقہے سُن رہی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔

"بھئی سب کو خالی کرسی والے کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے" نور نے کہا اور اپنی سیاہ پلکوں کو جھپکایا۔ نور نے آہستہ سے بائیں آنکھ کے کونے کو دبایا اور اس سے قبل کہ سیلیا اُٹھے اس کے زبردست ساتھی نے اُسے جکڑ لیا۔ سب پھر خاموش بیٹھ گئے۔ نور نے پھر اشارہ کیا لیکن شاید مجھے۔ میں نے نیچے پڑے ہوئے قالین کے نقش و نگار کو گھورنا شروع کیا۔

نور بولے۔ "مسٹر دوبے یہ کھیل کے قانون کے خلاف ہے کہ خالی کرسی پر کوئی ......"

راجہ صاحب تو جیسے سو رہے تھے وہ شاید بالکل ہی کھیل کو سمجھنے کی کوشش نہ کر رہے تھے اور جب میں اٹھ کر نور کی کرسی پر بیٹھی تو ویسے ہی قریب والی کرسی پر بیٹھی ہوئی لیڈی ڈاکٹر سے اپنی بہو کی بیماری پر پرزور مباحثہ کر رہے تھے۔ میں کھیل کے خلاف لیکن شریک ہی رہی۔

تھوڑی دیر میں کھیل میں جان پڑ گئی۔ مسٹر مختار کی کرسی خالی ہوئی اور تالیوں قہقہوں نے کان پھاڑ دیئے۔ ان کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔

"مختار صاحب۔ بڑی ہی خالی ہوئی .... یہ تو ..... ہی۔ ہی۔ ہی" دوبے ہنسے۔

سب جیسے مختار صاحب کو چھیڑنے پر تُلے ہوتے کوئی اپنا ساتھی دینے کو تیار نہ تھا۔

ما صاحب" ایک موٹے سے انجینئر صاحب اپنی کرسی کو خالی ہونے سے روکتے ہوئے

بولے "مختار اس کی دوستی نہیں۔

اور جیسے ہی میں اُٹھنے لگی، نور نے جھپٹ کر پکڑ لیا۔

"اوہو آپ سمجھیں میں سو رہا ہوں ۔ خوب" میں خاموش بیٹھ گئی۔ بھورے بال والی سے باتیں کرنے کی کچھ تلافی ہو گئی۔

"معاف کیجیے گا گستاخی مگر آپ ابھی نہیں جا سکتیں —— جب میری باری تھی تب تو گویا آپ دیکھ ہی نہیں رہی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔" نور پھر مجھے روک کر بولے۔

میں اور نور تھوڑی ہی دیر میں باتیں کرنے لگے۔ اس نے بتایا کہ نیلی یعنی اسی بھورے بالوں والی لڑکی نے بتایا کہ میں بھی ٹینس کھیلتی ہوں۔ میں نے ان کی ٹینس کی دعوت بالکل بے خبری میں قبول کر لی۔ چونکہ میں بڑے غور سے یہ سوچ رہی تھی کہ وہ شاید نیلی سے میرے ہی متعلق پوچھتے رہے ہوں گے۔

نیلی سے ملنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ کس قدر روشن دماغ ہے اس نے مجھے دو بے کے یہاں ٹینس کھیلتے دیکھا تھا۔

رات بھر میں دعوتوں، سبز قمیصوں اور ٹینس کے اُلجھے سُلجھے خواب دیکھا کی۔

شام کو نور خود کار لے کر آ گئے۔ میں ڈیڑھ گھنٹے سے تیار بیٹھی تھی۔ میں شاید زندگی میں بہترین کھیل کھیلی، کم از کم نور کا تو یہی خیال تھا۔

نور نے باقاعدہ ایک ٹینس کلب قائم کر دیا۔ بیلیا اور دو چار بے فکرے ممبر بنے بڑی تگڑی فیس رکھی گئی۔ مگر ادا کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ چند ہی روز میں سارے ممبروں کو روگ لگنے شروع ہو گئے۔ بیلیا کو سخت زکام ہو گیا۔ ایک دوسرے صاحب کو ضروری کاموں کی بھرمار رہنے لگی۔ مگر ہم دونوں جی چھوڑ کر کھیلتے —— روز روز کھیلتے اور مہینوں یہی کھیلتے رہے۔

نور کس قدر دلچسپ انسان ثابت ہوئے۔ ہم گھنٹوں بکواس کرتے اور ذرا جی نہ اُکتاتا۔ انہوں نے کئی خوبصورت اور کارآمد کتابیں دیں۔ ان کے تحفوں سے جی گھبرا گیا۔ میری کئی تصویریں ان کے پاس بڑی کی ہوتی رکھی تھیں۔ لیکن بچوں کی طرح چھپائی ہوئی۔ اور جب میں نے دیکھ لیں تو باتیں

بنانے لگے۔

مسٹر دوبے کس قدر شوقین طبیعت تھے انہیں اپنی شادی کا دن منانے کا جنون تھا اور اوپر سے ہوا بیٹا۔ زبردست دعوت دے ڈالی اور سیلیا کو پہلے ہی سے لینے کے لئے بھیج دیا۔ میں نے شام کو نور کے ساتھ ٹینس کا پختہ وعدہ کیا تھا۔ آج وہ آٹھ دن بعد دورے سے جب چڑھے ہوئے لوٹے اور یہ معلوم ہوا کہ میں دوبے کے یہاں ہوں تو تنتناتے آئے "آپ اپنے وعدے تو خوب یاد رکھتی ہیں۔" وہ کڑوا منہ بنا کر بولے۔

"ارے سیلیا ادھر ——— یہ ہیں تمہاری سہیلی۔" دوبے میرا کندھا ہلا کر چلائے۔ اور بات کاٹ دی اور سیلیا مجھے وہی بے وقوفوں والا چوکھٹے کا کھیل کھلانے لے گئی مجھے موقع بھی نہ ملا کہ نور صاحب کا مزاج تو پوچھوں۔

"تم نیلی سے تو ملی ہو؟" میں نے چوکھٹے میں گوٹی گھما کر کہا۔

"کون، نیلی پینر؟ ہاں۔ ششش بے وقوف ہے وہ" سیلیا گوٹی تاکتی ہوئی بولی۔

"کیوں، کیا کی اس نے بے وقوفی؟" میں نے پوچھا۔

"ارے! جیسے تمہیں کچھ معلوم نہیں ——— یہ نور صاحب . . . . ." وہ ہکلا گئی۔ کیونکہ نور جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر پہ سوار تھے اور ترچھی چتون سے گھور رہے تھے۔ ہم چپ ہو کر کھیلنے لگے۔

"اگر آپ گھر جانا چاہیں تو کار حاضر ہے،" نور نے روٹھے انداز سے کہا۔

"ضرور بشرطیکہ آپ پہنچا آئیں،" میں نے ہنسی روک کر کہا۔ ان کی روٹھی ہوئی شکل اور بھی دلچسپ ہو جاتی تھی۔ ہم خاموش روانہ ہو گئے نور اسی طرح منہ پھلاتے بیٹھے رہے۔

"بہت غصہ ہے آج آپ کو" میں نے ان کو بغیر دیکھے کہا یوں ہی چھیڑنے کو۔

"کیا کہہ رہی تھی سیلیا؟" وہ سختی سے بولے۔

"کچھ نہیں، آپ آگئے اور وہ ——" نور نے ایک لمبی سانس لی۔

انہوں نے مجھے خود ہی بتایا کہ انہیں اس ذکر سے کیسی نفرت تھی۔ نیلی سے انہوں نے کبھی کوئی غرض نہ رکھنی چاہی۔ مگر وہ نہ جانے کیوں پیچھے لگی ہوئی تھی اور یہ . . . . یہ اس قسم کی باتیں

ہی ان کی شان میں بڑی کوفت دیتی ہیں۔

"مگر اس میں بچوں کی طرح چڑنے کی کیا بات ہے۔ آپ لڑکی تو ہیں نہیں جس کے لئے کسی دوسرے کا پسند کرنا بھی موٹی سی گالی ہو۔"

"ہوں" انہوں نے طنزیہ ہونٹ سکیڑ کر کہا۔ "اچھا چھوڑو گی بھی اس قصّے کو؟" وہ ایک دم اُکتا کر بولے۔

"کل شام کو کہاں تشریف لے جانے کا ارادہ ہے؟ اگر تکلیف نہ ہو تو ——— خیر وہ پیچ تو پورا کرنا ہی ہے۔"

"وہی جس میں آپ ہار رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ہونہہ! ہار رہا تھا!"

"اور کیا؟ گویا آپ بھول گئے۔ آپ اتوار کو ہار ہی تو رہے تھے!"

"کونسی اتوار؟" وہ شرارت سے مسکرائے۔

"وہی جس دن مسٹر مختار کے یہاں گئے تھے۔"

"ہوگی بابا، چھوڑو بھی" مسٹر مختار کے ذکر سے نُور کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ انہوں نے کسی دور دراز کے رشتہ دار سے کچھ شادی کے سلسلہ میں مجھے بھی شریک کیا تھا۔

"اچھا آدمی ہے بیچارا"

"بہت" طعن سے بولے۔

"کافی شان دار پارٹی تھی۔" میں نے پھر کہا۔

"بہت" وہ دانت بھینچ کر ہنسے۔

"بہت اچھا ٹیسٹ ہے مکان کے بارے میں۔"

"بہُوت!!!" نُور نے جیسے مجھے کاٹنے کے لئے منہ پھاڑ کر کہا۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد نُور نے سرمایہ داروں کو اُلٹی سیدھی سُنانی شروع کیں۔ اگر اُن کے پاس روپیہ ہوتا تو وہ کبھی گورنمنٹ کی غلامی نہ کرتے اور گھر بیٹھ کر قوم کی کچھ خدمت کرتے۔ میں نے کچھ تجارت کے لئے کہا تو تمسخر اُڑانے کے لئے بہت ہنسی کو دکا

اور جھک کر شیشے میں سے دور سیاہی کو گھورنے لگے۔

میں نے نور کو لبھانے کے لئے کبھی بھڑکیلے کپڑوں وغیرہ کو اہمیت نہ دی تھی۔ مجھے جب سے معلوم ہوا تھا کہ وہ سفید اور سادہ کپڑوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ میں نے ریشمی کپڑوں کو پہننا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ میرے ہاتھ میں صرف سیاہ چوڑیوں کا ایک لچھا تھا۔ باتوں کے درمیان کبھی کبھی میں ایک چوڑی دانستہ توڑ کر اس سے ٹکڑے کر کے پھینکتی جاتی۔

"اونہوں، کیوں توڑتی ہو؟" انہوں نے تازہ چوڑی توڑنے پر مجھ سے ٹکڑے چھین کر کہا۔

میں نے باتوں کے جوش میں پھر چوڑی توڑی۔ "پھر، میں کہتا ہوں اب کے چوڑی توڑی تو سب ایک دم توڑ ڈالوں گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے زور سے میرا ہاتھ دبایا۔ چٹ چٹ بہت سی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔

"ارے ...... بھئی مجھے کیا معلوم تھا۔ میں نے تو یونہی ذرا پکڑا تھا۔" انہوں نے ہاتھ پکڑ کر کہا اور پھر چھوڑ دیا۔

"ذرا ایک کام تو کرو۔" انہوں نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ "ذرا —— بھئی سگریٹ تو نکال کر جلا دو۔ اِدھر ہے اُدھر ——" وہ ٹھوڑی سے داہنی جیب بتا کر کہنے لگے۔

جھک کر سگریٹ کیس تک پہنچنے میں بالکل آڑا ہونا پڑا۔ میرا چہرہ جھک کر اُن کے اتنا پاس آ گیا کہ گرم گرم سانس بالکل کان کے پاس محسوس ہوئی ...... وہ اور جھکے مگر رُک گئے۔

"نکال بھی چکو،" وہ جھنجھلا کر بولے۔ وہ بے طرح اپنا ہونٹ چبانے لگے۔ ٹینس کھیلنے میں گیند مِس کر کے اُن کی یہی حالت ہوتی تھی۔

میں نے سگریٹ دی۔ جسے انہوں نے آہستہ سے لبوں میں پکڑ لیا۔ ان کی قربت کپڑوں کی مخصوص خوشبو، سگریٹ کی بھینی بھینی مہک خاموشی میں مل جل کر مجھے نیند سی آنے لگی۔ موٹر آہستہ آہستہ نغمہ کی سرسراتی تیر رہی تھی —— رفتار اتنی بتدریج کم ہو گئی کہ مجھے کار کے رکنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ انہوں نے جھک کر میری طرف کی کھڑکی کھولی تو اُن کا سر بالکل میری ناک کے پاس آ گیا اور ایک دفعہ تو میں اُن کے بازوؤں کے حلقے میں آ گئی۔ ان کا ہاتھ ایک لمحہ کو رُک

گیا۔۔۔۔۔مگر ساتھ ساتھ کھڑکی کھُل گئی اور میں باہر تھی۔۔۔۔۔وہ پھر ہونٹ چبا رہے تھے۔

جب بستر پہ لیٹی تو جسم ٹوٹ رہا تھا۔ ایک عجیب مسرّت بھری تھکن دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔۔۔۔۔راجہ صاحب کے پوتے کی سالگرہ سے لے کر آج تک کے واقعات سینما کی تصویروں کی طرح بار بار ناچ رہے تھے۔ اس دن انہوں نے ادب سے کرسی خالی کرکے مجھے جگہ دی تھی۔۔۔۔۔اور بھی تھے ہزاروں، اس دن مختار کہاں تھے؟۔۔۔بے وقوفوں کی طرح دھواں اُڑا رہے تھے اور فرنیچر کا تخمینہ لگا رہے تھے۔ مجھے نیلی کا خیال آیا۔ غریب لڑکی۔ مجھے اس پر بہت رحم آیا۔ بے رُخی تو دیکھو، ملتے تک نہیں۔ اس سے نیلی کو مجھ سے تو جلنے کا کوئی حق نہیں۔ میں نے تو نہیں کہا کہ تم اس سے نہ ملو۔ ان کی عادت ہی عجیب ہے۔ کتنے مہینے ہوگئے میں نے انہیں کسی لڑکی سے ملتے جُلتے نہیں دیکھا۔

مجھے پھر ہنسی آگئی۔ جب میں نے سوچا کہ کیسا لگتا ہوگا، جب جسے چاہو وہ کسی دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ میں نے ارادہ کرلیا کہ نیلی سے انہیں ملنے پر مجبور کیا کروں گی۔ اس کے کچھ تو زخم بھر جائیں گے اور سچ کہتی ہوں اس میں غرور کا شائبہ بھی نہ تھا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ اس دفعہ دہلی سے ضرور انگوٹھی لے آئے ہوں گے۔ یقیناً اس میں سبز رنگ ہوگا جس کے چاروں طرف ہیرے جھلملا رہے ہوں گے۔ اندھیرے میں مجھے اپنے بائیں ہاتھ کی چھنگلی کے پاس اُنگلی تو نظر نہ آئی لیکن ہیروں کا حلقہ جس کے بیچ میں سبز رنگ دمک رہا تھا آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا۔ کچھ عجیب نیم خوابی کی سی کیفیت تھی۔ دُھندلی دُھندلی تصویریں آنکھوں کے سامنے پھر سے لگا رہی تھی۔ ان کا شراب بھی مجھے بالکل قریب تکیہ کے پاس جھکا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور ایک دم سے جیسے میں ایک خوب صورت آراستہ گھر میں انتظامِ خانہ داری میں منہمک نوکروں کو احکامات دیتی نظر آنے لگی۔ اسی چہل پہل اور پُرنور فضا میں ایک ننھا سا بچّہ جس کے بال بالکل نور کی طرح گھومے ہوئے اور گھنے تھے اور ویسے ہی بھرے ہوئے خوش رنگ ہونٹ مجھے اپنے بہت قریب محسوس ہوئے اور میں سوچنے لگی کہ یہ کھلونا بڑا ہو کر سبز قمیص اور سفید پتلون پہن کر کتنی اچھی ٹینس کھیلے گا۔

شام کو ذرا دیر تک انتظار کرنے کے بعد نوّر نہ آئے۔ میں نے چاہا کچھ دیر اخبار ہی دیکھ لوں، یا سویٹر ہی بنوں، مگر روہانسی ہو گئی اور جی نہ لگا۔ کہ اتنے میں نوّر کی موٹر کا ہارن آہستہ سے بجا۔ سُن سے جیسے کسی نے سر سے پیر تک بجلی لگا دی۔ . . . وہی سبز قمیص اور سفید پتلون پہنے گلے میں مفلر جھولتا بڑی شان سے ریکٹ ہلاتے جناب داخل ہوئے اور آتے ہی بے ڈھنگوں کی طرح کرسی پر لیٹ گئے۔

"اجازت ہے؟" وہ لیٹے لیٹے جوتا کھولنے کا ارادہ کر کے کہنے لگے۔

"نہیں" میں نے رعب سے کہا۔

"ارے بھئی یہ کیوں؟" وہ تعجب سے بھویں چڑھا کر بولے۔

"یوں کہ —" میں نے نیچے بیٹھ کر اُن کے جوتے کھول دیئے۔

وہ آہستہ سے اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ جیسے کسی نے ان کے کہیں چوٹ مار دی۔ غور سے کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے۔ پھر میری مسکراہٹ اور کھسیانہ پن پر خود بھی ہنس پڑے۔ ان کی آنکھوں سے سچی الفت ٹپک رہی تھی۔ وہ انگڑائی لے کر پوری کرسی پر پھیل گئے۔

"ارے . . . میرا سوٹ کیس . . . ." انہوں نے چونک کر کہا۔

"کیسا سوٹ کیس؟" میں نے پوچھا۔ لیکن فوراً ہی مجھے دروازے کے پاس نظر آگیا میرا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ کیا ہو گا اس میں؟ میرے تخیل کی پھرتیلی آنکھوں نے اس میں رکھی ہوئی زرّین ساریوں کی تہوں میں آنکھ مچولی کھیلنا شروع کی . . . . لیکن بغیر ابا جان اور گھر والوں کی رائے کے میں — خیر، چیزیں لینے میں تو انکار نہ تھا . . . . مگر میری مادّی آنکھوں نے سوٹ کیس کھلنے کے بعد اس میں ایک خوب صورت مردانہ نائٹ سُوٹ اور دو ایک اُلٹی سیدھی چیزیں دیکھ کر بھٹ جانا مناسب سمجھا اور کیا کرتی؟

"کیا آپ کہیں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ ذرا حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ پھر ہنس دیئے۔ میں بھی ہنس دی۔

بولے "ہاں۔ ایک بے وقوف کے یہاں" اور پھر ہنسے۔ "تم بچہ ہی ہو۔"

انہوں نے کپڑے ہٹا کر ایک قیمتی گھڑی نکال کر میری کلائی پر باندھ دی۔

"آپ آخر" میں نے ذرا حجت کی۔

"تم میری ہو۔" انہوں نے خود مختاری سے کہا۔ ان کی یہ ادا مجھے بہت پسند تھی۔ بولو!"

"مگر ابا جان کو لکھئے۔" میں نے ان کا بازو تھام کر کہا۔

"ارے!" جیسے وہ اچھل پڑے۔

"بغیر ان کی مرضی کے شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ میں نے گھڑی سے کھیلتے ہوئے کہا۔

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ مجھے بہت دل میں ہنسی آئی۔ عقلمند کہیں کے اس میں سوچ اور فکر کی آخر کیا بات تھی۔ چاہے ابا جان انہیں دل سے پسند نہ کریں۔

"آپ لکھئے، وہ مان جائیں گے" میں نے "نہ" لگا کر پھر زور دے کر کہا "وہ انکار نہیں کر سکتے۔"

"انکار!" وہ بالکل ہی چونک گئے۔

"مگر ان کی مرضی بغیر شادی۔!"

"شادی؟" ان کے گھٹے گلے سے نکلا اور میں چکرائی "شادی کا کون بے وقوف ذکر کر رہا ہے۔"

"پھر —— پھر ——؟" میرے پیر کانپ رہے تھے۔

"پھر —— پھر" وہ ہنسے۔ زندگی! —— تم جاہل تو....."

"اور ... اور" میری زبان تالو سے چپٹنے لگی۔

"شادی!" وہ ہنسے "یہ بے وقوفی تو میں کر بھی چکا....."

میں مجسم سوال بن کر رہ گئی۔ وہ خود ہی بولے۔

"ڈیڑھ مہینہ ہوا ... مجبوراً ... نیلی سے" وہ اداسی سے ہنسے

اور پھر پرانا محل گرتا ہے۔ بڑھیا اپنے برتن بھانڈے اٹھا لے۔ اڑا اڑا دھم۔

میرے تخیل کا بے بنیاد گھروندا ڈھے پڑا۔ ایک دم بھک سے ساری بجلیاں بجھ گئیں۔

اور اس مگر وہ اندھیرے میں مجھے ایک ننھے سے بچے کی خاموش چیخیں سنائی دیں جس کے

بال اور ہونٹ تاریکی کی وجہ سے صاف نظر نہ آتے تھے۔

اب ان سیاہ بدصورت بچّوں کی گودی میں ——— مجھے اکثر وہی ننھّا سا گھنے گھومے ہوئے بالوں اور بھرے ہوئے خوش رنگ ہونٹوں والا بچّہ اپنے سے بہت قریب محسوس ہوتا... مگر مختار صاحب کو یہ کیا معلوم!

انتخاب

کِردار :-

خالہ بی : چالیس پینتالیس سال کی امیر بیوہ۔ بھاری بھر کم، اپنی عمر سے زیادہ جوان اور خوبصورت نظر آتی ہیں۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے بُردباری اور غرور ٹپکتا ہے۔ کنپٹیوں پر ہلکے ہلکے سفید بالوں کی جھلک پیدا ہوگئی ہے۔ چھوٹے سے دہانے میں اگلے تین مصنوعی دانت کسی طرح اصلی بتیسی سے کم خوبصورت نہیں۔ چال میں ایک دبدبہ ہے اور تمکنت ہے۔

شمیم : خالہ بی کی بھانجی، خالص ہندوستانی رنگ اور معمولی نقشے کا مجموعہ۔ سیدھی سادھی بچی۔ خالہ بی کے دباؤ میں رہنے والی کبھی سیدھے مُنہ بات نہیں کرتی۔ لوگ کہتے ہیں اس کا معدہ خراب رہتا ہے اس لئے اس قدر چڑچڑی اور کھسیانی ہوئی رہتی ہے اللہ جانے!

واجد : شمیم سے سال ڈیڑھ سال بڑا بھائی۔ سیدھا سادا جلد باز،

عالم : واجد کا بچپن کا دوست ہم سن اور ہم جماعت۔ ذرا قد لمبا ہے۔ لیکن ذرا دُبلا اور کرخت ساخت کا بنا ہوا جسم۔ ناک نقشہ بالکل عام انسانوں جیسا بہت بے تکلف۔ گویا اپنے ہی گھر میں رہتا ہے۔

نوکر : ننھی، فرید اور حسبِ ضرورت صرف نام لینے کے لئے۔

اسٹیج : شمیم کا کمرہ اور ایک عام ہندوستانی بی بی کے بیٹھنے کا برآمدہ، جس میں چار تختوں کا فرش ہے اور اِدھر اُدھر حسبِ ضرورت کرسیاں وغیرہ رکھی ہیں۔

زمانہ: جو بھی آپ کو پسند ہو۔

(وقت شام۔ شمیم اپنے کمرے میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی ہے۔ ایک دروازہ پُشت پر ہے اور دو دائیں اور بائیں طرف۔ بائیں طرف کا دروازہ کھلتا ہے اور خالہ بی نظر آتی ہیں وہ کچھ دیر شمیم کو منتظر نظروں سے دیکھتی ہیں اور پھر اندر آجاتی ہیں)

خالہ بی: اے شمیم یہ نہا دھو کر گیلے بالوں سے اندر آکر بیٹھ گئیں۔ بال بھی نہ سکھاتے ذرا باہر ہی نکلو۔ توبہ ہے۔

شمیم: جی خالہ بی ابھی جاتی ہوں۔

خالہ بی: تو آخر اس قدر شام گئے نہانے کا کون سا فیشن نکالا ہے۔ جب ذرا سی بھی دھوپ نہیں رہتی۔ گھر میں، تو بیگم غسل کرتے چلتی ہیں گیلے بال! غضب خدا کا ذرا سی دیر میں سردی لگ جائے

شمیم: (بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کر کے) سُوکھ تو چلے اب۔

خالہ بی: خاک سُوکھ چلے ذرا اپنا ڈیل ڈول دیکھو اور یہ بے احتیاطیاں!

شمیم: (تنگ آکر) کہہ تو دیا کہ ابھی جاتی ہوں باہر۔

خالہ بی: تم جانو۔ میں تو بھئی تمہارے ہی بھلے کو کہتی ہوں۔ اپنے پلے کا سب ہی کو درد ہوتا ہے یہ کہو کہ محبت سے مجبور رہوں اور تم سمجھتی ہو کہ ——

شمیم: (نصیحت کے طوفان سے ڈر کر) یہ میں نے کب کہا (جانے کے لئے اُٹھتی ہے) جا تو رہی ہوں۔

خالہ بی: اب کیا سردی میں مرنے کو جاؤ گی۔ دھری ہے دھوپ تمہارے لئے اس وقت، اب بیٹھی ہو تو بیٹھی رہو۔ ننھی سے کہتی ہوں انگیٹھی یہیں لے آئے (دروازہ کی طرف مڑ کر) ننھی! اے ننھی! —— کتنی دفعہ کہا کہ اللہ کی بندی منہ سے بولا کرو کہ بس چلی آرہی ہیں (ننھی کی آواز دروازے کے پاس آتی ہے اور وہ اندر جھانکتی ہے) ذرا ایک کر کوئلے انگیٹھی میں ڈال کے تو لے آؤ۔ ہاں —— سُنو ذرا وہیں دہکا لانا۔ یہ نہیں کہ دھواں پھیلے اور وہاں میری شال الگنی پہ پڑی ہوگی وہ بھی لیتی آنا (خود سے) موئی انگلیاں اینٹھی جاتی ہیں۔ کیا بلا کی سردی ہے —— اور شمیم تم کچھ پہنے بھی نہیں ہو۔ کیا کچھ برف کٹ رہی ہے۔

(شمیم خاموشی سے ایک صدری کھونٹی پر سے اتار کر پہننے لگتی ہے)

خالہ بی: بیٹی میں تو تمہارے ہی بھلے کو کہتی ہوں۔ ۔۔۔۔ (ننھی کو آتا دیکھ کر) اے بس آ بھی چکو تو بیگم کہ بس چل رہی ہیں دلہن کی چال (ننھی انگیٹھی لاکر رکھ دیتی ہے) ذرا ادھر سرکاؤ کیا سوزنی جلاؤ گی؟ اوئی ۔۔۔۔۔ اے ذرا ادھر ۔۔۔۔ میں کہتی ہوں (خود دوپٹے سے پکڑ کر سرکاتی ہیں) دل جلانے سے بہتر ہے انسان ہاتھ جلالے ۔۔۔۔۔ لو شمو ذرا سرک کر بیٹھو ۔۔۔۔۔ ہاں (ننھی سے) اے بی میرا منہ کیا کھڑی تک رہی ہو (شمو سے) ۔۔۔۔۔۔ ہاں تو تمہارے ہی بھلے کے لئے کہتی ہوں۔ تم سمجھتی ہو میرا بھی کچھ فائدہ ہے۔

شمیم: (خواہ مخواہ رنجیدہ ہو کر) جی نہیں تو۔

خالہ بی: واجد اور تم —— دونوں ہی میری زندگی کا آسرا ہو —— میرا جو کچھ ہے تمہارے ہی لئے ہے۔ تم لوگوں کے علاوہ اور کون بیٹھا ہے میرا —— تم سمجھتی ہو گی میں تمہاری دشمن ہوں۔

شمیم: آپ تو یوں ہی کہہ دیتی ہیں۔

خالہ بی: تو پھر کیا تم مجھے اپنا ہمدرد سمجھتی ہو۔ اگر ایسا ہے تو پھر بھول بھول کیوں جاتی ہو۔ جو بات میں کہتی ہوں وہ ۔۔۔۔۔۔

شمیم: کیا بھول جاتی ہوں۔

خالہ بی: یہی کہ میں نے تم سے کتنی دفعہ کہا کہ بھئی عالم کو منع کر دو —— خواہ مخواہ —— یوں ہی ۔۔۔۔۔

شمیم: (کچھ برا مان کر) کیا خواہ مخواہ؟

خالہ بی: یہی کہ وہ یہاں —— نہ آیا کرے —— اب —— تم جانتی ہو کہ ——

شمیم: (کچھ نہ سمجھ کر) آئیں؟

خالہ بی: اب تم کوئی ننھا بچہ نہیں۔ جو کچھ نہ سمجھو۔ میں کہتی ہوں وہ آخر کیوں آتا ہے یہاں؟

شمیم: (روہانسی ہو کر) تو خالہ بی کیا میں بُلاتی ہوں اُسے۔
خالہ بی: تو منع کر دونا!
شمیم: منع کر دوں ــــ وہ مانے بھی۔ جب میں اُسے کچھ کہتی ہوں تو کہہ دیتا ہے تمہارا گھر نہیں ہے۔ تم خود نکل جاؤ یہاں سے ــــ آپ کیوں منع نہیں کر دیتیں۔
خالہ بی: تم اُسے اپنے کمرے میں تو نہ آنے دو۔ نہ تم منہ لگاؤ گی اور نہ وہ آئے گا۔
شمیم: (چڑ کر) میں کب مُنہ لگاتی ہوں اُسے ــــ وہ واجد کا دوست ہے۔ برسوں سے آتا ہی ہے اور مجھے تو آپ دیکھتی ہی ہیں پریشان ہی کرتا ہے۔ میں تو خدا سے چاہتی ہوں وہ نہ آئے۔
خالہ بی: کچھ بھی ہو، اُس کا اس طرح سے گھُس گھُس کر آنا اچھا نہیں۔ لوگ نہ جانے کیا کیا کہنے لگتے ہیں۔
شمیم: کیا کیا؟
خالہ بی: ہاں جتنے مُنہ اتنی باتیں ــــ اور بیٹی کوئی کسی کا مُنہ تھوڑی بند کر دیتا ہے۔
شمیم: کیا کہیں گے لوگ؟ وہ ہمیشہ سے جب سے بالکل چھوٹا سا تھا۔ ہمارے یہاں آتا ہے۔
خالہ بی: اب تم تو ــــ بس بچہ بنی جاتی ہو۔ جب کی اور بات تھی بیٹی!
شمیم: کیا بات تھی جب کی۔
خالہ بی: یہی کہ بھئی کھاتے پیتے گھر کا لڑکا ہے۔ کسی دن اچھی خاصی جگہ لگ جاتے گا اور اب...
شمیم: (چہرے پر شکنیں ڈال کر) اب کیا ہوگا؟
خالہ بی: اب یہ بات ہے کہ اس کے ابا مقدمے ہار گئے۔ مکان الگ ......
شمیم: پھر اس سے کیا ہوتا ہے؟
خالہ بی: (دبی زبان میں) پھر بس یہی ہوتا ہے کہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہیں ــــ اور کیا؟
شمیم: تو ہم کیا کریں ــــ وہ کوئی ہمارے سر پر آن نہیں پڑا ــــ اپنا کھاتا ہے۔ ہمیں کیا۔

خالہ بی: اے ہے تم تو بس دیوانی ہو۔ بیٹی اب اور بات ہے — بھئی — اونہہ لوگ خواہ مخواہ باتیں بنانا شروع کر دیں گے ویسے تمہارے خالو کا ارادہ تھا کہ ہاں بھئی کسی لائق ہو گیا تو دیکھا جائے گا — مگر اب تو — بھئی لوگ کیا جانیں — وہ سمجھیں گے اب بھی وہ اسی خیال سے آتا ہے۔

شمیم: (جل کر) اونھ آتا ہے۔ وہ کیوں آتا؟ جی ہاں!

خالہ بی: ہاں ہاں۔ مگر لوگ کیا جانیں کہ اب ہمارا ارادہ رشتہ کرنے کا نہیں۔ خواہ مخواہ پیغام آتے بند ہو جاتے ہیں کہ بھئی اب تو ایک جگہ طے ہی ہو گئی۔ تم کیا جانو دنیا کی باتوں کو!

شمیم: (سنجیدگی سے) اچھا — (عالم کو داہنے دروازے سے جھانکتا دیکھ کر گھبراتی ہے۔ وہ جلدی سے بھاگ جاتا ہے) اچھا — خالہ بی — ہیں — ہیں — ہاں — ہاں۔

خالہ بی: (خوش ہو کر) ہاں بیٹی تم سمجھ دار ہو — اور تمہارے ہی بھلے کی کہتی ہوں۔ ذرا بال سکھا لو تو باہر آؤ — میں ذرا کھانے وانے کا انتظام کر دوں جا کے (بھلانے کو) کب تک کھل رہا ہے اسکول تمہارا؟ کچھ کپڑے وغیرہ بھی ٹھیک کئے یا یوں ہی! ساڑھیاں تو کلکتہ سے منگوا لو، غنی کو جمپر دے دو — آج آیا تھا تم سو رہی تھیں۔ پورے سال کا انتظام کر لو — اے ہاں! بیچ میں تو ضرورت نہ پڑے تمہارا ہی فائدہ ہے (جاتی ہیں)

عالم: (اکڑتے ہوتے دوسرے دروازہ سے داخل ہو کر) فائدہ — فائدہ، بس ہر وقت فائدہ۔ جب دیکھو فائدہ۔ ہونہہ! بنیئے کی سی روح پائی ہے۔ قسم خدا کی۔!

(شمیم اُسے دیکھ کر تیوریاں چڑھاتی ہے)

عالم: کہاں گیا وہ جن؟

شمیم: پیچ دیکھنے۔

عالم: پیچ دیکھنے! اور ہمیں لائبریری میں بٹھا گیا پڑھنے کو کہ امتحان آ رہے ہیں۔ قسم خدا کی!

شمیم: (جلدی بات ختم کرنے کو) تو کیا ہوا جو آج پڑھ لیا۔ اب چلے جاؤ پیچ دیکھنے۔

عالم: اب چلے جاؤ۔ ہونہہ! گویا میرے لئے رات بھر پیچ ہوتا رہے گا۔ آخر اس پاجی کو حق کیا ہے۔ کہ خود تو جائے پیچ دیکھنے، اور ہمیں پڑھوائے تین گھنٹے . . . (تین انگلیاں ہلا کر) خدا کی

قسم تین گھنٹے طبیعت کے ــــ متواتر! سوچو ذرا ــــ تین۔ اتنی دیر میں نہ جانے کتنے پیچ دیکھے جا سکتے ہیں۔

شمیم: (ٹالنے کو) تو اب واجد سے لڑنا۔ میرا دماغ تو نہ چاٹو۔ جاؤ۔

عالم: (کھڑے سے ہی کھڑے) دماغ! ہونہہ۔ گویا آپ کے بھی ہے۔ خوب! خالی ہنڈیا بھلا میں کیا چاٹوں گا۔

شمیم: (بہانہ پا کر) ہوگا۔ خیر جاؤ۔ میں اس وقت ــــ (کتاب پڑھنے لگتی ہے) فضول بکواس!

عالم: فضول ــــ اور بکواس ــــ دو لفظ بدتمیزی کے (کتاب چھین کر پھینکتے ہوئے) ہم تین گھنٹے پڑھ کر آرہے ہیں۔ کتاب دیکھ کر جی متلا رہا ہے۔ بس ــــ

شمیم: (غصہ سے) بھئی ہو چکی بد مذاقی ــــ ہر وقت یہی ــــ خیر جاؤ یہاں سے (کتاب اٹھا کر جھاڑتی ہے) جاؤ نا!

عالم: ضرور! (بیٹھ جاتا ہے) تم کون بھیجنے والی۔

شمیم: (زور سے بڑبڑا کر) نہ جاؤ میری بلا سے۔

عالم: بلا سے! تم خود بلا ہو ــــ ہونہہ! گویا بڑی ــــ

(شمیم مذاق بڑھانا نہیں چاہتی۔ لہذا چپ ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھ کر بیٹھ کر پڑھنے لگتی ہے)

عالم: خیر بھئی پڑھو۔

(اُٹھ کر اس کی پُشت پر الماری میں کتابیں دیکھنے لگتا ہے۔ کن انکھیوں سے اُسے دیکھتا جاتا ہے۔ قریب آکر آہستہ سے اس کا ایک بال پکڑ کر کھینچتا ہے۔ شمیم صرف سر کھجاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد عالم پھر ایک بال توڑتا ہے وہ بال سمیٹ کر جوڑا باندھ لیتی ہے۔ عالم ایک سگریٹ سُلگاتا ہے۔ بُجھی ہوئی دیا سلائی اس کی اُنگلی سے لگا دیتا ہے۔ شمیم اُچھل پڑتی ہے اور مڑ کر اُسے گھورتی ہے عالم بے تعلقی سے کرخت چہرہ بنائے کتابوں کو گھورتا ہے)

شمیم: بیہودہ کہیں کے۔ میں خالہ بی سے کہہ دوں گی بے حیا کہیں کے۔ میں گھنٹہ بھر سے کہہ رہی ہوں جاؤ، جاؤ، سنتے ہی نہیں۔ کوئی اور ہوتا تو کبھی نہ آتا پھر اس کمرے میں۔

عالم : بدتمیز تم خود اور بے حیا پرلے درجے کی۔ بس۔ کوئی اور ہوتا تو پکڑ کے تمہیں ٹھوکتا بری طرح۔ کوئی تمہارے یہاں آئے اور تم بھوتنی سمجھا کر بیٹھ جاؤ۔

شمیم : میں کہتی ہوں جب کم بخت کسی کی یہاں ضرورت نہ ہو تو پھر کوئی کیوں آئے۔ لعنت ہے۔

عالم : لعنت خود تمہارے منہ پر، پڑھنا خاک نہیں آتا لیکے بیٹھی ہیں ٹالسٹائی۔

شمیم : اندھے! یہ ٹالسٹائی ہے! (دکھا کر) ہارڈی ہے۔

عالم : وہ ہارڈی ہوں یا پھارڈی۔ تمہارے بس کا روگ نہیں۔ کیوں دماغ کھپا رہی ہو——اس سے بہتر ہے کہ جاکر روٹی پکانا سیکھو۔ جو کسی کام بھی آئے۔

شمیم : روٹی پکانا سیکھو تم۔ جیسے باورچی گیری کرتی ہو۔

عالم : یہی تو خرابی ہے پڑھی لکھی لڑکیوں میں کہ گھر کے کام کاج سے نفرت کرنے لگتی ہیں۔

شمیم : (بے پروائی سے) ہونے دو خرابی، تمہاری بلا سے۔

عالم : لیکن پھر بھی اگر پکانا پڑے تو کیا کرو تم؟

شمیم : کیوں پکانا پڑے۔ خدا نہ کرے تمہیں بھیک مانگنا پڑے تو؟

عالم : کسی وقت نہ ہو نوکر تو کون پکائے؟

شمیم : تم پکاؤ اور کون؟ جاؤ یہاں سے بک بک نہ کرو۔ ورنہ کہتی ہوں۔ خالہ بی ہے

عالم : کہہ دو، ہزار دفعہ کہہ دو ... نہیں جاتے۔

(پیچھے دروازے سے واحد آتا ہے)

واحد : (آکر بغیر سوچے سمجھے) ہاں نہیں جاتے۔ کیوں جائیں؟

عالم : (شیر ہو کر) کیوں جائیں ہے بے شک!

شمیم : تمہارے تو اچھے بھی جائیں گے میرے کمرے سے!

واحد : قطعی نہیں۔ بیٹھ جاؤ عالم لو (بیٹھ کر) نہیں جاتے کر لو کچھ۔

عالم : (فوراً نقل کرتے ہیں) ہاں کر لو کچھ۔

شمیم : تم نہ جاؤ۔ میں خود جاتی ہوں (جانے لگتی ہے)

واجد: نہ۔ نہ ۔تم بھی نہیں جا سکتیں۔ لینا عالم اسے۔ . . .

(شمیم جلدی سے بھاگ جاتی ہے لیکن دونوں بچّوں کی طرح اسے پکڑ کر لے آتے ہیں۔ ایک ایک بازو دونوں پکڑے لیفٹ رائٹ کرتے آتے ہیں شمیم کچھ چڑکر ہنس رہی ہے کچھ واپس جانے کی فکر کر رہی ہے)

شمیم : چھوڑو بھئی!

(دونوں اسے چوکی پر بٹھا کر دونوں طرف گھس کر بیٹھ جاتے ہیں)

واجد: ہوں۔ اب بولو۔

عالم : ہاں اب بولو۔ چلیں بھاگ کے۔ سمجھی تھیں ہم تو مر ہی گئے ہیں۔

شمیم : بھئی کیا بدتمیزی ہے (گرفت سے نکل جاتی ہے)

(دونوں پکڑ لیتے ہیں) چلیں کہاں؟

شمیم : (تھک کر) چھوڑو تو۔ کہیں نہیں۔ بھئی جا نہیں رہی ہوں۔ یہیں بیٹھوں گی کرسی پر۔

واجد: اچھا لو— چھوڑ دو عالم— ہاں بات کیا تھی؟

(وہ ذرا ہلتی ہے تو دونوں اُسے ایک دم دبوچ لیتے ہیں)۔

شمیم : بھئی خدا کی قسم میں رو دوں گی (کتاب اُٹھا کر) اب کے جو تم نے چھوا تو مار دوں گی۔ لو۔

اب آؤ (عالم اور واجد کتاب کو ڈر کر دیکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے قریب فرمانبردار بچّوں کی طرح بیٹھ جاتے ہیں)

شمیم : بات یہ تھی—

عالم : نہیں —بات دراصل یہ تھی—

شمیم : قطعی نہیں— یہ ہوا کہ—

عالم : ہوا ہی نہیں — قطعی نہیں (شمیم اُسے بولنے کا موقع دیتی ہے) یہ ہوا کیا ہوا۔ شمیم بتاؤ نا۔ لے کے سارا بھلا دیا— اونھ!

شمیم : ہوا کچھ بھی نہیں۔

واجد : ہیں ـــ کیا اُلو پن ہے۔ آخر جب کچھ ہوا ہی نہیں تو پھر تمہیں کا حق جو عالم کو کمرے سے نکال رہی ہو۔

عالم : (بھیگی بلّی کی طرح) تمہیں دیکھو اب۔

شمیم : بھئی بات یہ تھی کہ میں نے کہا میرے کمرے میں سے جاؤ۔

واجد : کیوں صاحب، کیوں جاؤ ـــ یعنی بات کچھ بھی نہیں اور جاؤ ـــ (ہاتھ چلاکر) کیوں؟

شمیم : بھئی میری مرضی، میں نہیں چاہتی۔

عالم : (زور سے قہقہہ لگاکر) ذرا ان کی سننا وجّن "نہیں چاہتی"، گویا انہیں چاہنے اور نہ چاہنے کا حق بھی ہے کچھ۔ ارے یہ کیسے؟

واجد : ہاں، یہ کیسے؟

شمیم : بھئی میں نہیں پسند کرتی۔

عالم : پسند ـــ لو ـــ وجّن (کندھے سے ٹہوکا دے کر) اب لو، اب تک تو چاہا ہی کرتی تھیں۔ اب پسند کرنے بھی چلیں۔ یہ کیسے؟ ـــ بھائی تم تو بس جو خالہ بی کہتی تھیں اور چاہتی تھیں وہی کرتی تھیں۔ اب یہ سوراج کیسے مل گیا۔

شمیم : واہ ـــ یہ کیوں ـــ واہ ـــ اوہو!

عالم : اب ہکلانے سے کیا ہوتا ہے کیا معلوم نہیں ہے۔ حقیقت تمہاری، کیوں وجّن! ہم انہیں غلام کہتے ہیں نا؟ ـــ غلمٹا!

واجد : (ٹائی کو سینے پر سنبھالتے ہوئے) بے شک۔

شمیم : کیوں آخر؟

واجد : ایسے ہی۔

شمیم : تم خود کمینے، غلام، بدتمیز، کم بخت۔ بس۔ اب ہوئے ٹھیک!

عالم : اور کچھ۔ اور کہو۔ بھلا پھول سے جھڑ رہے ہیں۔ بس۔ میرا بس چلے تو ایسی چھوکری کی زبان کاٹ لوں۔ قسم خدا کی!

شمیم : تمہارا بس چلتے ہی کیوں لگا تھا۔ خدا گنجے کو ناخن ہی نہیں دے گا۔

عالم : یہ ہیں تو لمبے لمبے ڈائنوں جیسے (اس کی انگلیاں جن میں لمبے ناخنوں پر روغن لگا ہے پکڑ کر) یہ دیکھو — کیوں وجن ؟

شمیم : (غصہ سے کتاب مار کر) ہٹاؤ ہاتھ بدتمیز — میں کہتی ہوں بہتر ہے چلے جاؤ یہاں سے۔

واجد : کیوں — اوں ؟ آخر وجہ بھی ہو کچھ یا یوں ہی۔ اور تم جو آئیں ہمارے کمرے میں تو پھر، ہم بھی نکالیں گے اور مار کے نکالیں گے پھر نہ کہنا۔

عالم : ہاں آؤ تم ذرا باہر، دیکھو کیسا ٹھیک بناتے ہیں اور اب کے آجائیں۔ تمہاری مس شاہ۔ یار وجن میرے سگریٹ چرا چرا کر لے جاتی ہے۔ کلچڑی۔!

واجد : (چڑانے کو) اور وہ کون ہیں — مس — مس پیٹیچر سی — اُن سے ہماری شادی کرادو۔ سُنا!

شمیم : (روہانسی ہو کر) بھئی میں خالہ بی سے کہتی ہوں جا کر کہ مجھے سنبھل بھیج دو، ہاں نہیں تو اب کے بورڈنگ میں رہوں گی۔

واجد : پھر بات کیا ہے ؟ عالم (آنکھ مار کر) تم جاؤ ذرا ہمیں بتائے گی شمّو (اس کے گلے میں باہیں ڈال کر) ہاں، ہماری توہین ہے، کیوں ؟

عالم : خیر — اچھا (جاتا ہے)

شمیم : (اُٹھ کر، اُچک اُچک کر گیلری کی طرف دیکھتے ہوئے گیا یا نہیں) میں — یہ بات تھی۔ خالہ بی نے کہا (پھر دیکھتی ہے) — وہ —

واجد : کیا واقعی کوئی بات ہے ؟ ارے بلاؤ عالم۔ اس سے کوئی بات چھپ سکتی ہے۔

شمیم : (روک کر) نہیں۔ اسے نہ بلاؤ۔ سُنو تو!

واجد : کہو بھی کہہ بھی چکو۔ پھر تیا تو دوں گا ہی۔

شمیم : خالہ بی کہتی ہیں، وہ ہمارے یہاں نہ آئے۔

واجد: کیوں نہ آتے؟ وہ میرا دوست ہے۔ میں جہاں جا سکتا ہوں، وہ بھی جا سکتا ہے۔
وجہ کیا؟

شمیم: وہ کہتی ہیں اس کا باپ مقدمہ ہار گیا۔ اور جانے کیا کیا —— بھئی مجھے نہیں
معلوم!

واجد: ارے مقدمہ ہارے باپ اور آنا عالم کا بند ہو۔ وہ مقدمہ ہی ہارنے والا تھا۔ پھر
بھلا عالم سے ——

شمیم: جانے کیا۔ بھئی وہ کہتی ہیں عالم نہ آئے۔

واجد: آخر کیوں؟

شمیم: وہ کہتی ہیں کہ لوگ نہ جانے کیا کہیں گے۔

واجد: کیا کہیں گے کہ وہ کیوں آتا ہے۔ کہنے دو۔

شمیم: ہاں وہ کہتی ہیں کہ لوگ باتیں بنائیں گے۔

واجد: (کچھ سوچ کر) کیا یہی کہیں گے کہ وہ یہاں —— تم سے —— تمہارے ....

شمیم: (چڑ کر) بھئی میں کب کہہ رہی ہوں؟ واہ!

واجد: (بگڑ کر) کیا سمجھا ہے تم نے میرے دوستوں کو! کوئی وہ غنڈے ہیں؟ کیا قصہ ہے۔
معاف کیجئے گا۔ میرے دوست لفنگے نہیں۔ وہ قطعی تمہارے —— وہ میرے
دوست ہیں نہ کہ آپ کے —— آپ ....

شمیم: (قریب قریب رو کر) بھئی —— اُلٹا مجھ سے لڑنے لگے —— یہ بھی کوئی
بات ہے!

واجد: خوب! لو۔ میں ابھی کہتا ہوں۔ ضرور آئے گا عالم ضرور —— ایسے ہی آئے گا سمجھیں
(پکار کر) عالم! —— ارے عالم! ——

شمیم: خدا کے لئے اس سے تو نہ کہو۔

واجد: کیوں نہ کہوں! میں نے آج تک اُس سے کوئی بات چھپائی نہیں ——

عالم: (اُٹھ کر دروازے میں سے جھانکتا ہے) ارے کہاں گیا؟ —— شاید ——

(سنجیدہ ہو جاتا ہے)

شمیم: (اُداسی سے) ہاں مجھے بھی آہٹ معلوم ہوئی تھی ـــــــ شاید وہ سُن رہا تھا۔

واجد: (غصّہ سے) یہ بہت ـــــــ یہ حد ہے۔ میں اپنے دوستوں کی اس قسم کی ہتک برداشت نہیں کر سکتا۔ میں آج ہی بورڈنگ چلا جاؤں گا...... فوراً...... کیا سمجھا ہے!

شمیم: تم تو ایسے غصّے ہو رہے ہو گویا میں نے ہی کچھ کیا ہو۔

واجد: میں یہ ذلّت برداشت نہیں کر سکتا ـــــ انتہا ہے ـــــ اس قسم کی باتیں ـــــ میں آج ہی ـــــ

عالم: (پشت کی کھڑکی سے) ار ـــــ بھئی ہو چکیں پرائیویٹ باتیں ـــــ ؟ آ جائیں اب؟

واجد: (ایک دم گھوم کر) عالم ـــــ ارے آؤ ـــــ یہ دیکھو ـــــ ابھی ـــــ

عالم: (آ کر کرسی پر ٹھاٹھ سے لیٹتے ہوئے) کیا کہہ رہی تھی میری بدیاں یہ شمیم! ـــــ یار وجن! یہ بہت ہی سر چڑھتی جا رہی ہے ـــــ اب ذرا کہہ ایکٹ والے سے۔

واجد: ہم سمجھے تم ہماری باتیں سُن رہے تھے۔ عالم سچ بتاؤ، تم یہاں کیوں آتے ہو۔ کیا صرف ـ

عالم: صرف اس سے باتیں کرنے کون بے وقوف آ سکتا ہے۔ اسے سوائے زبان درازی کے اور کیا باتیں آتی ہیں۔

واجد: پھر؟

عالم: پھر کیا؟ کیسا بھدّا سوال ہے۔ ارے بھئی ہم آتے ہیں یہاں باجرے کی کھچڑی کھانے دال بھری روٹیاں کھانے، کیرم کھیلنے اور شلغم کا اچار کھانے اور ہاں (ایک دم سے) یار بہت دن سے اچار ہی نہیں بنا...... کل باجرے کی کھچڑی کے ساتھ رہے۔ کیوں؟

واجد: (خوشی سے) تو پھر تم اس کے پاس تو نہیں آتے؟ —— صرف انؔ سے باتیں
کرنے اور ——

عالم: مہا بے وقوف ہو تم۔ ان کی کھوپڑی میں ہے ہی کیا۔ سوائے ساری، جمپر اور لپ اسٹک
کے۔

شمیم: کچھی ہو ہماری کھوپڑی میں —— جی ہاں۔ گویا بڑے وہ ——

عالم: کچھ ہی کیا گوُوڑ ہے۔

شمیم: اب دیکھو واجد میری کوئی سہیلی کبھی تم سے اس قدر بدتمیزی کرتی ہے، جو یہی۔

عالم: کر سکتی ہے بدتمیزی تمہاری کوئی پاجی سہیلی؟ ٹھوکیں نہ ہم اُسے ڈنڈوں سے!
سر پھاڑ دیں۔ کیوں —— وجنؔ —— یار سچ کہتا ہوں —— ہذا کو تو ایک دن
پیٹنا ہی پڑے گا ہمیں۔

واجد: اور کیا۔ مگر سُنو تو خالہ بی کہتی ہیں.....

شمیم: کیا ہے وجن۔ پھر تم.....

واجد: کچھ نہیں ہم ضرور بتائیں گے ایک ایک بات (عالم سے) ہم سمجھے تم ہماری باتیں
سُن رہے تھے۔

عالم: (بے پروائی سے) سُن ہی جو رہے تھے۔

واجد: ارے..... پھر..... تم۔ ہم سمجھے غصہ ہو کر چلے گئے۔

عالم: غصہ ہو کر۔ یہ کیوں؟ خالہ بی جیسے تمہاری بزرگ ہیں ویسے ہی میری۔ وہ مجھے
کتنا ہی دھتکاریں پروا نہیں۔ وہ ایک دروازے سے نکالیں دوسرے سے
واپس آجاؤں یہی کرتا ہوں۔ ابھی اُن سے شمیم کے کمرے میں کبھی نہ آنے کا وعدہ
کر کے باہر سے گھوم کر آگیا..... (زور سے ہنستا ہے) اور کیا! خدا کی قسم اور کیا؟

(واجد خوشی سے مُسکراتا ہے اور شمیم بھی اپنی ہنسی روک رہی ہے)

دوسرا سین

(شام۔ برآمدہ میں چوکیوں کے فرش پر خالہ بی بیٹھی چھالیہ کتر رہی ہیں۔ عالم

اوندھا ایک کُشن پر کہنیاں ٹکائے بچھو کے ڈنک کی طرح ٹانگیں اوپر کو اُٹھائے ہے وہ صرف سفید پتلون اور قمیص پہنے ہے۔ چھالیہ کی ٹوکری میں سے دانے چُن چُن کر کھا رہا ہے)

خالہ بی: کب کُھلے گا تمہارا کالج؟

عالم: یہی کوئی پندرہ تک کُھل جائے گا۔ سوچ سوچ کر خون خشک ہو رہا ہے کہ ختم ہو گئیں چھٹیاں!

خالہ بی: اوئی، خیر۔ اتنے بڑے ہو گئے، پڑھنے سے دم نکلتا ہے۔

عالم: کیا کروں خالہ بی! مزدور آدمی ہوں مزدور۔ جتنی چاہو محنت لے لو دماغی محنت نہیں کی جاتی۔ اپنا امتحان زبردستی دلوا رہے ہیں۔ کھوپڑی بالکل کھکل ہے۔ نجومی نے بتایا تھا لڑائی میں کام آؤ گے۔ علم تمہاری قسمت ہی میں نہیں۔

خالہ بی: اے ہٹو، ان نجومیوں کا کیا ہے جھوٹے نگوڑے۔

عالم: نہیں خالہ بی جھوٹ نہیں۔ بعض وقت تو یہ پتے کی بات بتا جاتے ہیں۔ میرے دوست کو ٹھیک بتایا۔

خالہ بی: (کچھ سوچتے ہوئے مگر ٹال کر) اے ہٹو بھی۔

عالم: مذاق سے نہیں خالہ بی۔ ان کی بعض باتیں بالکل ٹھیک بیٹھتی ہیں۔

خالہ بی: (سروتہ دوسرے ہاتھ میں لے کر اپنا ہاتھ دیکھتے ہوئے) بھلا کیسے بتا دیتے ہیں یہ لوگ؟

عالم: (ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر) لائیے میں دیکھوں۔

(ہاتھ پکڑ کر غور سے دیکھتا ہے۔ خالہ بی عجیب نظروں سے سانس روکے اُس کے چہرے کو تکتی ہیں)

عالم: ہوں۔ آ۔ یہ۔ ہوں ٹھیک۔ اچھا۔

خالہ بی: (انتظار سے تھک کر) اے خاک پتہ چلتا ہوگا لکیروں سے۔

عالم: چلتا کیوں نہیں؟۔ یہ دیکھئے!۔۔۔ آں۔

خالہ بی: اے پھر بتاؤ بھی کچھ۔

عالم: (چھنگلی سے لکیروں پر نشان بنا کر) روپیہ! بہت

خالہ بی: کیا نئی بات بتائی —— مگر وہ بھی اب میں نے بچوں کے نام کر دیا ——

عالم: ہوں۔ مگر چین نہیں۔ سکونِ قلب میسّر نہیں۔

خالہ بی: (چہرے کا رنگ بدلتا ہے) ہوں۔ اور۔ ...

عالم: بہت۔ اسے بہت۔ کمزور دل۔ تکلیف۔

خالہ بی: (ٹھنڈی سانس لے کر) دل تو بہت دن سے کمزور ہو گیا ہے۔

عالم: اور —— شاعرانہ —— خواب —— تخیّل بلند۔

خالہ بی: لڑکیوں کی طرح ہنس کر) ارے!

عالم: (دیکھتے ہوئے) کیوں؟

خالہ بی: اے یہی بلند تخیّل —— نظم نما نثر لکھنے کا تو بہت شوق تھا۔ چھپی بھی دو ایک جگہ اخباروں میں۔ وہ تو کہو اب گھر کے جھگڑوں سے فرصت نہیں ملتی اور کچھ ڈھنگ کی بات بتاؤ تو جانیں۔

عالم: جی —— اور —— اُلجھن —— پریشان دماغ، بالکل فلاسفروں کا سا۔ خیالات کی بھرمار۔

خالہ بی: (غمزدہ تبسّم سے) اور۔

عالم: (اور ایک دم پھدک سے) دو بچے نہیں تین۔

خالہ بی: (شرما کر ہاتھ کھینچتے ہوئے) ہٹ دیوانے۔

عالم: کیوں کیا ہوا۔ آپ شادی کریں تو —— (ہنس کر) اچھا لائیے دیکھنے تو دیجیے۔
(ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

خالہ بی: تو ڈھنگ کی باتیں بتاؤ نا۔

عالم: آپ دیکھنے بھی دیں —— اور پھر آپ کہیں گی "ہٹ دیوانے"

خالہ بی: اے تو پھر —— یہ بھی کوئی بات ہے۔

عالم : اچھا۔ ہوں (غور سے دیکھ کر) ناکامی۔ پہلی محبت میں ناکامی۔
(خالہ بی ایسی نظریں زمین میں گاڑ دیتی ہیں گویا پکڑی گئیں)

عالم : اور ــــ اور ــــ آپ ماریں گی ــــ ورنہ بتا دیتا (ایک دم سے) کیا عمر ہو گی آپ کی؟

خالہ بی : بیالیسواں سال لگا تھا پچھلے رجب۔

عالم : (بنانے کے لئے) ہیں۔ مگر ارے۔ میں آپ کو ہمیشہ تیس برس کا سمجھتا تھا۔ بلکہ اس سے بھی کم ــــ یعنی آپ شمیم کی بڑی بہن معلوم ہوتی ہیں۔ بھئی خدا کی قسم! تعجب!

خالہ بی : سب یہی کہتے ہیں ــــ بکتے ہیں (کچھ دلچسپ باتیں معلوم کرنے کے لئے) اور کچھ۔

عالم : بھئی آپ ماریں گی پھر۔

خالہ بی : کیا ہے ــــ کیا بات ہے؟ کہو تو۔

عالم : شادی ــــ بہت جلد ــــ

خالہ بی : (شرم سے گلابی ہو کر) اونہہ۔ اے ہٹ لڑکے!

عالم : مجھے کیا معلوم! بھئی ہاتھ کہتا ہے۔ دل کا حال کسے معلوم؟ اور خالہ بی ہاتھ جھوٹ نہیں کہتا ــــ ہاں ــــ (زور زور سے ہنستا ہے۔ خالہ بی مسکراتی ہیں) بھئی، خوب ــــ

شمیم : (آکر) خالہ بی! دھوبن میری نیلی شلوار سار ی پھاڑ لائی۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔

خالہ بی : (غیر شاعرانہ موضوع سے چڑ کر) اے تم نے ہی پھٹی ہوئی دی ہو گی۔

عالم : لاؤ تمہارا ہاتھ بھی دیکھ دوں۔ شمیم!

شمیم : نہیں بھئی رہنے دو۔ (خالہ بی سے) بالکل ثابت دی تھی اور اب سارے پائنچے غائب۔

عالم : (اس کا ہاتھ پکڑ کر جو بے خبر باتیں کر رہی ہے) اے ہے بس پیٹ چکیں شلوار کی جان کو۔ ادھر تو سنو۔ ذرا یہ دیکھو ــــ یہ ــــ

شمیم : (ہاتھ کھینچ کر) چھوڑو بھئی۔ بس نہیں دکھاتی۔
خالہ بی: کیا ہرج ہے کوئی کھا جائے گا تمہارا ہاتھ دکھا دونا!
شمیم : (ہاتھ ڈھیلا کر کے) اونہہ ـــــ بھئی مجھے نہیں اچھا لگتا۔ مجھے کام الگ ہے ـــــ
عالم : (غور سے ہاتھ دیکھ کر) غریبی ـــــ پریشانی ـــــ ذلت ـــــ ڈانٹیں۔
شمیم : سب جھوٹ۔ لگے باتیں بنانے۔ سارا جھوٹ۔
عالم : جھوٹ؟۔ ارے یہ دیکھو۔ یہ دن رات کی جوتیاں، میاں کی الگ (ہاتھ کھینچتی ہے) اور سنو۔ جوان موت۔ اُف۔)
شمیم : ہونے دو بھئی۔ چھوڑو (ہاتھ کھینچتی ہے)
عالم : اور ـــــ امتحان میں فیل۔ اور روپے کا نقصان۔ دشمن گھات میں۔
شمیم : تم خود فیل ہو جاؤ خدا کرے۔ ہٹو۔!
عالم : ٹھہرو ابھی ـــــ (ہاتھ بے کار اس قدر موڑتا ہے کہ شمیم رونے پر آجاتی ہے) اور اوـــــ فوـــــہ!
شمیم : ہوں ـــــ جھوٹ۔
عالم : کیا جھوٹ۔ ایک ایک بات ٹھیک۔ اور یہ یہ ـــــ تیرہ غضب خدا کا۔ لعنت اللہ ہے۔ توبہ۔ اللہ!
خالہ بی: کیا تیرہ؟
عالم : اجی بچے ـــــ ایک دم تیرہ۔ خدا۔ ق قسم تیرہ بچے!!
شمیم : (زور سے ہاتھ چھڑا کر) بدتمیز۔ زمانہ بھر کے (اُٹھ کر بڑبڑاتی چلی جاتی ہے)
عالم : ارے ـــــ سنو تو! ـــــ اور تو سنتی جاؤ۔
خالہ بی: بڑی بدمزاج ہو گئی ہے۔
عالم : بڑی صاحب انتہا ہے (اُٹھتا ہے) حد ہے اور آپ ڈانٹتی بھی نہیں اسے (جلنے لگتا ہے)

خالہ بی: کہاں چلے؟

عالم: ذرا کتابیں لینا ہیں۔ شمیم کے کمرے میں بھول گیا تھا اُس دن۔ (چلا جاتا ہے)

(خالہ بی غصّہ اور نفرت سے اُسے جاتا دیکھتی ہیں۔ زور زور سے چھالیہ کترتی ہیں۔ ہلکی سی رقابت اور نفرت کی ملی جلی جھلک سی چہرے پر نظر آتی ہے۔ ڈلی کا ایک بڑا سا ٹکڑا ایک پُرمعنی کھٹاکے سے کاٹتی ہیں، گویا وہ مارا دشمن کو)

تیسرا سین

(اسی خالہ بی والے برآمدے میں خالہ بی پاندان کھولے اُسے چیتھڑوں سے صاف کر رہی ہیں۔ کپڑوں میں خلاف معمول ہلکی سی رنگینی نے ان کے ہلکے گلابی چہرے کو بلا کا دلکش بنا دیا ہے۔ عالم چست پاجامہ اور باریک ململ کا کرتا پہنے ایک صوفے پر ایسے لیٹا ہے کہ اس کے پیر گھٹنے تک نیچے لٹک رہے ہیں۔ واجد شمیم کے گھٹنے پر سر رکھے اُس سے دور لیٹا ہے شمیم کتاب پڑھ رہی ہے)

واجد: خالہ بی مٹر پلاؤ نہیں پکا بہت دن سے۔ کل پکے۔

عالم: مٹر پلاؤ نہیں۔ پائے پکیں۔

واجد: لاحول ولا قوۃ۔ پائے بھی کوئی کھانے کی چیز ہیں اس سے کیچڑ نہ کھالو۔ بھئی شمّو کیا پکے؟ —— پائے یا مٹر پلاؤ!

شمیم: (جلانے کو) کچھ بھی نہ پکے۔ بس اُرد کی دال۔

واجد: ہٹ بدتمیز (اس کی کتاب اپنے سر سے ٹکراتی دیکھ کر) اونہہ۔ اب ہٹاؤ اس کتاب کو (لے کر دور پھینک دیتا ہے)

شمیم: بھئی تم کون ہوتے ہو؟ (اُٹھ کر کتاب لینا چاہتی ہے مگر عالم اُٹھا کر اپنے سر کے نیچے رکھ لیتا ہے) لاؤ میری کتاب دو —— میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں تم لوگوں کے پاس بیٹھنا ہی حماقت ہے۔

عالم: نہیں دیتے —— ہمارے سر میں درد ہے۔

شمیم: (کُشن پھینک کر) لو یہ تکیہ۔

عالم : دیکھا خالہ بی! کیسا زور سے تکیہ مارا ہے۔ ویسے ہی سر میں درد ہے۔

واجد : کیا واقعی درد ہے۔

عالم : (سنجیدگی سے سر سہلا کر) ہاں دھوپ میں جانے سے ہو گیا ہے۔

واجد : (چمکار کر) شمّو جاؤ۔ بام لا کر مل دو اس کے (اُسے منہ بناتے دیکھ کر) کیسی خراب ہو تم۔ اسے میں آپ لا کر مل دوں گا۔ عالم اتنا کام کرتا ہے تمہارا اور تم ذرا سے مرنے لگتی ہو۔ (جاتا ہے)

خالہ بی : ادھر آؤ عالم۔ میں دیکھوں۔

عالم : (پاس آکر لیٹتے ہوئے) یہاں ہے —— کنپٹیوں کے پاس۔

خالہ بی : اے کاہے سے ہو گیا؟

عالم : نہ جانے ——

خالہ بی : (کشن رکھ کر بڑی نرمی سے اس پر عالم کا سر رکھتی ہیں —— اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتی ہیں) ٹھہرو —— ارے ننھی —— او ننھی ——

ننھی : (دُور سے) جی آئی۔

خالہ بی : اے آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ فرید سے کہہ دو کل کے لئے آج ہی پائے لے آئے اور سُنو —— ابھی مصالحہ پیسنا شروع کر دو آتے ہی چڑھا دینا۔ رات بھر پکیں گے سُنا —— اور ذرا سا خمیر چھوڑ دینا (ننھی کی طرف سے مطمئن ہو کر، محبت سے) کچھ مٹھاس بھی پکواؤں۔ تمہیں میٹھے ٹکڑے پسند ہیں —— کیوں عالم؟

عالم : جی ہاں، اور مٹر پلاؤ بھی وجّن کو پسند ہے۔

واجد : (بام لا کر دیتا ہے) لو۔ شمیم ذرا اب مل تو دو۔

خالہ بی : لاؤ میں مل دوں ——

(بام لے کر اس کی پیشانی پر ملتی ہیں۔ بڑے انہماک سے اس کی پیشانی اور کنپٹیوں کو ملتی ہیں۔ شمیم کچھ دیر باؤلوں کی طرح بیٹھی رہتی ہے، پھر اُٹھ کر چل دیتی ہے)

واجد: بس ذرا کپڑے بدل آؤں۔ تم تو چلوگے نہیں، سر میں درد ہے۔ میں ذرا یوسف کے ہمراہ سینما جا رہا ہوں۔ آج غضب کی اچھی پکچر ہے۔

عالم: (آنکھیں بند کئے) ہوں۔ (واجد جاتا ہے۔ عالم آنکھیں بند کئے خاموش لیٹا رہتا ہے)

خالہ بی: (ذرا جھک کر) بخار تو نہیں ؟ (دوسرا ہاتھ اس کی گردن پر رکھ کر دیکھتی ہیں پھر اپنا ماتھا چھوتی ہیں) نہیں بیٹا تو ٹھنڈا پڑا ہے۔ کیسا ہے اب جی ؟

عالم: (ویسے ہی آنکھیں بند کئے) بڑا سکون مل رہا ہے —— آہا —— ہا —— سی —— (آنکھیں بند کئے انگلیوں سے کھیلتا ہے)

(خالہ پیشانی پر سے اُس کے بال ہٹا کر غور سے اُسے دیکھتی ہیں۔ دوسرے ہاتھ سے اس کے گریبان کے کھُلے ہوئے بٹن کو بند کرتی ہیں۔ آنکھیں اور بھی سیاہ اور دلکش ہو جاتی ہیں اور ہونٹ لرزنے لگتے ہیں۔ سر جھک جاتا ہے۔ گرم گرم سانس کو کان کے نیچے محسوس کر کے عالم آنکھیں کھول دیتا ہے۔ خالہ بی کی آنکھیں چار ہوتے ہی گھبرا کر اور آنکھیں پھاڑ دیتا ہے۔ اُن کی آنکھیں نہ جانے کیا کیا کہہ جاتی ہیں —— اور وہ ایک دم ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور نہ معلوم کس غیر انسانی نشے سے ڈر کر چاروں طرف دیکھتا ہے۔ خالہ بی کے چہرے کی سُرخی لہروں کی طرح دم بدم اونچی نیچی ہوتی ہے وہ اس کی طرف دیکھتی ہیں)

عالم: (گھبرا کر پیشانی چھو کر) ارے۔ بالکل غائب۔ سر میں بالکل درد نہیں رہا —— جیسے —— (شرمندہ ہو کر سر جھکا دیتا ہے)

خالہ بی: (ذرا چہرے کی سُرخی کو دبا کر) کہاں چلے ؟ سر کا درد ایسا بھی کیا کہ —— جادو سے اچھا ہو گیا۔

عالم: جی —— جی —— ہاں۔ اب بالکل اچھا ہے۔ گویا کبھی نہ ہوا۔ اُڑ گیا —— دماغ۔ (سر پکڑ کر جانے لگتا ہے)

خالہ بی: بیٹھو —— چائے بنواؤں۔

عالم : (بغیر نظر ملائے) جی نہیں۔ چائے تو اور گرم ہو گی (دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

(شمیم داخل ہوتی ہے)

عالم : (اسے دیکھ کر، ہمت بندھ جاتی ہے) ارے شمیم۔ وجن کہاں ہے؟

شمیم : کمرے میں اپنے اور کہاں! (بے تعلقی سے اپنی چادر اُٹھا کر جانے لگتی ہے، جو بھول گئی تھی)

عالم : (اس کے جانے سے گھبرا کر) سُنو تو، اگر تم میری کتاب پڑھ چکی ہو تو دے دو۔

شمیم : (بالکل دروازے کے پاس سے) اب کل میں تمہارے کمرے پر بھجوا دوں گی، اس وقت تو نہیں۔

عالم : (بچنے کے لئے بالکل اس کے قریب جا کر) مگر دیکھو ——— (شمیم چلی جاتی ہے) سُنو تو۔

خالہ بی : (اُسے جاتا دیکھ کر) عالم!

عالم : (بغیر پورا مُڑے ہوئے) جی

خالہ بی : میں نے باؤں کا کہہ دیا ہے ——— اور خمیری روٹی تمہیں پسند ہے ——— عالم ——— وہ منشی جی کل تک ——— آجائیں گے۔ میرا۔

عالم : کون منشی جی؟ منشی جی!

خالہ بی : ہاں ——— وہ خط ——— تمہاری ——— جیب ———

عالم : (اطمینان کی سانس لے کر) وجن ——— تم ——— میں بھی سینما چلوں گا۔

خالہ بی : ابھی تو سر میں درد تھا ——— اور ابھی سینما کی تیاری ہونے لگی۔

عالم : اب نہیں رہا۔

واجد : کیا کہہ و گے جا کر اور بڑھ جائے گا۔ تم لیٹو۔ اور آج بورڈنگ نہ جاؤ یہیں سو رہو میرے کمرے میں۔ میں کہہ دوں گا مانیٹر سے۔ اچھا۔

عالم : (جلدی سے) نہیں ——— بالکل ٹھیک ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں پکچر ——— چلو۔

واجد: تم جاتو ـــ خالہ بی تین روپے دے دیجئے۔

خالہ بی: (دکھائی سے) میرے پاس کہاں رکھے ہیں اس وقت تین روپے۔

واجد: (ارادہ ڈھیلا ظاہر کرنے کے لئے کوٹ اتارنے لگتا ہے) تو بس پھر ہٹاؤ سینما کو بھی۔

عالم: میرے پاس ہیں (ہیٹ اور شیروانی لے کر) چلو تو ـــ

(دونوں جاتے ہیں۔ عالم اپنے ہاتھ کی لرزش کو ہاتھ ہلا ہلا کر چھپاتا ہے۔ خالہ بی دونوں کو جاتا دیکھتی ہیں۔ بالکل بغیر ارادے کے وہ اپنے ہاتھ میں لکیروں کو گھورنے لگتی ہیں۔ ہلکی امید بھری مسکراہٹ آجاتی ہے)

چوتھا سین

(اپنے کمرے میں شمیم بہت پریشان اور حسبِ معمول بھری بیٹھی ہے۔ کسی نئی بات نے اسے حیرت زدہ بھی بنا دیا ہے جی چاہتا ہے رو دے۔ مگر ضبط کرتی ہے)

شمیم: (خود بخود) ہٹاؤ کہیں کا۔

(کتاب کھول کر ایک مسلا ہوا کاغذ نکالتی ہے اور پڑھ کر غصے سے پھاڑنا چاہتی ہے۔ لیکن دو ٹکڑے کر کے آگے نہیں پھاڑتی۔ واپس رکھ دیتی ہے۔ پھر چند چھوٹے چھوٹے پرزوں کو جوڑ کر پڑھنا چاہتی ہے۔ آہٹ سنائی دیتی ہے۔ تو جلدی سے دری کا کونہ اٹھا کر چھپا دیتی ہے)

(واجد آتا ہے)

واجد: (اگر پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر) شمّو! بیٹے کیا حال چال ہے بڑے موٹے ہوتے جارہے ہو (بسورتی شکل دیکھ کر) رونا، رونا، مدام رونا اور بھی کچھ کام ہے تمہیں؟ اللہ کی بندی! (اسے روتا دیکھ کر) ارے۔ یہ! ہوا کیا (گھبرا کر بیٹھ جاتا ہے) کیا ہوا آخر؟

شمیم: (رو کر) وجن! گھر چلو ـــ آپا کے پاس سنبھل۔ میں نہیں ٹھہر سکتی ایک گھڑی بھی یہاں۔

واجد: کوئی بات بھی ہو۔ کیا خالہ بی نے ڈانٹا؟

شمیم: نہیں (خاموشی)

واجد: پھر ——؟ (پیار سے) بھئی، کوئی بات نہیں ہے۔ ہم تمہارے دوست ہیں —
صرف تیرہ دن تو کالج کھلنے میں رہ گئے ہیں —— اور اب کہتی ہو چلو۔
کیوں آخر؟

شمیم: (دری کا کونہ اُلٹ کر کاغذ کے پُرزے نکال کر) لو۔

واجد: (ٹھیک طرح سے بیٹھ کر کاغذ جوڑ جوڑ کر پڑھنا شروع کرتا ہے۔ اُلجھ کر) کیا پڑھوں —
خالہ بی کا خط ہے۔ کیا تمہیں کچھ لکھ کر ہدایات دی ہیں؟

شمیم: جی نہیں، ذرا پڑھئے تو، پھر کہئے گا۔

واجد: (غور سے دیکھ کر) کیا —— ہاں، عالم —— اور یہ کیا ہے؟ یا بابا ایک تو خالہ بی کا
خط۔ دوسرے پھٹا ہوا (پھر کوشش کرتا ہے) "ٹھوکر —— نہیں۔" "ٹھکرانا مت"
(چکرا کر) یہ کیا گڑبڑ ہے۔ ہیں "اُمیدیں" —— "واسطہ"، "نہیں" "وابستہ" "مایوسی"
"مایوس نہ کرنا" (کچھ دیر خاموشی سے پڑھتا ہے)۔ ہوں۔ زبان۔ زبانی کہنے کا
موقع نہ ملا۔"

شمیم: اور یہ —— (دوسرا ٹکڑا دیتی ہے)

واجد: (پڑھ کر رنگ سیاہ پڑ جاتا ہے۔ کانوں میں خون کی تیزی سے جھنجھناہٹ
ہونے لگتی ہے۔ ڈری ہوئی نظروں سے شمیم کو دیکھتا ہے) مگر —— تعجب!
—— مگر یہ ہے کیا معاملہ؟ —— عالم —— صرف ایک سال بڑا ہے مجھ سے۔
کہاں ملا یہ تمہیں۔؟

شمیم: میرے۔ میرے کمرے میں —— شاید عالم کی جیب سے گر پڑا۔

واجد: (حیرت سے) پاگل! خالہ بی یقیناً —— اور —— مجھے یقین نہیں آتا —— عالم ——
(تھوڑی دیر دونوں خاموش رہتے ہیں، پھر واجد کے چہرے پر بجائے پریشانی کے غصّے
اور نفرت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں —— (وہ اپنے ہونٹ چبانے لگتا ہے)

"کمینہ ـــــ مجھے وہم بھی نہ ہوا تھا۔ شمو، ہم ابھی چلے جائیں گے۔ بلکہ میں ابھی جا کر فون کرتا ہوں حیدر صاحب کو کہ فوراً کار بھیج دیں اپنی ـــــ اچھا!"

شمیم: اور کالج ـــــ؟

واجد: کالج پندرہ کو کھلے گا۔ پھر ہم آجائیں گے اور تم بھی بورڈنگ چلی جانا۔ میں یوسف سے ساتھ رہ لوں گا۔ اچھا (خود بخود) مکار، دوست بنتا ہے اور........ تمہیں کوئی رنج نہیں، کوئی پروا نہیں ـــــ کیوں ـــــ؟

شمیم: (رنجیدہ سر جھکائے غرور سے) نہیں۔

واجد: تو پھر چلو، تیار ہو جاؤ۔

شمیم: اور خالہ بی، اُن سے تو کہہ دو۔

واجد: (غرور سے) ہمیں خالہ بی سے واسطہ؟ ہمیں کوئی ضرورت نہیں اُن سے کہنے کی۔ ٹھیک کر لو تم اپنے تھوڑے سے کپڑے ـــــ میں جا رہا ہوں۔ پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے (جاتا ہے)

(شمیم تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہتی ہے۔ پھر اُٹھ کر الماری میں سے کپڑے نکال کر ایک اٹیچی میں رکھتی ہے۔ دو ایک چیزیں اور کتابیں میز سے اُٹھا کر ڈال لیتی ہے ایک فریم جس میں عالم اور واجد کی تصویر ہے اُٹھا کر رکھنا چاہتی ہے۔ پھر کچھ سوچ کر عالم کی تصویر نکال دیتی ہے اور واجد کی رکھ لیتی ہے۔ پھر کچھ سوچ کر عالم کی تصویر دیکھتی ہے۔ ہچکچاتی ہے۔ مگر پھر بے پروائی سے سب کپڑوں کے نیچے اُسے بھی ڈال لیتی ہے۔ پیروں کی چاپ سُنائی دیتی ہے اور عالم کی آواز دور ہی سے آتی ہے)

عالم: وجی ـــــ وجا ـــــ ن ـــــ کہاں ہو؟ (آتا ہے، شمیم بے تعلقی سے کپڑے رکھتی ہے) ارے شمو دوست ـــــ! وہ کہاں ہے؟ ـــــ وجی! (اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے)

شمیم: (اُس کا ہاتھ کندھے پر سے ہٹا کر) مجھے نہیں معلوم۔

عالم: (اس کی ترش روئی سے متاثر ہو کر) ارے ــــ اور مجھے کہا تھا کہ آج سینما چلیں گے۔ و جن بھی کیا بے وقوف انسان ہے (شمیم کا چہرہ دیکھ کر) ارے بھئی شاباش ہے۔ نہ جانے اتنا غصّہ کہ کے لڑکی جیتی کیسے ہے۔ بس تو دو دن میں مر جاؤں ــــ آہا ــــ ذرا آپ کا منہ ملاحظہ ہو ــــ وا ــــ ہ ــــ واہ (منہ اونچا کرتا ہے اس کا)

شمیم: (اس کا ہاتھ جھٹک کر) اونہہ! (اور میز پر سے سامان لینے چلی جاتی ہے)

عالم: کب تک آئے گا واحد؟ بھلا یہ بھی کوئی انداز ہے ــــ ؟ (کچھ یاد کر کے) ارے ہاں سنو تو شمّو ــــ یہ ذرا ــــ اِدھر دیکھو ــــ (چہرہ پُرمسرت ناچ رہی ہے۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ شمّو ایک نظر دیکھ کر نظر پھیر لیتی ہے) اے دیکھو ــــ بولو ــــ کیا ظاہر ہو رہا ہے کچھ شان ہمارے چہرے پر ــــ!

شمیم: (رُٹھتے ہوتے لہجہ میں) جی ہاں معلوم ہے۔ آج آپ کا چہرہ بڑا شان دار ہو رہا ہے ــــ

عالم: (اس کے بولنے ہی سے خوش ہو کر) رُعب پڑ رہا ہے کچھ۔

شمیم: (طنز سے ہنس کر) آپ کا ہی رُعب ہمارے اُوپر نہ پڑے گا تو پھر کس کا پڑے گا! بھلا آپ .....

عالم: (ہنس کر) اچھا تو تمہیں معلوم ہو گیا؟ وہ ــــ

شمیم: (اُس کی دیدہ دلیری سے مجروح ہو کر) جی ہاں معلوم ہو گیا۔ بس! اور کچھ کہنا ہے ابھی آپ کو؟

عالم: (حیران ہو کر) عجب دیوانی لڑکی ہے۔ ارے بھئی انسان کسی وقت تو سیدھے منہ بات کر لیا کرے کہ بس ہر وقت نخرے؟ میں کہتا ہوں میں تو وہ ــــ خط ــــ

شمیم: (بات کاٹ کر) جی ہاں ــــ وہ خط ــــ (اُٹھ کر جلدی سے کچھ الماری میں سے نکالنے لگتی ہے)

عالم: ارے تو بھونکتی کیوں ہو؟ ــــ تم کیوں جل گئیں۔ جیسے تمہارا میں نے کچھ لے لیا ہو۔

دوسروں کی ترقی سے اس قدر نہ جلا کرو۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ کہتی تو ہوگی نکھٹوؤں کے ایسے ہی بھاگ ہوتے ہیں چھپّر پھاڑ کے۔ خدا کی قسم! انتخاب ہی تو ہے ـــــ لڑ گئی تقدیر (اس کی شعلہ افشاں آنکھوں سے بچ کر) اونہہ نہ جانے اچھی خاصی لڑکی ایک دم سے چڑیلوں کا روپ کیسے دھار لیتی ہے ـــــ؟ مگر تم نے کیسے دیکھا؟ ـــــ شاید یوسف نے واجد کو بتایا ہو ـــــ خط تو میری جیب میں ہی پڑا ہے (ٹٹول کر) شاید بھول آیا کچھ ایسا بلبلایا کہ سیدھا بھاگا کہ تم لوگوں کو بتا دوں۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ تو بتاؤ آج پکا کیا ہے؟

شمیم: (جس کے آنسو باوجود ضبط کے نہیں رُکتے۔ غصہ سے کانپ جاتی ہے) نکل جاؤ ـــــ نکل جاؤ میرے گھر سے۔ بڑے۔ بڑے آئے۔ دوست بنتے ہیں ـــــ جاؤ ـــــ خدارا چلے جاؤ ـــــ

عالم: (اس کو واقعی غصے دیکھ کر) شمّو!

شمیم: ابھی کچھ اور کہنا ہے ـــــ جاؤ یہاں سے خدا کے لئے۔

(واجد داخل ہوتا ہے)

عالم: (اُسے دیکھ کر زور سے قہقہہ لگا کر) یار وجّی پاگل ہوئی ہے یہ ـــــ آج ـــــ ارے دیکھتے ہو اس بلّی کو خدا کی قسم!

واجد: (اپنے پیارے دوست کی جعل سازی سے مُنہ اُترا ہوا ہے۔ نفرت سے) شمّو! تیار ہو تم ـــــ!

عالم: یہ ـــــ کیا کہیں جا رہے ہو تم لوگ؟ ـــــ آخر ـــــ بتاؤ بھی تو کچھ۔

واجد: (کچھ نہ سُن کر شمیم سے) وہ ـــــ وہ کار آتی ہی ہوگی۔

عالم: واجد اچھے کھو گئے بھی یا تم ـــــ!

واجد: (غصہ کو ضبط کر کے) میں کچھ نہیں کہنا چاہتا ـــــ بس تھوڑا سا سامان لے لو شمیم!

عالم: لیکن واجد تمہیں یہ ہو کیا گیا ہے۔ کچھ ـــــ!

واجد: مجھے؟ ـــــ جی مجھے سودا ہو گیا ہے (شمیم سے) وُہ سُوٹ کیس، بس اور ـــــ

عالم: (اس کے غصّہ سے بوکھلا کر) مگر —— میں وہ —— خط لایا تھا کہ —— وہ —— یہ کہنا تھا کہ ——

واجد: کیا ابھی تمہیں کچھ اور کہنا ہے ہاں وہ خط —— پھر ؟

عالم: (مُردہ ہو کر) مگر تم —— تم، اتنے غصّہ ہونے کی وجہ ؟ ایسے گویا ——

واجد: (چوٹ سے تلملا کر) بے شک ہم کیوں غصّہ ہوں ، ہمیں کیا حق ؟ ہم ہوتے کون ہیں ؟ اور (رنجیدہ قہقہہ لگاتا ہے) واقعی ! (ایک دم سنجیدہ ہو کر) ہمیں کیوں ؟ —— (بے تکے پن سے ہنستا ہے) کیا وجہ ؟ آہا ——

عالم: (جس کی سمجھ میں نہیں آتا کیا کرے) مگر —— یہ کیا کہہ رہے ہو تم ؟ تم نے کب دیکھا —— تم ——

واجد: ہاں - ہم نے دیکھا —— اور وہ خوشخبری بھی مل گئی ہمیں اور اسی وجہ سے ہم لوگ اس وقت اس قدر مسرور نظر آرہے ہیں (طعن سے) اور ہاں آپ کو مبارکباد تو دینا بھول ہی گئے -

عالم: (اپنے رُو ٹھنے کی باری سمجھ کر) مجھے نہیں چاہیئے تمہاری مبارکباد - لے کے پہلے تو ——

واجد: بے شک - بے شک (کار کی آواز سُن کر) اُٹھو شمّو !

عالم: مگر -

(واجد اپیچی اٹھا کر شمیم کی کمر میں پیار سے ہاتھ ڈال کر اُسے لے جاتا ہے) عالم عجیب پریشانی کے عالم میں ڈھیلا ڈھالا کھڑا رہ جاتا ہے گویا کسی نے اُسے کچل دیا ہو - پیشانی پر ہاتھ پھیرتا ہے - گویا یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ خواب ہے یا بیداری - کار کی آواز پر گھبرا کر چونکتا ہے - مگر دُور اس کا ہارن سُن کر بے ست ہو کر کرسی پر گر جاتا ہے - سر پر دونوں ہاتھ رکھ کر سوچتا ہے کہ اتنے میں اُسے پھٹے ہوئے پُرزے نظر آتے ہیں - پہلے بے پروائی سے پھر آنکھیں جھپکا کر غور سے دیکھتا ہے - انہیں جوڑ کر پڑھتا ہے تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں)

عالم: ارے —— او —— رے —— یہ —— مگر ——

(پھر دیکھتا ہے۔ سب حقیقت سمجھ جاتا ہے۔ جلد جلد جیبیں ٹٹول کر ایک خط نکالتا ہے۔ تھوڑی دیر خوفناک نظروں سے خلا میں گھورتا ہے۔ پھر مٹھیاں بھینچ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور خالہ بی خراماں خراماں خوش رنگ لباس میں داخل ہوتی ہیں)

خالہ بی: (بالکل بدلی ہوئی آواز میں کہ چوبیس برس کی خالہ بی معلوم ہوتی ہیں) تم سیدھے ادھر چلے آئے ہیں ....

(عالم جیسے مسحور ہے، دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے)

خالہ بی: (اس کی پریشانی سے نہ گھبرا کر) میں نے منشی جی کو بلا لیا ہے وہ کل آجائیں گے اور سب طے ہو جائے گا۔ بہتر ہے کہ ہبہ ہو۔

عالم: (بے وقوفوں کی طرح) ہبہ؟......

خالہ بی: ہاں۔ اور بنک میں شاید پینسٹھ ہزار رہ گیا ہے ـــ باقی کے حصے خرید لئے تھے۔ کاغذات سب میرے صندوقچے میں ہیں (نیچی نظر کئے ہوئے) اور مکانات بھی

عالم: (بدحواسی سے) اوں۔ خط (پھٹے ہوئے خط کو ٹٹول کر) یہ ـــ یہ یہ ـــ (خود اپنے ہاتھ کا خط دیکھ کر) یہ ـــ اور میں ـــ یہ ـــ

خالہ بی: (بڑے پیار سے) ہاں ـــ ہاں یہ کیسا خط ہے؟

عالم: (جواب بھی کھویا ہوا ہے) یہ خط ـــ میرا ہے ـــ تقرر ہو گیا میرا ـــ اور (گھبرا کر اجڑے ہوئے کمرے کو دیکھ کر) اور ـــ

خالہ بی: (خوشی سے) کہاں ہوا تقرر ـــ دہلی ہی میں ـــ یا کانپور؟

عالم: (کچھ نہ سن کر جیسے کسی غائب ہستی سے) وہ ـــ میں خود ہو جاتا ـــ پاگل ـــ واجد (سانس بھر کر) شمو!

خالہ بی: (اس کے قریب آکر) عالم!

عالم: (ان کی عجیب آواز سے چونک کر) خالہ بی!

خالہ بی: (نا امید نہ ہونے کی کوشش کر کے) عالم! میں تمہاری خوشی......"

عالم : (جلدی سے) خالہ بی!

خالہ بی : (کانپتی ہوئی آواز میں) عالم —— تمہیں تم ——

عالم : (بات کاٹ کر جلدی سے) خالہ بی —— خالہ بی۔

خالہ بی : (پژمردہ ہو کر گردن جھک جاتی ہے) عا —— آلم ——

(عالم بغیر کچھ کہے سُنے جلد جلد خط جیب میں رکھتے ہوئے تیزی سے نکل جاتا ہے۔ خالہ بی کچھ دیر حیرت سے اُسے جاتا دیکھتی ہیں۔ اس کے جاتے ہوئے پیروں کی آواز کو ایک نغمے کی طرح کان لگا کر سُنتی ہیں۔ ذرا دیر میں اُن کی نظر اس کی ٹوپی پر پڑتی ہے جو وہ گھبراہٹ میں بھول گیا عجیب انداز میں بڑھ کر اُسے اٹھا لیتی ہیں۔ ایک متبرک اور نازک مجسّمے کی طرح اُسے دیکھتی ہیں۔ اُن کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پھیکی ہو کر بند ہونا شروع ہوتی ہیں اور بڑے بڑے بے رونق آنسو رخساروں پر ڈھلک آتے ہیں۔ گردن ذرا پیچھے گر جاتی ہے اور وہ ٹوپی کو آہستہ سے سہلاتی ہیں جیسے دل شکستہ ماں اپنے بے جان بچے کو ٹٹولتی ہے۔ وہ قدموں کی چاپ بھی نہیں سُنتیں۔ دروازے میں عالم نظر آتا ہے وہ شاید ٹوپی لینے آیا تھا جسے بھول گیا تھا تھوڑی دیر غیر فیصلہ کن انداز میں کھویا ہوا سا کھڑا رہتا ہے —— اور —— پھر)

(سٹیج ٹوٹ جاتی ہے)

جوانی

جب لو ہے کے چنے چب چکے تو خدا خدا کر کے جوانی بخار کی طرح چڑھنی شروع ہوئی... رگ رگ سے بہتی آگ کا دریا اُمنڈ پڑا۔ اٹھلا چال۔ نشہ میں غرق۔ شباب میں مست۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ کلی پاجامے اتنے چھوٹے ہو گئے کہ بالشت بالشت بھر نیفہ ڈالنے پر بھی اُٹنگے ہی رہے۔ خیر اس کا تو ایک بہترین علاج ہے کہ کندھے ذرا آگے ڈھلکا کر ذرا سا گھٹنوں میں جھول دے دیا جائے ہاں ذرا چال کنگاروسے ملنے لگے گی۔

بال ہیں کہ قابو ہی میں نہیں۔ لٹیں پھسلی پڑتی ہیں۔ بال ہیے جاتے اور مانگ ؟ مانگ تو غائب۔ اگر اماں آٹھویں روز کڑوا تیل چھوڑ کر مینڈھیاں نہ باندھیں تو زندگی اجیرن ہو جائے۔ گو منہ بے کنگوروں کے طباق کی طرح منڈا مُنڈا لگنے لگتا ہے، پر بالوں سے تو جان چھُٹ جاتی ہے۔ جیسے کسی نے سر گھونٹ کے بالوں کے وبال ہی سے نجات دلا دی۔ نہ جانے یہ میمیں پڑے چھوٹے بال گدّی پر چھوڑ کے کیسے جیتی ہیں اور پاؤں ؟ پاؤں تو جیسے پھاوڑا کیا جلدی بڑھ رہا ہے! اگر اسی رفتار سے بڑھا تو سِل برابر ہو جائے گا۔ انگوٹھا جیسے کچھوے کا سر۔

اور بھی تھیں بہت سی باتیں جو اکیلے میں بیٹھ کر جنّو کو سُتاتیں۔ آئینہ میں ناک دیکھ کے تو بس قے آنے لگتی۔ یہ ڈبل نگوڑا جیسے کھونٹا۔ ننجو کی شادی ہوئی تو یہ بڑی سی نتھنی پہنی تھی اس نے۔ کیا بڑی سی ناک ہے۔ گڑیا جیسی اور جنّو کے کھونٹے پر تو نتھنی بھی شرما جائے گی۔ جب اس کی شادی ہو گی تو؟

" بجلی گرے ایسی ناک پر " اس نے سوچا۔

اس پر شبراتی بھیّا آئے تھے۔ کیسے غور سے اس کا مُنہ تک رہے تھے۔ بھلا انھوں نے

کاہے کو ایسی ناک کہیں دیکھی ہو گی۔ جنو نے جلدی سے کچھ پونچھنے کے بہانے ناک اوڑھنی سے چھپالی۔ شبراتی بھیا جھینپ گئے۔ سمجھے ہوں گے بگڑ جائے گی۔

اے کاش وہ سلوچنا ہوتی، یا مادھوری یا کجن سہی! اللہ میاں کا اس میں کیا جاتا۔ کچھ ٹوٹا تو آنہ جاتا ان کے خزانے میں۔ اگر ذرا وہ گوری ہی ہوتی اور کام چور کاریگر ذرا دھیان سے اُسے ڈھنگ کا بنا تے تو کیا ہاتھ سڑ جاتے اُن کے؟

وہ آنکھیں بند کر کے بہت سے فرشتوں کو کھٹا کھٹ انسانی پیکر گڑھتے دیکھتی کاش وہ گڑھی جا رہی تھی تو فرشتے کی بغل میں پھوڑا نہ نکلا ہوتا۔ باپو کے جب پھوڑا نکلا تھا۔ تو ڈیڑھ مہینے کی کھاٹ گوڑی تھی اور کھرپیا تک نہ ہلائی تھی۔

اس کا خیال ماں کی طرف بھٹک گیا۔ کھپریل میں نہ جانے دن میں کے گھنٹے اینڈتی۔ پچھلے چند مہینے سے اس کا پیٹ نہایت خوفناک چال سے بڑھ رہا تھا وہ خوب جانتی تھی کہ یہ پھولنا خالی از علت نہیں۔ جب کبھی ماں پہ یہ وبال چھاتا ہے ایک آدھ بہن یا بھائی رات بھر ریں ریں کرنے اور اس کے کوٹھے پر رونے کو آن موجود ہوتا ہے۔

مکھیاں، بس دوپہر کو ستاتی ہیں۔ اس کان سے اُڑا دو دوسرے پر آن مریں۔ وہاں سے اُڑیں تو ناک میں تنتنائیں۔ وہاں سے نوچا تو آنکھ کے کوئے میں گھس جاتی ہیں۔ دو گھڑی بھی نہ ہوئی ہو گی، کہ دوپٹے کے چھید میں سے یلغار بول دیا اور اوپر سے مال ٹرکرائی۔

"موت پڑے تیرے سونے پر، اٹھ، شبراتی کو روٹی دے۔"

گردن پر سے میل کی بتیاں چھٹاتی چھینکے کی طرف چلی باہر چھپر پر شبراتی بھیا لال چارخانے کا انگوچھا پھینچ رہے تھے۔ چھپا چھپ سے میلی میلی بوندیں اُچھل کر ان کی ادھ کچی آنکھوں اور اُلجھے ہوئے بالوں پر پڑ رہی تھیں۔ وہ روٹی رکھ کے پاس ہی گھٹنے پر ٹھوڑی رکھ کے غور سے اُنہیں دیکھتی رہی۔۔۔۔۔۔ اُن کے سینے پر کتنے بال تھے۔ گھنے ہوئے پسینے میں ڈوبے "جی نہ گھبراتا ہو گا۔" وہ سوچنے لگی "کیسی کھجلی پڑتی ہو گی۔" ان کے کسے ہوئے ڈنڈوں اور رانوں کی مچھلیاں ہر چھپا کے کے ساتھ اُچھلتی تھیں۔

شبراتی بھیا انگوچھا ٹٹی پر پھیلا کر روٹی کے بڑے بڑے نوالے ساگ کی کمی کا گلہ کرتے ہوئے نگلنے لگے۔

"پاڑی" انہوں نے سوکھی روٹی کے مچیط نوالے کو گلے میں مکڑتے ہوئے کہا اور جنّو نے گھبرا کر انہیں کٹوری پکڑا دی۔

"جلدی سے کھا لو۔ کٹوری مانجھ کے یہیں دھر دینا۔ ہمیں کٹّی کرنے کو پڑی ہے" وہ غرور سے احکام صادر کرتی اٹھی۔

"ہم کر دیں گے کٹّی" شبراتی روٹی کے کنارے کھاتے ہوئے بولا۔

"تم کھیت جاؤ گے" وہ چلنے لگی۔

"کھیت بھی جائیں گے" وہ غرور سے ایک ڈکار لے کر بولا۔

"اوہنک رہنے دو۔" وہ چلی۔

"کہتے ہیں تجھ سے کٹّی نہیں ہوگی۔ ویسے ہی کوئی چوٹ چپیٹ آ جائے گی۔" شبراتی نے پیار سے ڈانٹا۔

شبراتی کو کیا، اُن کے آنے سے پہلے وہ کُٹّی کیا کرتی تھی کہ نہیں۔ ایسی بھی کیا چوٹ چپیٹ۔ چھپّر میں جا کر اس نے روپا اور چندن کو پیار سے دو چار گھونسے لگائے اور انہیں کونے میں چپ چاپ کھڑے رہنے کی تاکید کر کے خود کُٹّی کے گٹھے کو بکھیر کر گڈیاں بنانے لگی...

"جھیپ ہٹو، ہم کُٹّی کر دیں۔" شبراتی نے پھر ڈکار لے کر چنے کے ساگ کا مزہ لینا شروع کیا۔

وہ اترا کر گنڈاسہ سنبھال کر بیٹھ گئی۔ گویا اُس نے سنا ہی نہیں۔

"تجھ سے ایک دفعہ کہو تو سُنتی ہی نہیں ـــــ لا اِدھر گنڈاسہ۔" وہ گنڈاسہ چھیلنے لگی۔

"نہیں" وہ ہنسنے لگی۔ اور کُٹّی شروع کر دی۔

"تو بیواب۔" وہ اپنی پھکنی جیسی موٹی موٹی اُنگلیاں گنڈاسے کے نیچے بچھا کر بولے۔

"بیواب کر دُکُٹّی ـــــ مار دیو۔"

"ہٹاؤ ـــــ کہ ہم سچّی مار دیں ـــــ" وہ گنڈاسہ تان کر بولی جیسے سچ مچ مار ہی تو دیتی۔

"مار ـــــ تیرے کلیجہ میں بُوتا ہو تو مار دیکھ۔"

اور جو وہ مار ہی دیتی پھر پھر ساری اُنگلیاں پس جاتیں۔ یہ کیا بات تھی، کوئی زبردستی تھی اُن کی۔

"اب مارتی کیوں نہیں!" شبراتی بھیانے آنکھیں جھپکائیں ـــــ اور اُن کا مونچھوں والا موٹا سا ہونٹ دور تک پھیل گیا۔ گنڈاسہ چھین لیا گیا ـــــ اور جنّو کھسیا گئی۔ نہ جانے اس کے سخت اور کھُردرے ہاتھوں کو اس وقت کیا ہو گیا...... کس قدر چھوٹے اور نرم معلوم دینے لگے۔

اُسے معلوم ہو گیا کہ سینے پر پسینے میں ڈوبے ہوئے گھنے بالوں سے جی کیوں نہیں گھبراتا اور چکنی جیسی اُنگلیاں کیسی پھُرتیلی ہوتی ہیں۔

جنّو کا بس چلتا تو وہ ان کے بھوکے کتّوں کو اپنی بوٹیاں بھی کھلا دیتی۔ مگر کتنا کھاتے تھے اس کے ذرا ذرا سے بہن بھائی۔ وہ موٹی روٹی خواہ کتنی ہی جلی اور ادھ کچری کیوں نہ ہو چٹکیوں میں ہضم کر جاتے۔ کیا ایسا بھی کوئی دن ہو گا جب اُسے روٹی نہ تھوپنی پڑے...... رات بھر ماں اٹا پیستی اور اس بھدی عورت سے ہو ہی کیا سکتا ہے۔ سال میں تین سو پینسٹھ دن میں کسی نہ کسی بچے کو پیٹ میں لئے کوٹھے پر لادے یا دودھ پلاتے گزُارتی......

ماں کیا تھی ایک خزانہ تھی جو کم ہی نہ ہوتا تھا۔ کتنے ہی کیڑے اس نے نالیوں میں کشتی لڑنے اور غلاظت پھیلانے کے لئے تیار کر لئے تھے۔ پر ویسی ہی ڈھیر کا ڈھیر رکھی تھی۔

آخر وہ دن بھی آ گیا۔ جب کہ رات کے ٹھیک بارہ بجے ماں نے بھینس کی طرح ڈکرانا شروع کیا۔ محلہ کی کل معزز بیویاں ٹھیکرے اور ہانڈیوں میں بدبو دار چیزیں لے کر اِدھر سے اُدھر دوڑنے لگیں۔ موٹی دوہر کو چھڑے کی رسی کی مدد سے کھپرل کے کونے میں تان کر ماں لٹا دی گئی۔ بچوں نے منمنانا شروع کیا اور آنے والے سے بڑا بچہ بچھاڑیں کھا کر گرنے لگا۔

باپو نے سب کو عجیب عجیب رشتہ قائم کرنے کی دھمکی دے کر کونے میں ٹھونس دیا اور خود ماں کو نہایت پیچ دار گالیاں دینے لگا۔ جن کا مفہوم جنو کسی طرح نہ سمجھ سکی۔ شبراتی بھیا دو ایک گالیاں جوئی وغیرہ کو دے کر بھینسوں والے چھپر میں جا پڑے۔ پر جنو ماں کی چنگھاڑیں سنتی رہی۔ اس کا کلیجہ ہلا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کوئی ماں کو کاٹے ڈال رہا ہے۔ عورتیں نہ جانے اس پردے کے پیچھے اس کے سنگ کیا بے جا حرکت کر رہی تھیں۔ جنو کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے ماں کا سارا دکھ وہی اٹھا رہی ہے۔ گویا وہی چیخ رہی ہے اور ایک نامعلوم دکھ کی تھکن سے وہ واقعی رونے لگی۔

صبح کو وہ ایک سرخ گوشت کے لوتھڑے کو گودڑ میں رکھا دیکھ کر قطعی فیصلہ نہ کر سکی۔ کہ اس مصیبت اور دکھ کا معقول صلہ ہے یا نہیں جو ماں نے گزشتہ شب جھیلا تھا۔ پتہ نہیں ماں نے دوسری غلاظت کے ساتھ ساتھ اسے چیلوں کے کھانے کے لئے کوڑے کے ڈھیر پر رکھنے کے بجائے اپنے کلیجے سے کیوں لگا رکھا تھا۔

جاڑوں میں بھینسوں کے گوبر کی سڑاند بھی کچھی ساتی کی بوئے درمیان پھٹے ہوئے گودڑ میں اس سرے سے اس سرے تک جو ہی جیو لیٹ جاتے۔ پھٹی ہوئی روئی کے گٹھل اور پرانی بوریاں جسم کے قریب گھسیٹ کر ایک دوسرے میں گھسنا شروع کر دیتے تاکہ کچھ تو سردی دبے۔ اس بے سروسامانی میں بھی کیا مجال جو بچے نچلے بیٹھیں۔ رستولن ہنگو اکی ٹانگ گھسیٹتی اور نتھو موتی کے کوٹھے میں کاٹ کھاتا اور کچھ نہیں تو شبراتی ہی گھسیٹ کر اتنی گدگدی کرتا کہ سانس پھول جاتی وہ تو جب ماں گالیاں دیتی تب ذرا سوتے۔ رات کو وہ افراتفری پڑتی کہ کسی کا سر تو کسی کا پیر۔ کسی کو اپنے جسم کا ہوش نہ رہتا۔ پیر کہیں تو سر کہیں۔ بعض وقت اپنا جسم پہچاننا دشوار ہو جاتا۔ رات کو کسی کی لات یا گھونسے سے چوٹ کھا کر یا ویسے ہی اتنے جسموں کی بدبو سے اکتا کر اگر کوئی بچہ چوں بھی کرتا تو ماں بھڈائن کی طرح آنکھیں نکال کر چھینتی اور فریادی بسور کر رہ جاتا اور جنو تو سب سے بڑی تھی۔

مگر جنو کو خوب معلوم ہو گیا کہ سینے پر کتنے ہی بال ہوں اور بغل میں سے کیسی ہی سڑاند آتے جی بالکل نہیں گھبراتا۔ موری کا کیڑا کیچڑ میں کیا مزے سے لوٹتا ہے اور اس میں بات ہی

ایسی کیا تھی۔

جب دوپہر کو ماں بچے کو جنّو کو دے کر دائی سے پیٹ ملوانے کوٹھڑی میں چلی جاتی یا اپنی سہیلیوں سے کوئی نہایت ہی پوشیدہ بات کرتی ہوتی تو وہ بھیّا کو گود میں لٹا کر جلتے کیا سوچا کرتی وہ اس کا چھوٹا سا مُنہ چومتی۔ مگر اس کا جی متلانے لگتا۔ پلپلا پلپلا۔ سڑے ہوئے دودھ کی بُو۔ وہ سوچنے لگتی کہ کب وہ چھ فٹ اونچا چوڑے بازوؤں والا جوان بن چکے گا.....

اور پھر وہ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھوں اور پھکنی جیسی موٹی موٹی اُنگلیوں کا تصوّر کرتی۔ اسے یقین نہ آتا کہ کبھی یہی خمیری گلگلا لکڑی کا کھمبہ بن جائے گا۔

کنوئیں پر نہاتے ہوئے نیم برہنہ غنڈوں کو دیکھ کر وہ اپنے اَدھ مرے بھائیوں پر ترس کھانے لگتی۔ کاش یہی بڑھ جائیں۔ اتنا کھاتے ہیں پھر کچریا سا پیٹ پھول جاتا ہے۔ اور وہ بھی صبح کو خالی۔

محرم پر شبراتی بھیّا اپنے گھر چلے گئے۔ رات کو بچے پہلی ہی دھتکار میں سو جاتے پر جنّو پڑی پڑی جاگا کرتی..... وہ سرک سرک کے کسی بچے سے بے اختیار ہو کر لپٹ جاتی۔

"شبراتی بھیّا کب تک آئیں گے اماں؟" اس نے ایک دن پوچھا ماں سے۔

"بیساکھ میں اس کا بیاہ ہے۔ اب وہ سسرال ہی رہے گا،" ماں گیہوں پھٹکتے ہوئے بولی۔

"ارے"

اُسے کس قدر حیرت ہوئی۔ گھسیٹے چاچا کے بیاہ میں بس کیا بتایا جائے کیا مزہ آیا تھا۔ رات رات بھر بس گانا اور ڈھول۔ سُرخ لوٹوں کی دوپٹیا وہ کس شان سے آٹھ دن تک اوڑھے پھری تھی۔ جبھی تو شبراتی بھیّا نے اس کے کیا زور سے چٹکی بھر لی تھی۔ وہ گھنٹوں روئی تھی وہ پھر سوچنے لگی کہ بیاہ میں وہ کونسا کرتا پہنے گی۔ لال اوڑھنی تو ویسی دھری تھی، پھر بیاہ تو ابھی دور تھا۔

پر نہ جانے اُسے کیا ہو گیا تھا۔ ویسے تو کچھ نہیں۔ پر جی تھا کہ ٹوٹا جاتا تھا اگر چھوارے ملی کا پیڑا نہ ہوتا تو وہ پھر بھوکی ہی مر جاتی۔ کیسا جی بھاری بھاری رہتا..... ماں اس کے

جھونٹے پکڑ پکڑ کر ہلاتی۔ پر ہر وقت نیند تھی کہ سوار رہتی۔ ۔ ۔ پانی بھرتے میں اُسے کئی دفعہ چکر آگیا اور ایک دفعہ تو وہ گر ہی پڑی دہلیز پہ۔

"ناجو کی کمر لچک جاتی ہے" ماں نے دوہتڑ مار کر کہا۔

اور اپنا پیلا چہرہ دیکھ کر تو وہ خود ڈر جاتی۔ وہ یقیناً مرنے والی ہو رہی تھی۔ کبڑی بڑھیا مری تھی تو کئی دن پہلے دھڑام سے موری میں گری اور بس گھسٹا ہی کرتی تھی۔

"اری یہ تجھے ہو کیا گیا ہے رانڈ؟" ماں نے اُسے پژمردہ دیکھ کر پوچھ ہی لیا۔ اور وہ اُسے بے طرح ٹٹولنے لگی۔ جنّو کے پیٹ بہت گدگدی ہوئی۔

"حرام زادی! یہ کس کا ہے؟" اُس نے اس کی چوٹی اینٹھ کر کہا۔

"کیا؟" جنّو نے ڈر کر پوچھا۔

"ارے ۔ ۔ ۔ یہی —— تیرے کرتوت —— بچہ بنتی جاتی ہے —— مُردار، حرام خور" اُس نے جنّو کو اتنا مارا کہ ڈھائی سیر گھی پھلنکے پر بھی نہ مارا ہوگا اور خود اپنا سر کوٹ ڈالا۔

"اری مُرغے خور بتا تو آخر کچھ!" وہ تھک کر جنّو کو پھر پیٹنے لگی۔

اور پھر اس نے نہ جانے کیا کیا پوچھ ڈالا۔ وہاں تھا ہی کیا۔

رات کو اُس نے اپنے باپ کی گالیاں اور مار ڈالنے کی دھمکی سُن کر زور سے گھٹنے پیٹ میں اڑا لیے اور کھاٹ پر اوندھی ہو گئی۔ ۔ ۔ پر اُسے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ ساتھ ساتھ شراتی بھیا کو کیوں گنڈاسہ سے کاٹ ڈالنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ بیساکھ میں تو ان کا بیاہ ہونے والا تھا۔ جس میں وہ سُرخ دوپٹہ اوڑھ کر ۔ ۔ ۔ اس کا گلا بھر آیا۔

ڈائن

حامد نے جو قمیص صندوق سے نکالی، اُس کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ کسی میں آدھا بٹن لٹک رہا تھا کسی میں پون، اور باقی ایک سرے سے غائب۔ جی جل کر خاک ہوگیا۔ بے اختیار جی چاہا کہ جاکر دھوبن کے کس کس کے ٹھوکریں مارے کہ بس یاد ہی کرے۔ مگر کلب کا وقت قریب تھا۔ دوسرے صرف دھوبن کو ٹھونکنے کے لئے اس کے گھر اتنی دور جانا محض حماقت تھی سامنے اُس کی تندرست بیوی رضیہ سونے کے لئے تیار پلنگ پر چڑھی لیٹی تھی۔ اُس نے سوچا، لاؤ خود ہی ٹانک لوں۔ یہ بس دو ہی تو بٹن ہیں۔ گریبان میں، اور —— ایک کف میں۔ مگر ارے اپنے پر سے بھی تو ذرا مسک گیا تھا کپڑا۔ آخر حق شوہر بھی کوئی چیز ہے۔ کیوں نہ رضیہ ہی کو تکلیف دی جائے لہٰذا اُس نے پکارا:

"رضیہ —— اے رضیہ —— ذرا اٹھو تو،"

"کیا ہے بھئی!" رضیہ ٹھنک کر بولی۔

"ارے بھئی ذرا —— یہ دیکھو دھوبن چڑیل سارے بٹن توڑ لائی۔ یعنی یہ بھی کوئی بات ہے کہ ایک بٹن بھی نہیں چھوڑتی۔ اُٹھو ذرا بٹن لگا دو اور ہاں یہ تیرے کے پاس سے ذرا سی اُدھڑ گئی ہے، یہ بھی سی دو۔"

"اچھا، ابھی سیئے دیتی ہوں۔" رضیہ نے کروٹ بدل کر پھر سونے کے لئے کنڈلی مار لی۔

"تو پھر اُٹھو نا۔ بھئی مجھے کلب جانا ہے،" وہ اُس کا کندھا ہلانے لگا۔

"اماں جان سے کہیئے نا۔ وہ سی دیں گی۔ اب اس وقت میرے پاس سوئی دھاگا بھی تو

نہیں۔۔“ یہ کہہ کر وہ گھونسوں سے بچنے کے لئے دوپٹے میں چھُپ گئی۔

اماں جان کا نام سُن کر حامد کا منہ اتنا سا نکل آیا۔ بھلا یہ بھی کوئی انصاف ہے۔ دنیا جہان کی بیویاں اپنے میاؤں کے قمیصوں میں بٹن ٹانکتی ہیں۔ آخر رضیہ کونسی نرالی ہے جو دو بٹن بھی نہ ٹانک سکے۔ آخر ہر کام کے لئے وہ اماں جان سے کیوں کہے۔ آخر بیوی رکھنے کا پھر فائدہ ہی کیا، جب کہ ہر کام اماں جان وقت سے پہلے ہی کر کے رکھ دیتی ہیں اور جو ذرا سا کام کرنے کو کہو رضیہ پر سستی سوار ہو جاتی ہے۔ وہ ذرا منہ پھُلا کر بولا۔ ”نہیں، ہر کام بس اماں جان سے کرالو۔ آخر کیوں“ اور جو تم کر دوگی تو کیا ہو جائے گا؟“

”اب میں ذرا سو رہی ہوں۔“ وہ پیار سے بولی۔

حامد جانتا تھا کہ جب رضیہ سستی کرنے لگے تو بس اس کا ایک علاج ہے اور وہ یہ کہ گدگدیاں —— فوراً نیند وینڈ بھاگ جاتی تھی۔ چنانچہ اس نے قمیص کو تو کرسی پر ڈالا اور —— بس۔

”اُٹھو —— اُٹھو —— بس پھر اُٹھو —— “

”رضیہ ہنسی سے بیتاب ہو کر لوٹ گئی۔

”اچھا —— ہی —— ہی —— آہ —— اچھا تو چھوڑیئے تو۔“ وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپ کر بولی۔

”چھوڑیئے نہیں —— بس سیدھی طرح اُٹھو۔“ وہ بھی ہنستے ہوئے بولا۔

”اماں جان برآمدے میں عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ بٹنوں کا قصہ سُن کر وہ جلدی جلدی سلام پھیر، چپٹی سلیم شاہی جوتی پیروں ہی سے گھسیٹتی ہوئی لپک کر آئیں۔ نماز کے بعد دُعا کے بول اب تک اُن کے ہونٹوں پر منڈلا رہے تھے اور دوپٹہ ڈھاٹے کی طرح ٹھوڑی پر کسا ہوا تھا۔

”لاؤ بیٹا میں ٹانک دوں بٹن —— میں نے تو اس سے کئی دفعہ کہا کہ بیٹی جیسے ہی دھوبن کپڑے لایا کرے مجھے دے دیا کر۔ ٹک ٹک سے درست کر کے رکھ دیا کروں مگر بھول جاتی ہے۔ لاؤ کہاں ہے قمیص؟“

حامد کھسیانا ہوگیا۔ بولا "رہنے دیجئے ـــ آپ کیوں تکلیف کریں۔ آخر رضیہ جو ـــ"

"او ئی بچے اس میں تکلیف کاہے کی ـــ اب میں ہی جو ٹانک دوں گی تو کیا موئے ہاتھ گھس جائیں گے میرے ؟ اور بٹیا۔ میری تو دعا ہی ہے۔ تمہارے سسرے کو اللہ بخشے کبھی شکایت نہ ہوئی۔ جیسے ہی دھوبن آئی بس میں جھٹ کپڑے لیتے لے کر بیٹھ جاتی۔ اور سب ٹھیک ٹھاک کر پیوند پارے سے درست کر ان کے بکس میں رکھ دیتی ـــ یہ رضیہ۔ بھئی ابھی کم سن ہے نا"

بس حامد کے پیروں سے آگ لگی تو سر پر ہی جاکر شاید بجھی ہو۔ کلس کر رہ گیا۔ رضیہ کو کم سن سمجھنے میں نہ جانے بڑی بی کو کیا مزہ آتا تھا۔ اپنے چار برس کے نواسے کو تو وہ نظرانداز ہی کر جایا کرتی تھیں۔ خیر حامد تو منہ لٹکائے نہانے چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس نے دور ہی سے پکارا ـــ رضیہ ہی کو پکارا۔

"رضو ! ـــ بٹن ٹانک دیے ـــ لاؤ قمیص ـــ !"

"ہاں بٹیا۔ لو ـــ رضیہ ذرا غسل خانے گئی ہے۔ اور کوئی کپڑا ہو تو دیدو۔ ٹھیک کر دوں"

حامد نہ جانے کیوں چڑ گیا۔ گو جس کام کو وہ زبان سے نکالتا بڑی بی لپک کر کر دیتیں۔ پھر بھی اسے ضد تھی کہ کرے تو رضیہ ہی کرے۔ جب بن ٹھن کر وہ کلب جانے لگا تو رضیہ ہی کو پکارا ـــ بڑے پیار سے پکارا

"رضو ـــ ذرا ایک اچھا سا پان تو لگا دو"

"ہاں ہاں ابھی لو بٹیا" اور اماں جان کے دو سوکھے ہاتھوں نے جھٹ پٹ ایک آدھ مری، جی ہاں آدھ مری سی۔ چونکہ سوکھے سوکھے ہاتھوں سے ترو تازہ سی گلوری بھی کچھ یوں ہی سی معلوم ہوتی ہے۔ ہاں تو جلدی سے گلوری پیش کر دی۔

حامد نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ وہ انہی سوکھے جھرکٹ ہاتھوں کی بنائی ہوئی گلوری کھایا کرتا تھا۔ خیر اس نے جیسے اتنے دن

صبر کیا اور کچھ دن کرے گا۔ آخر کبھی تو یہ سوکھے مارے ہاتھ تپش پاکر آرام کی نیند سوئیں گے۔ اور پھر ؟ پھر وہ موٹے موٹے سفید ہاتھوں کی بنائی تر و تازہ گلوریاں کھایا کرے گا۔ اس آنے والے خوشگوار وقت کے خیال سے ہی وہ مسکرا اٹھا۔ اس نے ان موٹے سفید ہاتھوں کی مالکہ کی طرف عجب انداز سے دیکھا۔ جو ملکھیتوں سے بچنے کے لئے دوپٹے میں چھپی ہوئی تھی۔ اس نے آہستہ سے دور ہی سے کہا۔

"خدا حافظ رضو!"

"جیتے رہو بیٹا" ۔ اپنی ساس نے جواب دیا۔ اور پانوں کی صافی سے ناخون پونچھنے لگیں۔

حامد چڑ گیا۔ اونھ، وہ تو رضو سے۔ خیر وہ چلا۔

"منیر دولھا" اس کی ساس نے پکارا

حامد کا جی چاہا۔ ٹینس کا ریکٹ کسی کے زور سے کس کے مارے اور بچوں کی طرح زمین پر مچل کر خوب لوٹے۔ آخر بڑی بی اسے چھیڑنے پر کیوں تلی تھیں کاش وہ اب اسے منیر دولھا نہ کہا کرتیں۔ دولھا بنتا ہے انسان، دو ایک روز کے لئے وہ بھی مارے باندھے سے۔ اور یہاں چھ سال شادی کو ہونے آئے۔ اماں جان کے شاعرانہ تخیل میں اس کی حیثیت "دولھا" ہی جیسی تھی۔ لفظ دولھا اسے اپنی اس مسخری تصویر کو سامنے لاکر کھڑا کر دیتا تھا۔ جس سے اسے چڑ تھی۔ ظفر، محمود، افضل سب ہی کی شادیاں ہوئی تھیں۔ پر ان میں سے کوئی بھی دولھا نہیں کہلاتا تھا۔ وہ سب اسے چھیڑنے کو اکثر دولھا میاں کہہ کر ٹھٹھا مارا کرتے۔ اگر دنیا میں دولھا کہنے والی ساسوں کا وجود اس قدر ضروری تھا تو پھر خدا نے اس قدر شریر دوست ہی کم از کم نہ پیدا کئے ہوتے۔ خیر وہ آہستہ سے بغیر مڑے بولا "جی"۔

"میاں رات کو ذرا جلدی آجایا کرو۔ بچی اکیلی پڑی پڑی دہلا کرتی ہے۔"

"نو بجے سے پہلے ہی آجاتا ہوں۔ اونھ! وہ دور ہی سے بولا۔

"ہاں ـــــ آں۔ یہ میں کب کہتی ہوں۔ مگر میاں آخر کو بچی ہے۔ اکیلا ڈھنڈار گھر میں چولھے کے پاس لگی رہتی ہوں (رقت کی دھمکی دے کر) تم جانو تمہاری بیوی ہے۔ مجھے

اپنی ماممتا" آگے وہ کچھ نہ بولیں۔ حامد منہ پھُلائے چلا گیا۔ اگر اس کی بیوی اپنی معصوم آنکھوں سے اسے ایک بار دیکھ کر جھوٹ موٹ بھی کو کہہ دیتی تو وہ کلب ولب پر لات مار کر آج تو ضرور ہی گھر میں بیٹھتا۔ مگر اب تو اسے جانا ہی پڑا۔

نہ جانے حامد کو کیا ہو گیا تھا۔ بے وقوف انسان نہ جانے کیا سمجھتا تھا، بالکل دماغ ہی چل گیا تھا۔ جیسے۔ آخر بڑی بی سے چڑنے کی اسے کیا مار تھی۔ وہ اس کی اور اس کے گھر بار کی دیکھ بھال ایسے کرتی تھیں کہ بس کیا کوئی دوسرا کرے گا۔ وقت پر کھانا چاہئے۔ ہر چیز اپنی جگہ قرینے سے، ہر کام ٹھیک۔ پھر؟ پھر آخر وجہ اس طرح منہ سجانے کی؟ آخر اماں جان سے بڑھ کر اس کا، اور اس کی بیوی کا کون ہمدرد تھا۔ رضیہ ابھی ناتجربہ کار تھی۔ پر وہ زمانے کا رنگ ڈھنگ دیکھے ہوئے تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ آج کل کے شوخ طبیعت لڑکے سیدھی سادی لڑکیوں کے بوتے کے نہیں ہوتے۔ انہیں تو چٹاخ پٹاخ اور شوخ سلیقہ لڑکیاں ہی قابو میں رکھ سکتی ہیں۔ وہ رضیہ کو باقاعدہ فیشن کے مطابق بنائے سنوارے رکھتیں۔ گھر کا سارا کام کاج خود کرتیں کہ کہیں میلی کچیلی لہسن پیاز میں بسی ہوئی بیوی کو دیکھ کر حامد "بدکنے" نہ لگے۔ انھوں نے اسے بال بچوں کے جھگڑے سے بھی آزاد رکھا۔ وہ اسے محسوس ہی نہ ہونے دیتی تھیں کہ وہ ایک بچے کی ماں بن چکی ہے۔ وہ بچے کو اپنے ہی پاس رکھتی تھیں۔ کہ کہیں اس کے رونے دھونے سے حامد گھبرا نہ اٹھے۔ بچے عورت کا حسن لوٹ لیتے ہیں۔ اور اس میں شوہر کو لبھانے والا جادو نہیں رہتا۔

حامد جب کلب سے لوٹا تو وہ جان بوجھ کر دیر سے آیا۔ وہ دکھا دینا چاہتا تھا کہ وہ بڑی بی سے قطعی نہیں دبتا اور کس آزادی سے ان کی عدول حکمی کر سکتا ہے۔ وہ دل میں ٹھان کر آیا تھا کہ اگر آج اماں جان نے کوئی ذرا سی بھی بات اسے جلانے کو کہی تو بس ٹوٹ پڑے گا۔ مگر جب کمرے میں داخل ہوا تو اس کی نظر رضیہ پر پڑی۔ وہ سرمئی رنگ کی ساڑھی میں ریشمی بلی کی طرح کرسی میں گیند بنی پڑی تھی۔ وہ بے ساختہ مسکرا اٹھا۔ اور لڑائی کا خیال ایک سرے

سے اُس کے دماغ سے نکل گیا وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور بڑے سپاہیانہ انداز میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔

"اوہ —— رضو، آج بشن چند کو بڑی طرح مارا۔ یقین مانو —— دو سے، یہ دیکھو —— یہ موچ آگئی آج ہاتھ میں۔"

رضیہ کلبلا کر اُٹھنے لگی "ارے ہے یہ کیسے؟ لایئے آیوڈیکس مل دوں!"

"اوہو —— یہ قسمت اور ہماری۔" وہ اپنی دُکھتی ہوئی کلائی کو موڑنے کی کوشش کرتے ہوئے حسرت سے بولا۔ گویا یہ بھی خوش قسمتوں ہی کو نصیب ہوتا ہے کہ ان کی کلائیوں میں موچیں آئیں اور ان کی حسین بیویاں آیوڈیکس ملیں۔" رضیہ ہنس دی۔

"اب اترایئے مت بس —— لایئے کہاں ہے آپ کی اٹیچی —— اسی میں ہوگا۔ آیوڈیکس!"

"آیوڈیکس بعد میں ملنا —— ذرا پہلے میرے پاس آؤ —— اِدھر میرے پاس —— اوتھ، ذرا قریب آؤ —— آؤ تو —— اوہو —— آج بس —— اور ہاں تم نے میری پسند کی سرمئی ساڑھی پہن ہی لی؟" وہ اطمینان کی سانس لے کر بولا۔

"ہٹئے بھی،" وہ شرمانے سی لگی۔

"اور —— آؤ مگر!" وہ ایک دم سے چُپ ہو گیا۔ جیسے ٹھوکر کھا کر اوندھے مُنہ گر پڑا۔

"کیوں —— آخر کیا" وہ قریب آکر بولی۔

"رضیہ —— یہ جمپر —— یہ اودا جمپر ——" وہ جذبات سے مغلوب ہو کر ہکلایا۔

"یہ اودا ہے! واہ سبز ہے یہ تو" رضیہ بولی۔

"گہرا سبز ہوگا۔ مگر وہ سرخ جمپر کیوں نہ پہنا —— وہ جو میں لایا تھا۔"

جلدا ایسے بولا گویا یہ کوئی اہم ہی مرحلہ ہے جسے وہ طے کر کے رہے گا۔

رضیہ معصومیت سے بولی۔ "اماں نے کہا کہ یہ کلیجی پھیپھڑا برا لگتا ہے۔ سبز خوب کھلتا ہے۔ سرمئی ساڑھی پر —— اور ——"

"اور وہ چوڑیاں ——— نیلی ——— ؟"

"وہ رکھی ہیں ——— اماں جان نے کہا پُرانے فیشن کی ہیں، اب کے منہیاری آئے تو اُس سے بدل لینا۔ وہ آئی نہیں ابھی تک، میں نے یہ دوسری ڈال لیں۔"

"کیوں آخر اُن چوڑیوں میں بھی بُرائی پیدا ہو گئی!"

"بُرائی کیوں پیدا ہو جاتی، وہ ذرا ویسی تھیں یہ نئے فیشن کی ہیں۔"

حامد اماں جان کے نادر شاہی حکموں کو سُن کر پست ہو گیا۔ اس کا دوڑتا ہوا خون جیسے سونے لگا۔ اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے، نتھنے ہلنے لگے اور گلے میں سُوکھی سُوکھی گولیاں سی اٹکنے لگیں۔ یہ ہتک کی جاتی تھی اس کے لائے ہوئے محبت کے تحفوں کی۔ بھلا اس کی پسند اور کلیجی پھیپھڑا۔ بھلا وہ چوڑیاں لائے اور پُرانے فیشن کی۔ یہ عقل میں آنے والی بات ہے۔ بھلا ہو کیسے سکتا ہے، یہ سب حامد کو جلانے کے لئے سازش کی گئی ہے۔

وہ سمجھ گیا اور رنجیدہ ہو کر بولا "نئی وضع یا پرانی وضع ——— میری لائی ہوئی کوئی چیز بھی تمہیں پسند آئی ہے۔ کبھی میری پسند کا بھی خیال کیا تم نے۔ کبھی میری پسند کا بھی تم نے کپڑا پہنا؟ کہ بس جو چیز ہے اوروں کی پسند کی۔ جو کام ہیں اوروں کی مرضی کے مطابق ہیں۔ میں نے مانا کہ اس گھر میں میری حکومت نہیں۔ اماں جان کی حکومت چلتی ہے۔ مگر میں بھی تو آخر کوئی چیز ہوں۔ اتنے دن شادی کو ہو گئے۔ یہی پتہ نہیں چلتا کہ یہ گھر ہے یا سرائے! جو چیز ہے اوروں کے ہاتھ میں یہاں تک کہ بیوی بھی!"

اماں جان گھنٹوں رضیہ کو لیکچر پلاتی تھیں۔ گھنٹوں زمانہ کی اونچ نیچ سمجھاتی تھیں۔ مگر وہ اس کے منہ میں کترنی جیسی زبان تو نہ رکھ سکتی تھیں۔ وہ تھی جیسے گوڈڑ۔ پھر بھی اس نے کہا "اماں جان اتنی محبت کرتی ہیں، پھر اُن کا دل!"

"اُن کا دل! اُن کا دل!! گویا میرے تو دل نہیں پتھر کا ٹکڑا ہے سینے میں۔ چاہے جتنی ٹھوکریں مارو نہیں ہوتا کچھ۔ تم میری بیوی ہو یا اماں جان کی؟"

"آپ تو غصے ہونے لگے۔ ذرا دیکھئے وہ کس قدر محبت سے گھر کا انتظام کرتی ہیں۔ اچھے سے اچھا کھانا۔ وقت پر ——— تمام ....."

"تو گویا مجھے اچھے اور وقت پہ کھانے کے سوا اور کچھ نہیں چاہیئے۔ مجھے بھی گھوڑا سمجھا ہے کہ وقت پر دانہ پانی دے دیا اور بس! — واہ خوب! کیا سمجھا ہے تم نے مجھے۔"

"مگر وہ ننّو ان سے کس قدر ہلا ہوا ہے، ہمیں تو وہ جانتا بھی نہیں ہے۔ انہیں کو ماں سمجھتا ہے۔"

"یہ اور بھی کمال ہے۔ بھیّا یہ بھی کوئی خوشی کی بات ہے کہ ہمارا بچّہ ہمیں کچھ نہیں سمجھتا۔ خوب!

"اُن کی محبت اور —"

"ارے بھئی باز آئے اُن کی محبت سے کہ بس وبالِ جان۔"

"یہ آپ —" رضیّہ رونے کی دھمکی دینے لگی۔

حامد ڈرا اور دوسرے اس نے آنے والے قدموں کی چاپ بھی سُن لی تھی۔

امّاں جان آ کر پیار سے بولیں "اے آج کیا کھانا نہیں کھایا جائے گا۔"

"ابھی چلتے ہیں۔ ذرا ان کے ہاتھ میں چوٹ لگ گئی ہے۔ آئیوڈیکس مل دوں تو ابھی آتی ہوں۔" رضیّہ بولی۔

"اے ہے کاہے سے" بڑی بی چیخ کر بولیں۔

"ٹینس کھیلنے میں ہاتھ مُڑ گیا — ننھے کو دی تھی میں نے ڈبیہ رکھنے کو۔" رضیّہ نے جواب دیا۔

"اے نگوڑے ٹینس پینس یہ کیا کھیل نکلے ہیں کہ ہاتھ پیر سلامت نہ رہیں۔ جبھی تو میں کہتی ہوں میاں ان واہیات کھیلوں کو لات مارو۔ نگوڑے بے کار اے بھئی اپنا گھر بار ہے، یہاں ہی شام کو اٹھو بیٹھو۔ چوسر ہے، تاش ہے وہی کھیلو۔

بڑی بی کی نصیحت سے حامد رونکھا سا ہو گیا۔ اب زیادتی پر ہی تُل گئیں۔ بھلا گھر میں بیٹھ کر ان اندھی چندھی کے ساتھ کیا تاش اور چوسر کھیلے۔ یتے یہ نہ پہچانیں۔ میم اور غلام کا فرق انہیں نہیں معلوم۔ گھنٹوں گھور گھور کر دیکھنے کے بعد بھی آج تک ٹھیک چال چل کر نہیں دی خدا کی بندی نے اور اوپر سے۔ اونھ۔ وہ دل ہی دل میں گھڑیاں

کھوتا گیا۔

"اے ننھے! وہ ذرا ڈبیہ تو لا۔" رضیہ نے پکارا۔

"کون سی ڈبیہ؟ وہ مرہم کی — اے میرے پاندان میں ہے۔ اے ننھے او ننھے کے بچے۔ کان چھوٹ گئے یا سو گیا چولھے پر؟ چل ادھر۔"

"کیا ہے بی؟" ننھا آٹے بھرے ہاتھوں سے سر کھجاتا آیا۔

"اے وہ میری ڈبیہ ہے کہ نہیں وہ تو لے آ۔"

"کون سی ڈبیہ؟"

"اے وہی پاندان میں جو پڑی ہے۔ میں نے اس دن پلنگ کے نیچے سے اٹھا کر رکھ لی تھی۔ میری پٹاری میں ہو گی۔"

"کون سی پٹاری میں؟"

"اوئی۔ اے پانوں کی اور کیا سینے کی پٹاری ہیں۔ پلنگ پر رکھی ہے۔ برآمدے میں۔"

"کون سے پلنگ پر؟"

"اے مار کے ٹکیاں چھانٹ رہا ہے کہ — لاتا ہے اب ڈبیہ! اے نواڑ کی پلنگڑی پر میری پٹاری رکھی ہے۔"

"نواڑی پلنگڑی پر۔" ننھا ہزاروں سوالوں کے بعد بھی کچھ نہ سمجھ کر بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ حامد کا جی خوش ہو گیا کہ ننھے نے اماں جان سے اس کو ستانے کا کچھ نہیں تو ذرا سا بدلا تو لے ہی لیا۔ ننھا ہزار مصیبتوں کے بعد ڈبیہ لایا تو بڑی بی آستین چڑھا کر آگے بڑھیں۔

"لاؤ میاں! میں مل دوں!"

"نہیں، رہنے دیجئے، کچھ ایسی زیادہ تو چوٹ بھی نہیں — رضیہ مل دیتیں —"

"اے نہیں، میں مل دوں گی، اس میں ہے ہی کیا۔"

لاکھ جتن کر کے ڈبیہ کھولی۔ اندھیرے میں سوجھتا نہیں۔ پھر بھی ٹٹول رہی ہیں۔ حامد بھی منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ اسے کیا غرض تھی کہ مدد کرتا۔ خیر ڈبیہ کھلی اور انہوں نے

سیاہ مرہم کی لگدی اس کی کلائی پر رکھ کر گھسّے دینے شروع کئے۔

آج آیوڈیکس بھی حامد کو چھیڑ رہا تھا۔ کمبخت گوند کی طرح چپکا جاتا تھا اور اوپر سے ان سوکھی انگلیوں کی گرفت —— درد بجائے گھٹنے کے اور بڑھا اور بڑھتے بڑھتے دل و دماغ پر پھیل گیا۔ بڑی بی نے جیسے لوریاں دینی شروع کیں۔

"ایک دفعہ تمہارے سسر کو اللہ بخشے چوٹ آگئی تھی۔ ہاتھ سوج کر یہ دنبل کا دنبل ہوگیا۔ میں نے جھٹ بی ہمسائی سے تھوڑی افیم لے ذرا سے چمیلی کے تیل میں ڈال گرم کر مالش کر دی۔ اوپر سے سہتی سہتی روئی باندھ دی۔ اے لو وہ تو تین دن میں اچھے بھلے ہوگئے ویسے سادہ تیل بھی اچھا ہوتا ہے۔ بات یہ ہے نگوڑا یہ مرہم ہے کیسا۔ سارا چمٹا جا رہا ہے اُنہوں، اور بُو تو دیکھو حقّے کی سی سڑاند ہے توبہ۔ توبہ" وہ زمین پر تھوک کر بولیں۔

"یہ آپ نے کیا مل دیا۔" حامد چڑ کر بولا اور ہاتھ کھینچ لیا۔

"اے وہی، کیا ہووے ہے مرہم اور کیا؟"

"یہ مرہم ہے یا تمباکو کا قوام؟ —— لاحول ولا قوۃ۔"

"اے ہے مجھ اندھی کو سوجھتا بھی نہیں —— مگر شاباش ہے میاں عینک لگائے ہو۔ ماشاء اللہ سے تمہیں بھی دکھائی نہ دیا کہ یہ کیا بلا ہے۔ واہ میاں واہ ——"

رضیہ ہنسنے لگی۔

"اے ہے یہ تمباکو —— اونھ —— لائیے آپ کا ہاتھ دُھلا دوں، توبہ ہے بُو تو دیکھو۔"

"خاک دُھلاؤ گی۔ معاف کرو۔" حامد ہاتھ چھڑا کر پیر پٹختا غسل خانے میں چلا گیا۔

اس دن اُسے تلے ہوئے گرم گرم کبابؔ اور مٹر پلاؤ جس پر اُس کی جان جاتی تھی خاک مزے دار نہ معلوم ہوا۔ وہ انہیں بے رحم ہاتھوں کا ہی تو پکا ہوا تھا، جنہوں نے اس کی نفیس کلائی پر بجائے آیوڈیکس کے قوام کی مالش کی تھی۔ رات کو دیر تک وہ پھوڑنے پر لوٹتا رہا۔ کیونکہ قوام کی بُو ایسی بس گئی تھی کہ اُسے نیند نہ آئی۔

ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ہر شوہر خواہ وہ کتنا ہی بے ہنگم بڑی توند والا اور بدشکل کیوں نہ ہو جب تنخواہ لے کر آتا ہے تو عین مین کوہِ قاف کی پری معلوم ہوتا ہے بیس تاریخ سے قرض پر گزارا کرنے والی بیوی کا جی چاہتا ہے کہ بس اس خزانہ کی کنجی کی بلائیں لے کر واری نیاری ہو جائے اور بھئی بیچارے میاں کا بھی ایک یہی دن جوبن اور بھکار کا ہوتا ہے وہ اُس دن خواہ مخواہ ذرا اُچک کے چلتا ہے، گویا اونچی ایڑی کی گرگابی پہنے ہو۔ جب حامد تنخواہ لے کر آیا تو رضیہ کے پُرسکون نیم غنودگی کے انداز میں ذرا ہلچل نہ مچی۔ وہ ویسے ہی دیوار سے تکیہ لگائے اپنے خوبصورت شفاف کے دوپٹے پر بچے نیچے دھاریاں گنتی رہی۔ حامد ذرا کھڑا ہو گیا۔ اُس نے رضیہ کو جگانے کے لئے آخر کہہ ہی دیا کہ "لو بھئی رضو! حساب کتاب کر لو ــــــ"

"ہوں ــــــ آ ــــــ خ ــــــ خاؤ ــــــ" اس نے لاپرواہی سے جمائی لی۔

"اور بھئی بزاز کے کتنے دام ہوں گے؟ آپ اُٹھو بھی کہ بس ــــــ اونہہ۔"

"شاید اس دفعہ تو کم ہی ہوں گے ــــــ اماں جان کو شاید معلوم ہو۔"

"اور بنئے کے؟"

"اس کے تو شاید ــــــ چُکا دیئے گئے ــــــ اور نقد آتی ہے جنس!"

"یہ شاید" اور "ہوں گے" حامد کے جوش پر ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ کر دیا۔

"شاید، شاید کیا؟ ٹھیک بتاؤ، آخر؟"

"اب مجھے کیا معلوم۔ اماں جان حساب کتاب کرتی ہیں۔ اُن ہی کو بلائیے (پکار کر) اے اماں جان، اماں جان۔ ممو کو نہلا رہی ہیں، آتی ہوں گی اور حساب کتاب کی کیا ضرورت ہے۔ دے دیجئے۔ روپئے بچیں گے تو بھاگ تو نہ جائیں گے۔"

"اونہہ۔ عجیب بے ڈھنگا پن ہے۔ ہم کہتے ہیں، سب کام قاعدے سے ہو۔ حساب ضرور لکھا جائے گا۔ آخر؟" حامد اماں جان کے دخل سے پھر بڑبڑانے لگا۔

"اماں جان! آیئے نا۔" رضیہ بولی۔

"آئی بیٹی ــــــ ذرا دم تو لے ــــــ بچے کو نہلا لوں۔" اماں جان دور سے چلائیں۔

"تمہیں تو کچھ معلوم ہی نہیں۔ گویا گھر کے معاملہ میں کوئی دلچسپی ہی نہیں۔"

اماں جان کے پیروں کی سڑپڑ سن کر وہ چپ ہوگیا۔ وہ بچے کو دوپٹے میں لپیٹے پانی ٹپکاتی آکر پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

"اے ہے ——— ہاں اب بتاؤ ——— کیا ہے؟ تھک گئی ——— ایسی شرارت کرتا ہے نہلانے میں کہ توبہ بھلی ——— ہاں کہو،" وہ اس کا سر پونچھتی ہوئی بولیں۔

"جنس وغیرہ کے متعلق پوچھ رہے ہیں۔" رضیہ بیگانوں کی طرح بولی۔

"ہاں۔ ہاں، تو لکھو۔ چودہ بزاز کے۔ تیس بنیئے کے۔ سات گوٹہ والے کے دینے ہیں۔ اور تین روپئے اُس کے تمہارے پے جاموں والے کپڑے کے دینے باقی ہیں۔ سارے پے جامے پھٹ گئے۔ جہیز کے پہن رہی تھی۔ میں نے کہا اب بنا ہی ڈال۔ دودھ اور مکھن والے کو تو خیر تم خود ہی دے دیتے ہو۔ نوگھی کے۔ سات ساڑھے سات......"

"یہ لیجئے ——— اور کچھ،" اور رضیہ، کپڑے وغیرہ کے لئے اور کچھ؟ وہ براہِ راست رضیہ سے بولتا رہا۔ اور اسی کو روپیہ دیتا رہا۔ گو اُس نے چھوئے بھی نہیں اور بڑی بی ہر بات کا جواب دیتی رہیں۔ حالانکہ حامد نے بہت چاہا کہ ان کی موجودگی ہی کو نظر انداز کر دے۔ مگر۔ خیر۔

"ہاں اور رضیہ کے دوپٹے بھی پھٹ گئے ہیں۔ جہیز کے سارے دوپٹے جھیر جھیر ہوئے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا اب روز روز ایسے بھاری دوپٹے کہاں نصیب ہوتے ہیں۔ ایک تھان پکی ململ کا چھ روپئے کا آئے گا۔ منگا لو۔"

"کیوں صاحب اب جہیز نہ ہوا قارون کا خزانہ ہوگیا کہ ختم ہی ہونے میں نہیں آتا۔ اور یہ جو پندرہ پندرہ بیس بیس روپئے مہینے کا کپڑا چھ سال سے خود اس کی تنخواہ میں سے بن رہا ہے یہ کہاں جا رہا ہے کہ بس جو چیز ہے جہیز کی۔ حامد کا بس چلتا تو وہ رتی بھر جہیز نہ لیتا۔ ساری عمر کے طعنوں سے تو نجات ملتی۔

"یہ لیجئے چھ روپئے" اُس نے روپئے سامنے پٹخ دیئے۔

"اور وہ ——— بُندے منّو میاں کی دُلہن پہنے تھیں۔ فریدہ کے بیاہ میں وہ تجھے

بھی پسند آئے تھے۔ وہ منگوا لے رضیّہ ــــــ کوئی کتنے کے ہوں گے، وہ رضیّہ سے بولیں۔

اب اندھیر ہے کہ نہیں۔ فرمائشیں بھی بجائے بیوی کے ساس صاحبہ کی معرفت آنے لگیں۔ اگر ایسا ہی تھا تو اسے بھلا بیوی دی ہی کیوں تھی۔ ساس ہی کافی تھی ــــــ وہ سوچتا رہ گیا۔

بڑی بی نے جو اُسے چُپ دیکھا تو بولیں "اے میں نے تو کہا تھا کہ اب کی سے جو میرا خرچہ آئے گا تو میں خود منگوا دوں گی۔ خواہ مخواہ کیوں مُنیر دولہا کو تنگ کری۔ مگر وہ کئی مہینے سے کرایہ کا وہ کچھ گھپلا پڑ گیا ہے کہ بس کیا بتاؤں ــــــ ورنہ میں خود ــــــ"

حامد نے موقع پا کر کہہ ہی دیا "تو ہو آیئے نا چند مہینے کے لئے۔"

"کیسے جاؤں مُنیر دولہا، گھر سارا اوندھا ہو جائے گا۔"

"گھر بار کیا ہے؟ آخر رضیّہ کو گھر بار چلانا ہی ہے۔ آپ ساری عمر تو نہیں اُن کے پاس رہیں گی۔"

"مگر میرا جی تو اسے اکیلے چھوڑنے کو نہیں مانتا۔ اسی کے مارے اپنا گھر چھوڑے پڑی ہوں۔ الطاف بھیّا ہاتھ جوڑتے ہیں کہ کچھ دنوں کو آ جاؤ۔ مُنّی آپا کہتی ہیں کہ میرے یہاں رہو (غرور سے) مجھے تو سب ہاتھوں ہاتھ لینے کو تیار رہیں۔ کوئی بات نہیں کہ مجھے اللہ نہ کرے کھانے پینے کی کمی ہو۔"

حامد کو شک ہوا کہ کہیں اماں جان کو اس کے دل کا حال تو نہیں معلوم ہو گیا۔ جی ہاں وہ بڑی آزادی سے سوچا کرتا تھا کہ کاش الطاف بھیّا کو اُن پر ایسا پیار آئے کہ بس پکڑ ہی لے جائیں اور مُنّی آپا کو ایسی محبت چرّائے کہ بس انہیں کلیجے سے ایسی چمٹائیں کہ قیامت نہ چھوڑیں۔ پھر؟ وہ کس قدر فضول خیال ــــــ ایں خیال است و محال است و جنوں! ــــــ یہ کہیں ہو بھی سکتا ہے کہ وہ ہو اور رضیّہ اور بس!

حامد کو خاموش دیکھ کر اماں جان پھر بولیں "دوسرے نَمو تو مجھ سے ایسا ہِل گیا ہے کہ

گ[illegible] منہ [illegible]تا۔"

"کچھ نہیں، اتنا بڑا ہو گیا ہے اسے بندر کی طرح چپکائے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چھوڑ جائیے۔ آپ اسے ٹھیک ہو جائے گا۔"

اُس نے پھُولے گالوں والے گستاخ انسان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور اس نے اپنا مُنّہ سا ہاتھ اُٹھا کر کہا "ہٹ۔ ہم مار دیں گے۔"

اس چار برس کے لونڈے سے حامد کو دلی بغض تھا۔ وہ اپنے بچے سے سوتن کا سا بیر رکھتا تھا جب دیکھو گود میں لدا ہوا الا بلا کھایا کرتا اور جو کبھی چمکار کر بھی حامد اس سے نیچے اُتر کر کھیلنے کو کہتا تو وہ اپنا مُنّا سا خوبصورت جوتا اُٹھا کر اُسے مارنے کی دھمکی دیتا۔ اس کی اس ادا پر اماں جان تو بس لوٹ جاتیں وہ اسے چٹاخ چٹاخ چومتیں اور کلیجہ سے لگا لیتیں۔ اور رضیّہ بھی مسکرائے بغیر نہ رہتی۔ مگر حامد جیسے انگاروں پر لوٹ جاتا۔ اس کا جی چاہتا تھا اس نددیدے بدتمیز انسان کو موٹے ڈنڈے سے اتنا مارے کہ یہ موٹی موٹی بدھیاں پڑ جائیں اور سب اکڑنا بھول جائے۔ مگر وہ لاچار تھا۔

"تو پھر ننّو کو بھی لے جائیے۔" رضیّہ بولی۔

"ہاں مجھے بھی لے جائیے"، وہ دانت بھینچ کر بولا۔

"کیا چلئے۔ چائے لاؤں میرے دُولہا؟" اماں جان نے کچھ نہ سُن کر کہا۔

ایک تو ویسے ہی کیا کم حامد جل رہا تھا کہ اور بڑی بی نے "گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے"، کی مثال صادق کر دی۔ حامد کا جی چاہا کہ دے "ایک دفعہ ہی مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دو نا" لیکن چونکہ وہ بہت مہذب تھا لہذا خاموش رہا۔

اماں جان بچے کو جھوٹ موٹ دکھاوٹ کے لئے ہٹا کر بولیں "اے ہٹّو میاں ذرا میں چائے بنا لاؤں۔"

"آں — نئیں۔" وہ منمنا کر بولا اور حامد نے مُنہ پھیر لیا کہاں تک دکھ سہے جاتا۔

"ننّو میاں — اماں جان چائے بنائیں گی میرے پاس آجاؤ۔ رضیّہ چمکار کر بولی۔

"نا — آ — ئیں"، بچہ اور اترایا۔

"اے بیٹے میں چلئے بناؤں گی تو کیا تمہیں لادے رہوں گود میں، اپنی ماں کے پاس جاؤ۔"

"ہاں — ہنک — ہنک۔" ننّو اٹھلایا۔ "تم ہو ہماری اماں۔"

"اے میرا لال۔ میرا کلیجہ۔ میرا چاند کا ٹکڑا — لو دیکھو میرے دولہا۔ تم کہتے ہو چھوڑ جاؤ بچے کو، بھلا خون کہہ دے گا۔ رو رو کے جینا اجیرن کہہ دے گا۔"

"کچھ نہیں — دو روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔" حامد نے تجبل میں ننّو کو گھورتے ہوئے کہا۔

"واہ۔ میں اپنے لال کو کیوں چھوڑ کر چلی جاؤں۔ کیوں میاں جاؤں۔ ہٹو۔ بھئی میں جا رہی ہوں۔ (بچہ رو کر چمٹ گیا) اے واہ میں تو جھوٹ موٹ کہہ رہی تھی (ہنستے ہوئے) چل میرے لال میں تجھے گود میں لے کر چائے بناؤں گی چل —"

(بڑی بی بچے کو لاد کر کراہتی ہوئی چلی گئیں)

"ناس کر دیا لڑکے کا"، حامد نے پھٹکار کر کہا۔

"ستیاناس کیا کر دیا — جس محبت سے وہ پالتی ہیں کوئی کیا پالے گا۔" وہ اس قدر ضدّی بچہ ہے کہ میرے تو بس کا نہیں اور بھئی وہ نہ ہوں تو کون اس کی دیکھ بھال کرے۔ رو رو کے زندگی . . . ."

"کیا زندگی — زندگی — یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ ہاتھ پہ ہاتھ رکھے پڑی ہو۔" اماں جان منہ میں پانی ٹپکا دیں تو خیر ورنہ نہیں — اماں جان روٹی دیں تو پیٹ بھرو ورنہ بھوکے ہی رہیں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ توبہ۔ توبہ۔ یہی نہیں معلوم ہوتا اپنے گھر میں رہتے ہیں — ایسا لگتا ہے جیسے سرائے میں پڑے ہیں۔ خیرات ملتی ہے۔ گویا اپنی کمائی نہیں کھاتے — لاحول ولا قوۃ"، وہ بڑبڑایا۔

"وہ تو میری وجہ سے یہاں پڑی ہیں۔ تمہیں ہی ہزاروں طرح کے آرام ہیں۔ اُن کے دم سے . . . . وہ تو آج چلی جائیں۔ دوسرے وہ کسی کی محتاج تو ہیں نہیں۔ اپنا کھاتی ہیں بلکہ چار پیسے اپنے پاس سے ہمارے اوپر لگا دیتی ہیں۔ سب ہی جانتے ہیں کہ سو سوا سو

روپے ہیں اتنا اُجلا خرچ نہیں ہوسکتا۔

تو کون کہتا ہے کہ یہاں آن بیٹھ کر اپنا نقصان کریں۔ ہونہہ — خوب کون روکتا ہے؟"

"یہ اُن کی محبت ہے جو روکتی ہے۔ ورنہ....."

"ارے لعنت ہے ایسی محبت پر — جو دوسروں کی زندگی اجیرن ہو جائے۔"

(اماں جان کو آتے دیکھ کر ٹپٹا کر باہر جانے لگتا ہے)

"اے منیر دولہا۔ اے منیر دولہا! چائے نہیں پیو گے۔" وہ گھبرا کر بولیں۔

"جی نہیں۔" اور وہ پیر پٹختا روٹھے بچے کی طرح باہر چلا گیا۔

"رضیہ! یہ کیا معاملہ ہے" بڑی بی بولیں۔

"نہ جانے۔ ننّو کی ذرا سی ضد پر غصہ ہو گئے" رضیہ رو کر بولی۔

"اوئی بچے کی ضد پر کیسا غصہ۔ نہیں جی یہ کوئی اور بات ہے۔ کئی دن سے دیکھ رہی ہوں مزاج ہی نہیں ملتا۔ ہر وقت اکھڑے اکھڑے رہتے ہیں۔ کچھ دال میں ضرور کالا ہے میں پہلے ہی —" رقت سے آواز رک گئی۔

"نہ جانے" رضیہ سسکیوں سے رونے لگی۔

"خدا غارت کرے اُس ڈائن قطامہ کو جو میری بچی کا گھر بگاڑے۔ میرے اللہ! خدا کی مار اس بیاروں پیٹی پر جو منیر دولہا کا دل میری بچی کی طرف سے پھیرے یا اللہ۔ میرے —"

وہ دیر تک جا نماز پر بیٹھی "اُس ڈائن" کو کوستی رہیں۔

سانپ

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

افراد

رفیعہ: ہلکی پھلکی تیتری کی مانند، بھوری جان دار آنکھیں اور بات کے ساتھ جنبش کرنے والی بھویں۔ موٹے بھرے ہوئے ہونٹ اور چپٹی سی ناک مگر رنگ نہایت شفّاف۔ چہرے پر بوقتِ ضرورت غصّہ اور معصومیت دونوں اپنا اپنا رنگ دکھا سکتے ہیں۔ لوگ اسے حسین کہتے ہیں۔

سیّد: رفیعہ کا بھائی۔ گورا رنگ۔ درمیانہ قد۔ سریع الحس اور زود رنج۔ لیکن جلد ہی من جاتا ہے۔ مگر چہرے کی اور آنکھوں کی بناوٹ ہی کچھ ایسی کہ پتہ نہیں چلتا کہ ابھی غصّہ ہے یا من چکا ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ رفیعہ سے چھوٹا ہے یا بڑا۔ یقیناً دونوں توام تو نہیں۔

خالدہ: گدرا بدن۔ اگر احتیاط نہ کرے تو گول مٹول ہو جائے۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں جنہیں وہ جان کر نیم باز رکھتی ہے۔ گندمی رنگ، پاوڈر کی مدد سے ذرا کھلتا ہوا سُتھرا۔ پھولے ہوئے گال جن سے معصومیت ٹپکتی ہے اور غصّہ تو گویا آتا ہی نہیں تراشے ہوئے بال گچھوں کی صورت میں شانوں پر پڑے رہتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ اور بادامی ناخن چلتے ہیں بار بار معصومانہ غرور سے دونوں شانوں [illegible] تکتے ہیں۔

غفار: نہایت حسین اور نازک۔ اس کے باوجود دراز قد، شاعرانہ چال اور مصوروں کے سے صاف اور ستھرے ہاتھ۔ ہندوستان میں اتنے دلکش چہرے بہت کم نظر آتے ہیں۔ یہ رفیعہ کی خوش قسمتی ہے کہ غفار سے اس کی منگنی ہو گئی تھی اور اب شادی میں کچھ زیادہ دیر نہ تھی۔ اس کے علاوہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا۔ دادی جان کے اصول کے مطابق اپنے گھر اور کالج کے علاوہ آج تک قسم لے لو کہیں نہیں گیا۔ ہاں سسرال آجاتا ہے۔ یہاں اسے شرم اس قدر آتی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ رفیعہ سے بے تکلف بھی نہیں۔

نوکر: ایسا جیسے عام نوکر ہوا کرتے ہیں۔ فرمانبردار۔ محنتی، ڈانٹ برداشت کرنے والا۔

وقت: صبح آٹھ بجے۔ گرمی کے دن۔

لباس: بہترین فیشن کے۔

اسٹیج: صرف ایک کمرہ جس میں سید رہتا ہے اور ایک امیرانہ ٹھاٹھ کا ڈرائنگ روم۔

سید کا کمرہ۔ کمرے میں دائیں اور بائیں ایک ایک دروازہ پُشت پر ایک دروازہ اور کھڑکی۔ جس میں باغ اور سبزہ وغیرہ نظر آتے ہیں۔ ایک طرف ایک پلنگ اور چند کرسیاں اور میزوں پر کتابیں رکھی ہیں۔ ایک آرام کرسی پر سید آگے کو جُھکا ہوا شیو کر رہا ہے۔ شیو کا سامان ایک بہت ہی چھوٹی میز پر رکھا ہوا ہے۔ جس پر سے کوئی چیز اُٹھانے میں بڑی مہارت کی ضرورت ہے۔ ورنہ دو تین چیزیں اور لٹکی چلی آتی ہیں۔ سید کے چہرے پر کسی تازہ غم کے آثار ہیں جسے معلوم ہوتا ہے وہ بہت چھپا رہا ہے۔ ذرا میلا ساورات کا لباس پہنے ہے اور بے انتہا سنجیدہ بھویں چڑھائے بیٹھا ہے۔)

پہلا سین

رفیعہ: (ایک بادامی رنگ کے کوٹ کے بازو پر ایک پٹی ٹانکتی ہوئی آہستہ آہستہ آتی ہے)

لو سیّد (دانت سے تاگا توڑتے ہوئے) لاؤ اِس دو دھیا کوٹ کو بھی ٹھیک کر دوں!

سیّد: (نشیلو روک کر جھٹا کر کھڑا ہو جاتا ہے) ہیں! ٹھیک کر دوں۔ کیا ٹھیک کر دو گی؟ (عاجز آ کر) ..... آخر یہ میرے ہر کوٹ کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو (کوٹ چھین کر) چھوڑو ادھر۔ آخر یہ کیوں؟

رفیعہ: (سنجیدگی سے ڈورے میں گرہ لگاتے ہوئے) ہوں تو تمہارا ارادہ ہے کہ ابا جان کے انتقال کے بعد ذرا بھی اظہارِ غم نہ کرو۔ آخر دنیا کیا کہے گی کہ ایک ذرا سا ٹکڑا لگانا بھی دشوار ہے۔ لاؤ دو دھیا کوٹ، کہاں ہے؟

سیّد: کیا کہے گی دُنیا؟ بکنے دو۔ مجھے یہ دکھاوٹ، پسند نہیں۔

رفیعہ: تم تو..... بس دیوانے ہو۔ آخر اس میں کیا بڑائی ہے؟

سیّد: ہونے دو مجھے دیوانہ۔ کیا دنیا میں ہمیں ڈگی پیٹنی ہے کہ بھئی ہمارے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ جس کا ہمیں بہت ہی صدمہ ہے۔ یقین نہ آئے تو لو دیکھ لو کالی پٹی۔

رفیعہ: یہ تو میرا مطلب نہیں (کرسی پر بیٹھ کر ناخونوں سے تاگا سونت رہی ہے)

سیّد: پھر آخر تمہارا مطلب کیا ہے۔ یہ جو تم نے سیاہ کپڑے پہنے ہیں۔ خوب جانتا ہوں کیوں پہنے ہیں!

رفیعہ: کیوں پہنے ہیں۔ ذرا بتانا تو سہی۔

سیّد: اس لئے کہ ذرا گوری نظر آؤ۔

رفیعہ: پاگل کیا میں ویسے نہیں پہن سکتی!

سیّد: (کچھ نہ سُن کر تولیہ سے مُنہ رگڑتے ہوئے) اور دوسرے اس لئے کہ کالج کے لڑکے سوچیں بڑی..... فرمانبردار بیٹی۔ دیکھو نا کیسا ماتمی لباس پہن رہی ہے بیچاری!

رفیعہ: (نفرت سے) اوہو..... قطعی نہیں۔

سیّد: پھر شاید اس لئے کہ لوگوں پر ظاہر کر دو کہ تمہارا مذاق اس معاملے میں شستہ ہے۔

خالدہ وغیرہ سے بلند ہے، وہ کبھی اتنے میچنگ ماتمی لباس نہیں پہن سکیتں، جتنے تم پہن سکتی ہو۔

رفیعہ: جھوٹ، بالکل غلط، شیلا اور خالدہ دونوں کے باپ زندہ ہیں۔

سید: (لاپرواہی سے) تو مائیں مری ہوں گی۔

نوکر: (دروازے میں آکر دو ایک بار کھنکارتا ہے اور کوٹ کا کالر پکڑ کر کھینچتا ہے) اہم ہکرر... غفار میاں آئے ہیں۔

سید: (غصہ سے کرسی دھکیلتا ہے) اونہہ! لاحول ولا قوۃ۔

رفیعہ: کیوں یہ آخر اتنے کیوں گلے؟

سید: (ویسے ہی چڑ کر) یہ کہاں کی رسم ہے کہ ایک تو انسان ویسے ہی پریشان ہو اور اوپر سے لوگ آکر جان کھائیں۔

(ڈریسنگ گاؤن پہن لیتا ہے)

رفیعہ: مگر سید، غفار، ہیں۔

سید: (گھٹی ہوئی آواز میں) غفار نہیں اس کا باپ بھی ہو تو کیا کروں۔ مجھے اُن پرسہ دینے والوں سے چڑ ہے بار بار گویا چھیڑتے چلے آرہے ہیں۔

رفیعہ: (طعن سے) صبح سے نہ جانے کون کون تمہارے دوست چلے آرہے ہیں۔ تو کچھ نہیں۔ اب غفار کے آنے سے جل گئے۔

سید: (جھنجلا کر) تم اور مجھے جلا رہی ہو۔ جو بھی آرہے ہیں بے وقوف ہیں۔ مانا کہ غفار تمہارا منگیتر ہے تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ وہ ہر وقت سر پر سوار رہے۔

رفیعہ: (چڑ کر) واہ شرم نہیں آتی۔ سب کے سامنے میرا منگیتر کہہ دیا کرتے ہو۔

سید: اوہو۔ تو گویا آپ شرماتی ہیں نا اپنے منگیتر سے۔

رفیعہ: یوں تو نہ کہو۔ کافی شرماتی ہوں۔

سید: (منہ سکیڑ کر) کافی شرماتی ہو۔ میں کہتا ہوں جب تمہیں اس سے شادی ہی نہیں کرنی تو پھر اس سے چالیں کیوں چلا کرتی ہو۔

رفیعہ: اے ہے سید باوے نہ بنو (آہٹ سن کر) شش۔ چپ!

(آہستہ سے پردہ ہلتا ہے اور غفّار اندر آتا ہے۔ حسین اور بھولے چہرے کو غم اور گھبراہٹ نے اور بھی معصوم بنا دیا۔ تھوڑی دیر تک سب پہ کی خاموشی چھائی رہتی ہے۔ تینوں خاموش ہیں۔ سیّد کو غصّہ بھی)

غفّار: (سمجھ میں نہیں آتا کیا کہے۔ ہمّت کر کے) اُف! کس قدر اُداسی چھائی ہوئی ہے۔

سیّد: (کٹتے ہوئے لہجہ میں) معاف کرنا..... غفّار! یہی بالکل یہی جملہ تم صبح دُہرا چکے ہو۔

غفّار: (سٹپٹا کر رحم طلب نگاہوں سے رفیعہ کو دیکھتا ہے جو سیّد کو تنبیہاً گھورتی ہے۔ ہمّت کر کے) رفیعہ! آپ کا ارادہ تعلیم جاری رکھنے کا ہے؟

سیّد (رفیعہ کے بولنے سے پہلے ہی) کیوں؟ بھلا ایسی کیا خوشی کی بات ہوئی ہے۔ جو یہ پڑھنا چھوڑ بیٹھیں گی۔ خوب!

غفّار: (گھبرا کر) یہ میرا مطلب نہیں..... میرا مطلب ہے کہ امّاں جان تنہا ہو جائیں گی۔

سیّد: ہونہہ! جیسے یہ ان کے پہلو ہی سے تو لگی بیٹھی رہتی ہیں۔

غفّار: انہیں ایک غمخوار اور ہمدرد کی تو ضرورت ہوگی۔

سیّد: (جل کر) کس قدر بے وقوف ہو تم۔ بھلا یہ بیگم صاحبہ امّاں جان کی کیا دلجوئی کریں گی۔ بھئی اُن کے شوہر کا انتقال ہوا ہے اور یہ قطعی نعم البدل نہیں ہو سکتیں۔

رفیعہ: (تنبیہاً) سیّد!!

غفّار: (مُردہ آواز میں) بھئی سیّد! نہ میں تمہاری طرح چالاک اور نہ چرب زبان!

سیّد: پھر آپ کو ایسی پرُسہ دینے کی آفت کیا پڑی ہے۔

رفیعہ: (ڈانٹتے ہوئے) سیّد! تم تو انسان کے پیچھے پڑ جاتے ہو۔

سیّد: (لڑائی کے لہجہ میں) تم کون۔ تم کون غفّار کی حمایت لینے والی۔ اس کے مُنہ میں کیا زبان نہیں ہے!

رفیعہ: زباں تو ہے تمہاری طرح مُنہ میں تلوار نہیں ہے۔ میں کیوں نہ لوں حمایت!

غفّار: (ذرا سنبھل کر) اگر رفیعہ میری حمایت۔ بھی لیں تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔ یہ ان کی مہربانی ہے۔

سیّد: (جل کر) حمایت ..... تم .... تمہیں اس سے بہت مہربانیوں کی امید ہے۔

رفیعہ: (جلدی سے) سیّد دیکھو تم نے پھر میرا دل دُکھانے کی باتیں کیں۔ امّاں جان کے انتقال کے بعد سے تم بہت ہی وہ گئے ہو۔

سیّد: اونہہ! یہ سب مکّاری ہے۔

رفیعہ: (روہانسی ہو کر) ہر وقت میرے پیچھے ہی پڑے رہتے ہو۔

سیّد: (جل کر) تمہارے ...... تمہارے! ارے کیوں .... بس .... یہ سب ہمدردی وصول کرنے کے لئے ہے ..... (اُسے واقعی رونے پر تیار دیکھ کر) اچھا بھئی غفّار شروع کرو تم اپنی تقریر ..... ہاں! کیا کہہ رہے تھے .... کہ بڑی ..... وہ اُداسی چھا رہی ہے .... ہاں اور کیا؟

(غفّار کھسیانی ہنسی ہنستا ہے)

(تھوڑی دیر پھر وہی بے تکی خاموشی)

غفّار: (ہمّت کر کے) رفیعہ! تمہیں اتنا رنج نہ کرنا چاہیئے۔

سیّد: (جلدی سے) اِتنا۔ کِتنا؟

(رفیعہ رومال سے آنسو نہیں آنکھیں پونچھتی ہے)

غفّار: (سیّد کی موجودگی کو بھُولنے کی کوشش کر کے) رونا نہیں چاہیئے رفیعہ۔ مرحوم کو دُکھ ہوگا۔

(سیّد جل کر زور سے ہنستا ہے اور بڑے آئینہ کے پاس جا کر تولیہ سے مُنہ پونچھتا ہے اور اپنی شکل اور بال دیکھتا ہے)

غفّار: (مستعدی سے) رفیعہ تمہاری صحت پر بڑا اثر پڑنے کا ڈر ہے۔

(سیّد بے تاب ہو کر جلدی سے غسل خانہ میں چلا جاتا ہے۔ غفّار کو بہت

ناگوار گزرتا ہے)

غفّار: (جو تنہائی کو بہترین موقع سمجھتا ہے) رفیعہ!۔۔۔ تمہیں رنجیدہ دیکھ کر جانتی ہو میرا کیا حال ہوتا ہے؟

رفیعہ: (بڑی معصوم آواز میں) اب رنج کرنا نہ کرنا تو اپنے بس کی بات نہیں ہے۔

غفّار: (سرگوشی میں) رفیعہ! (گویا اس کے نام میں مزہ ہے۔ ایسے منّہ میں زبان پھیرتا ہے) رفیعہ! صبر کرنا چاہیئے۔ صبر نہ کرے تو تم جیسا انسان کیا سے کیا ہو جائے۔

سیّد: (واپس آکر آخری جملہ سُن کر) ہوں! پھر وہی نخرے! (رفیعہ کو اعتراض کی نظر سے دیکھتا ہے)

غفّار: (پہلی دفعہ غصّہ ہونے کی کوشش کر کے) سیّد!

(سیّد نگ سیکر کر سوں سوں کرتا ہے اور چھوٹی میز پر سے سنبھال کر کچھ چیزیں اُٹھا کر بڑی میز پر رکھ آتا ہے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے۔ تینوں پر جھنجھلاہٹ اور بے تکاپن چھا جاتا ہے۔ سیّد انگلیوں سے کوئی بے تُری گت گھٹنوں پر بجا رہا ہے۔ رفیعہ بار بار رومال کا کونہ بدل رہی ہے۔ غفّار اپنی انگشتری والی شاعرانہ انگلی کے ناخون کو گھبرا گھبرا کر دانتوں سے ٹٹول رہا ہے)

غفّار: (اِدھر اُدھر دیکھ کر) اچھا تو اب اجازت ہے۔

سیّد: (چونک کر تیزی سے) بڑی خوشی سے۔

غفّار: (ٹکہ توڑ جواب سے مُردہ دل ہو کر) میں۔۔۔ میں!

(چلا جاتا ہے)

سیّد: (غفّار کے جانے کے بعد) ہو نہہ۔ مکّار!

رفیعہ: (بل کھا کر) دیکھو سیّد تمہاری حرکتیں۔۔۔

دوسرا سین

(ڈرائنگ روم میں رفیعہ بیٹھی شیشے کے مرتبان میں مچھلیوں کو توس ڈال رہی

ہے۔ سیّد بہت سے خط اور پیکٹ لئے آتا ہے۔ ایک ایک کو بار بار دیکھتا
ہے اور اُلٹ پلٹ کرتا ہے)

سیّد: ہم..... الہ آباد سے جواب ہی نہیں آیا۔

رفیعہ: (مُڑکر) اہا۔ ڈاک آگئی۔ کوئی میرا خط؟

سیّد: (صوفے پر خطوں کو ڈالتے ہوئے) سب تمہارے ہی ہیں۔ میرا تو ایک آیا ہے...
یہ مکھن والے کا بل۔

(رفیعہ جلدی سے خط اُٹھاتی ہے اور کھول کر بڑی تیزی سے پڑھنا
شروع کر دیتی ہے۔ بار بار ہنستی ہے)

سیّد: رفیعہ! کس کا خط ہے؟

(رفیعہ سُنتی ہی نہیں۔ پڑھنے میں مشغول ہے)

سیّد: (زور سے) میں کہتا ہوں کس کا خط ہے؟

رفیعہ: (سر ہلا کر ٹالتے ہوتے) ایک کا ہے۔

سیّد: آخر وہ ایک ہے کون؟

(رفیعہ دوسرا خط پڑھ کر اور بھی زور سے ہنس دیتی ہے)

سیّد: (بے تاب ہو کر) میں کہتا ہوں آخر تمہارے پاس اس قدر خط کیوں آتے ہیں؟

رفیعہ: یہ ڈاکئے سے پوچھو۔ وہی لاتا ہے (مشغول ہے)

سیّد: نہ جانے کس کس کے خط اور ایسے بیہودہ بیہودہ۔ میں کہتا ہوں بے حیائی کی بھی
کوئی حد ہے۔

رفیعہ: تم ——— تمہیں کون منع کرتا ہے۔ تم بھی خط منگوا لو۔ اس سے بھی
بیہودہ خط ———!

سیّد: مگر میں یہ باتیں پسند نہیں کرتا۔

رفیعہ: (چمکار کر) تم بڑے اچھے بیٹے ہو۔

سیّد: (غصہ سے) میں واقعی مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ مجھ سے کئی لوگوں نے کہا... کہ...

رفیعہ: (بے تعلقی سے) ہوں .... کیا کہا؟

سیّد: تمہیں شرم نہیں آتی مگر میں تو ذلیل ہوتا ہوں۔ اچھا تم اُسے عبدالرحمٰن کو کیوں خط لکھتی ہو؟

رفیعہ: (سادگی سے) چند ضروری باتیں پوچھنا تھیں۔ اس لئے۔

سیّد: وہ ضروری باتیں میں جانتا ہوں کیا ہیں۔

رفیعہ: جب جانتے ہی ہو تو میرا دماغ کیوں چاٹ رہے ہو؟

سیّد: مجھے بڑی شرم آتی ہے اور وہ عبدالرحمٰن تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

رفیعہ: اوہو! تب تو بڑی اچھی بات ہے۔

سیّد: کیسی بنتی ہو جیسے تمہیں معلوم ہی نہیں۔

رفیعہ: ارے بے وقوف معلوم ہوتا تو میں اُس کے چھ خطوں کا جواب کیوں گول کر جاتی۔ آج .... یہ دیکھو۔ لکھا ہے، یہ "ساتواں خط ہے۔" دیکھو نا ـــ! اگر مجھے معلوم ہوتا تو یقیناً......

سیّد: تم اس سے شادی کرو گی!

رفیعہ: دیکھو زور زور سے نہ کہو، غفار سُن لے گا تو بس ـــــ

سیّد: بکو مت۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کیا...... تم ....اس.....سے شادی کرو گی؟ (ایک، ایک لفظ صاف کہتا ہے)

رفیعہ: ابھی اس کا جواب کیسے دے سکتی ہوں۔

سیّد: کیوں ابھی سے کیا۔ رفیعہ.... مگر یاد رکھو، اگر تم نے اُس بُڈھے گھاگ سے شادی کی تو بس ـــــ

رفیعہ: تو بس ... کیا؟ تو تم غصہ میں آکر جمّن بی سے بیاہ کر لینا۔ بس مزہ تو رہے گا سیّد۔ ابا جان کے بعد گھر کس قدر......

سیّد: چُپ رہو۔ تو اب تم اُسے خط نہ لکھنا۔

رفیعہ: کیوں؟ واہ!

سید: نہیں۔ آخر فائدہ۔ تم اُس سے شادی تو کر نہیں رہی ہو۔

رفیعہ: کیا معلوم.... قسمت کی کسی کو کیا خبر؟ فرض کرو غفار مجھ سے شادی نہ کرے اور جیسے کہ تم کہتے ہو ظفر میرے اوپر مقو کے بھی نہیں، تو پھر، یہ.... ٹھیک رہے گا.... روپیہ بہت ہے۔ سید پھر دونوں....

سید: (غصہ سے بھنّا کر) کمبخت چُپ رہ، اور پھر کہتی ہے، تجھے کچھ نہ کہوں۔

رفیعہ: آخر کیوں؟ میں کرتی کیا ہوں۔

سید: اور پھر پوچھتی ہو "کیا کرتی ہوں" یہ تم اتنا کیوں اتراتی ہو؟

رفیعہ: کون، میں اتراتی ہوں؟

سید: ہاں اور خصوصاً غفار کو دیکھ کر۔

رفیعہ: ذرا........ (جل کر) اچھا جاؤ۔ اتراتے ہیں۔ پھر تمہارا کیا۔ تم کیوں جلے مرتے ہو؟

سید: مجھے غفار پر ترس آتا ہے۔

رفیعہ: اوہو۔ بڑا ترس آتا ہے۔ جیسے اُسے کوئی کھائے ہی تو جا رہا ہے۔

سید: کھائے ہی جا رہا ہے اور نہیں تو پھر کیا۔

رفیعہ: (خط اُٹھاتے ہوئے) تم تو پاگل ہو.... یاد ہے وہ باؤلا کُتّا جس نے تمہیں کاٹا تھا تو کسولی گئے تھے جو نہ کرو کم ہے۔

سید: ارے مجھ سے جلتی ہو۔ آخر کو تمہارا بڑا بھائی ہوں۔

رفیعہ: تو تم ہی بتا دو۔ میں نے غفار کے ساتھ کیا ظلم و ستم کئے۔

سید: تم اُسے پھانسنے کی کوشش کرتی ہو۔

رفیعہ: (متحیّر ہو کر) سید کوئی بھائی اپنی بہن کو ایسی بیہودہ بات کہتا ہوگا۔ پتہ ہے یہ گالی ہے۔

سید: (ہاتھ گھما کر) سچی بات میں گالی بھی ہو تو کیا کیا جائے۔

رفیعہ: اچھا کھاؤ قسم کہ میں غفار کو.... توبہ توبہ۔ پھانستی ہوں۔

سعیدہ: (اطمینان سے) پھانستی ہی نہیں ہو بلکہ پھانس چکیں اور اب ظفر پر دانت تیز کر رہی ہو۔

رفیعہ: دیکھو سعیدہ تم بڑی بے ہودگی پر اُتر آتے ہو، میں برداشت نہیں کر سکتی، واہ واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔

سعیدہ: تو پھر تم کیوں ایسی حرکتیں کرتی ہو۔ آخر اس میمنہ کا خون چوسنے میں کیا مزہ آتا ہے۔ ہاں ظفر اور چیز ہے۔

رفیعہ: (جلدی سے) اور چیز...... اور چیز سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

سعیدہ: (ایک اخبار موڑتے ہوئے) میرا مطلب ہے ظفر تم سے بھی زیادہ مکار ہے۔ وہ اُلٹا تمہیں مزہ چکھا دے گا۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے نا۔

رفیعہ: (بگڑ کر) دیکھو تم گھما پھرا کر کسی نہ کسی بہانے سے مجھے مکار کہہ ہی جاتے ہو۔ تمہاری خالدہ بڑی معصوم ہے نا۔!

سعیدہ: خالدہ! لفظ معصوم کے ساتھ تمہیں خالدہ کیسے یاد آسکتی ہے۔ ارے وہ؟... وہ تمہاری بھی اُستاد ہے۔ اُسی نے تو تم کو بگاڑا ہے۔

رفیعہ: (دھمکا کر) اچھا کہوں گی خالدہ سے۔

سعیدہ: (بدمزاجی سے) لاحول ولا قوۃ، ایک دفعہ نہیں لاکھ دفعہ کہہ دینا۔

رفیعہ: پھر دیکھنا وہ تمہاری کیا گت بناتی ہے۔ صورت بھی نہ دیکھے گی۔

سعیدہ: ارے وہ مبارک دن آئے بھی کبھی جب وہ میری صورت دیکھنے اور اپنی دکھانے سے باز آئے۔

رفیعہ: (حیرت سے) کیا سچ کہہ رہے ہو تم؟

سعیدہ: اور نہیں تو کیا جھک مار رہا ہوں۔

رفیعہ: تمہیں دوڑ دوڑ کر وہاں جاتے ہو۔ اُس کی جوتی بھی پروا نہیں کرتی۔

سعیدہ: جوتی پروا کرتی ہوتی تو بھلے ہی دن تھے۔ جوتی میں خالدہ سے زیادہ انسانیت ہے مگر وہ تو یوں (پنجہ گھما کر) مجھے یوں شکنجہ میں کسے ہوئے ہے۔

رفیعہ: کون منع کرتا ہے۔ نکل جاؤ نا شکنجہ میں سے۔

سیّد: (جھلّا کر) ارے وہ نکلنے بھی دے جب نا۔ وہ ایک پہنچی ہوئی ہے۔ نکلنے کب دے گی۔ جونہی نکلنے کی کوشش کرتا ہوں آڑے لنگا لگا دیتی ہے۔

رفیعہ: بودے ہو تم۔ یوں کہو۔

سیّد: اور کیا۔ بودا نہ ہوتا تو وہ یوں مجھ پر چھا سکتی تھی۔

(دائیں دروازے کا پردہ ہلتا ہے۔ خالدہ ایک سیاہ ساڑھی اور سُنہری چھوٹی سی صدری پہنے داخل ہوتی ہے)

خالدہ: (دونوں ہاتھ پھیلا کر ایک طرف سر ڈال کر) رفی!

رفیعہ: (دوڑ کر اُس سے لپٹتے ہوئے) خلّو!!

سیّد: (جانے کے لئے کھڑے ہو کر نقل میں) اترانا!

خالدہ: (چونک کر) ارے رفّی! ابھی کون چوں سے بولا تھا؟ (کان پہ ہاتھ رکھ کر) کہیں . . . . بھئی مجھے چوہوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔

سیّد: (دانت بھینچ کر) بلیّاں ہی چوہوں سے نہیں ڈریں گی تو کون ڈرے گا۔

خالدہ: (مڑ کر مسرت سے) سیّد ڈیئر!

(سیّد جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹھوڑی سینے پر ٹکائے کھڑے گھورتے رہتے ہیں)

خالدہ: (جیسے نڈھال ہو کر کرسی پہ گر جاتی ہے) رفّی، میں سیّد سے بہت خفا ہوں۔

سیّد: (ویسے ہی تنے ہوئے) شُکریہ!

خالدہ: (تعجب سے) شکریہ؟ رفّی! سیّد سے پوچھو آج میرے غصّہ پہ شکریہ کیسا؟

سیّد: (نقل میں) رفّی خالدہ سے کہہ دو مجھے اس کے غصّہ کی رتّی بھر پروا نہیں۔

خالدہ: ان سے کہو اِترائیں نہیں۔

سیّد: رفّی ان سے کہہ دو دبتے نہیں تم سے۔

خالدہ: (سنجیدگی سے) رفّی ان سے کہہ دو خدا کے لئے اپنی جیبوں میں سے ہاتھ نکال لیں۔
بالکل ربڑ کا گڈا لگ رہے ہیں۔

سیّد: (جلدی سے جیبوں سے ہاتھ نکال لیتا ہے مگر فوراً ہی شرمندہ ہو جاتا ہے۔
(رفیعہ اور خالدہ ایک دوسرے پر گر کر لوٹ جاتی ہیں اور بے بات ہنستی ہیں) اور
تم..... تم جیسے موم کی پتلیاں۔ منوں پوڈر تھوپ لیا اور بن گئیں حسین۔

خالدہ: (چہرے سے پاؤڈر کو احتیاط سے تھتھپاتے ہوئے) رفّی! میں پاؤڈر لگاتی
ہوں ہے۔

رفیعہ: (جھوٹ بول کر) نہیں تو۔

خالدہ: (ڈانٹ کر) پھر..... پھر سیّد نے کیسے کہا؟

رفیعہ: (خوشامد سے) غلطی ہوئی بیچارے کی۔

سیّد: بالکل نہیں۔ تم دونوں پاؤڈر لگاتی ہو اور بھویں بھی اکھیڑتی ہو۔

رفیعہ: آہا..... (مذاق اڑاتے ہوئے) اکھیڑتی!

خالدہ: ہاں "اکھیڑتی" ہیں۔ بھویں نہ ہوئیں خیمے ہو گئے جو اکھیڑے جائیں۔

سیّد: (کھسیا کر) اور کیا.....

خالدہ: رفّی یہ سراسر بہتان ہے۔ نہ ہم پوڈر لگائیں نہ بھویں اکھیڑیں۔ ہم قطعی اتنے
ہی حسین ہیں جتنے نظر آتے ہیں اور سیّد کو خدا کے لئے سمجھاؤ کہ ہماری بھویں
پیدائشی کمان جیسی کھنچی ہوئی ہیں۔

سیّد: (ہاتھ جھٹک کر) ہوں گی۔ ضرور ہوں گی۔ کمان نہیں توپ کے گولے ہوں گی۔
بس!

خالدہ: تو گویا آپ کو شک بھی ہو سکتا ہے۔ رفّی! سیّد کتنے بد مذاق ہیں، دنیا اپنے
محبوب کی شان میں قصیدے کہتی ہے اور یہ منحوس خواہ مخواہ پاؤڈر لپ اسٹک
کا ذکر کرتے ہیں۔ تمہیں کیا، ہم کچھ لگائیں۔ دکھائی تو خوبصورت دیتے ہیں۔

سیّد: تم لوگ بے شرم ہو۔

دلا پرواہی سے کھڑکی میں سے جھانکنے لگتا ہے۔ خالدہ اور رفیعہ چپکے چپکے باتیں کرکے اسکیم بناتی ہیں)

رفیعہ: اچھا تو میں ذرا دوپہر کے کھانے کے لئے باورچی کو بتا آؤں (رعب سے) سید خالدہ کا دل نہ گھبرانے پائے۔

سید: (گویا سُنا ہی نہیں)

(خالدہ دبے پیر سید کے پیچھے جاتی ہے وہ کچھ نوٹس نہیں لیتا اور برابر باہر غور سے جھانک رہا ہے خالدہ کچھ چڑکر ہاتھ تول کر گال پر ایک تھپڑ مارتی ہے)

خالدہ: (بھولپن سے ہاتھ کو دیکھتی ہے۔ گویا کچھ ڈھونڈھ رہی ہے) کہاں گیا، یہ موٹا سا مچھر تھا اُڑ گیا۔

سید: (بھنّا کر مڑتا ہے اور گال پر ہاتھ رکھ کر) لاحول ولاقوۃ۔

خالدہ: سچ کہتی ہوں۔ مچھر تھا یہ بڑا سا اُڑ گیا۔

سید: معاف کیجئے۔ آئندہ سے آپ میرے مُنہ پر مچھر کا شکار نہ کیجئے۔ کاٹنے دیجئے مچھروں کو۔

خالدہ: (معصوم آنکھیں بنا کر لچکتی ہوئی آواز میں) واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میرا دل کیسے مانے گا۔ مچھر کو کاٹتے دیکھوں گی تو ضرور اُسے ماروں گی۔ تمہاری تکلیف . . . . .

سید: میری تکلیف؟ (رُکھائی سے) معاف رکھو اپنی ہمدردی سے۔

(دُور کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

خالدہ: اوہ! یہ کیسے؟ (آکر اس کی کرسی کے ہتّے پر بیٹھ جاتی ہے) یہ کہیں ہو بھی سکتا ہے میں تمہاری تکلیف کا خیال نہ کروں تو پھر کون کرے سید؟ پھر کون تمہاری خبر گیری کرے۔ تمہارے اوپر مکھیاں بھنکنے لگیں تو کیا میں نہ اُڑاؤں۔

سید: (کچھ جلا ہوا) ہوں۔ بکواس جو کوئی تمہاری سُنے۔

خالدہ: تم پر تو ہر وقت بھوت سوار رہتا ہے۔

سید: (ترشی سے) ہوں! جانتی ہو یہ بھوت آتا کہاں سے ہے!

خالدہ : ہا ..... آں ..... ارے ٹھہرو (کان پر ایسے چٹکی لیتی ہے گویا کوئی کیڑا پکڑ رہی ہے)
اسے ہے جوں! تو بہ ہے سید! (بال پکڑ کر ہلا کر) سر منڈاؤ۔ یہ پٹیاں
پارنے کا کیا شوق ہے۔ کانوں پہ تو جوئیں رینگ رہی ہیں ..... ی .....
..... ق ..... (گھن کھاتی ہے)

سید: (تڑپ کر دوسری کرسی پہ زور سے جا بیٹھتا ہے) کیا مطلب ہے تمہارا خالدہ! اس
ذرا سی دیر میں مذاق ہی مذاق میں تم نے ایک تھپڑ ٹکا دیا۔ چٹکی بھر لی اور بال نوچ ڈالے۔
کہاں ہے جوں ذرا میں بھی تو دیکھوں۔

خالدہ: لو تو کیا میں تمہاری جوئیں سینت سینت کر رکھتی ہوں۔ پھینک بھی دی
میں نے۔

سید: (ناک کر) ہاں ضرور پھینک دی۔

خالدہ: اسے یہ ذرا سی جوں کا کیا جھگڑا کھڑا کر لیا۔ اور نہیں تو کیا میں نے کھالی۔ دیوانے
(روٹھ کر کرسی پہ بیٹھ جاتی ہے)

سید: میں پوچھتا ہوں تمہیں مزہ کیا آتا ہے؟

خالدہ: کاہے میں؟

سید: لوگوں کو دکھ پہنچانے میں۔

خالدہ: (خوشی سے کھل کر) دکھ پہنچانے میں۔ تمہیں دکھ پہنچتا ہے (حیرت سے)
سید، میں سمجھتی تھی تم بالکل مٹی کے تودے ہو۔ جسے نہ کوئی دکھ پہنچا سکتا ہے
نہ سکھ جو نہ روتا ہے نہ ہنستا ہے (دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر) یا اللہ تیرا شکر کہ
سید میں بھی جان ہے۔

سید: (غصہ سے پہلو بدل کر) تم بڑی مکار ہو۔

خالدہ: (ایک دم سنجیدہ ہو کر) تمہاری زبان بڑی گندی ہو گئی ہے سید!

سید: جو بات ہو گی وہ ضرور کہوں گا۔

خالدہ: کیا بات ہے آخر، میں نے تمہارے ساتھ کیا مکاری کی؟ جو ہر وقت کہتے رہتے ہو۔

سیّد: یہ مکاری نہیں تو پھر کیا ہے کہ خود.... خود تو میرے سر پہ چڑھ کر آتی ہو اور
اپنی سہیلیوں سے کہتی پھرتی ہو سیّد میری جوتیاں چاٹتا ہے، ہُنہ....
خالدہ: بالکل غلط۔ ٹامی اگر تمہیں میری جوتیاں چاٹتے دیکھ لے تو چاب ڈالے۔ ناممکن
میں ایسی بیہودہ اور غلط بات کہہ ہی نہیں سکتی۔
سیّد: (تیزی سے) تم نے نہیں کہا کہ میں تمہارے پیچھے پیچھے لگا پھرتا ہوں۔
خالدہ: (اطمینان سے سر ہلا کر) ہاں یہ تو میں نے کہا تو اس میں کیا عیب ہے۔ لڑکوں
کے لئے تو یہ بات باعثِ فخر ہے کہ وہ خوب صورت لڑکیوں کے پیچھے دوڑیں
دیکھ لو سبھی یہ.... کرتے ہیں۔
سیّد: ہوگا باعثِ فخر اوروں کے لئے۔ مگر میرے لئے تو ذلّت ہے۔ میں یہ.....
بیہودگیاں نہیں پسند کرتا۔
خالدہ: اوہو بڑے وہ ہو نا۔ خوب جانتے ہیں تمہیں۔ شیلا کے ساتھ....
سیّد: لاحول ولاقوۃ۔ وہ میری کلاس میٹ تھی۔ کبھی کبھی بات کر لیتا تھا تو سُنا ہے
آپ نے اُس سے اُلٹی سیدھی باتیں کیں۔
خالدہ: میں نے کیا اُلٹی باتیں کہیں؟ میں نے یہی کہا کہ تم بڑے چلتے ہوئے ہو۔
سیّد: جھوٹی۔ یہ نہیں کہا تم نے۔
خالدہ: جھوٹے ہوگے تم۔ پھر کیا کہا میں نے.... اچھا وہ منگنی والی بات!
سیّد: ہاں۔
خالدہ: تو کیا ہوا۔
سیّد: تم نے کہا کہ میری تمہارے ساتھ منگنی ہوگئی!
خالدہ: ہاں کہا۔ تو پھر؟
سیّد: تمہارا مطلب کیا تھا یہ کہنے سے۔ جب کہ.... جب کہ.... تم....
خالدہ: اے سیّد سچ مچ دیوانے ہو۔ اسے ہے یونہی کہہ دیا تھا تاکہ وہ تم سے
فلرٹ نہ کرے۔

سیّد: تم کون ہوتی ہو۔ تمہیں اس سے کیا۔ کوئی کچھ کرے۔

خالدہ: تو اب میں نے یہ بھی تو مشہور کر دیا کہ منگنی ٹوٹ گئی۔ بس بدلہ نکل گیا۔

سیّد: ارے خالدہ انتہا کرتی ہو۔ تم نے منگنی ٹوٹنے کے قصے میں بھی مجھے ہی ذلیل کیا۔

خالدہ: اور کیا پاگل! خود اپنے آپ کو کچھ کہہ دیتی۔

سیّد: مگر اب میں جو شیریں سے ملتا ہوں تو یوں جلتی ہو۔

خالدہ: کچھ بھی ہو سیّد تم کیسے ہی نالائق یا بد ہیئت کیوں نہ ہو۔ مگر کوئی لڑکی یہ کبھی پسند نہیں کرتی کہ اُسے پسند کرنے والا کسی دوسری لڑکی کو پسند کرنے لگے۔ سمجھے!

سیّد: خواہ وہ خود اسے رتی بھر نہ پدھارتی ہو۔

خالدہ: نا چاہے رتّی بھر نہ پدھارتی ہو۔

سیّد: بے شرم۔

خالدہ: کیوں؟

سیّد: اور تم مجھے اس وقت دق کرنے نہیں آئیں۔ کیوں؟

خالدہ: خاک۔ میں تو پرسہ دینے آئی تھی۔

سیّد: ہاں۔ اور یہ جب سے تم میری جان کو پرسہ ہی تو دے رہی ہو۔ یا بیٹھی بیٹھی مجھے دل رہی ہو۔

خالدہ: اونہہ، اب تمہیں کون سمجھائے۔

سیّد: سمجھاؤ تو جب کہ میں خود نہ سمجھتا ہوں۔ یہ تم نے رفیعہ کو یہاں سے کیوں ٹرخا دیا۔ اسی لئے نا کہ مجھے گھیر کر میرا خون چوسو۔

خالدہ: اگر تم ایسی باتیں کروگے تو میں ابھی چلی جاؤں گی۔

سیّد: (مردہ آواز میں) کاش تم اپنی دھمکیوں کو کبھی سچ بھی کر دکھاتیں۔

خالدہ: تو کیا تم چاہتے ہو کہ میں چلی جاؤں؟

سیّد: یقیناً (پھر جلدی سے) نہیں نہیں، اگر تمہیں شبہ بھی ہو جائے گا کہ میں چاہتا ہوں تم چلی جاؤ تو تم سارے وقت میرے سر پر سوار رہو گی۔ تمہیں میری ہر بات سے ضد ہو جاتی ہے۔

خالدہ: (ہنستے ہوئے اس کی طرف بڑھ کر) تم بہت عقلمند ہو گئے ہو سیّد۔

سیّد: (ترشی سے) حالانکہ مجھے پختہ یقین ہے کہ تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو (اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر) یہ میری طرف پھر عنایت ہو رہی ہے۔ اگر تم چاہتی ہو تو وہ رہا دروازہ!

خالدہ: (مصنوعی حیرت سے) ارے تم تو واقعی ہوشیار ہوتے جا رہے ہو۔

سیّد: ہا۔ ہاں مگر تم بڑے آرام سے اس کرسی پر بیٹھ سکتی ہو۔

(دُور کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہے)

خالدہ: (پیار سے) آؤ سیّد ملاپ کر لیں۔

سیّد: معاف ہی رکھو۔ کیا پھر کوئی "چھیڑ چھاڑ" نظر آیا؟

خالدہ: (نرمی سے) نا سیّد۔ اب کے کچھ نہیں۔ جو کچھ بھی کروں تو جو سزا چاہو دینا۔

(آ کر کرسی کے ہتّے پر بیٹھ جاتی ہے) لو اسی بات پر تم میرا ہاتھ چوم سکتے ہو۔

سیّد: (تیوریاں چڑھائے۔ منہ پھلائے) ہونہہ!

(رفیعہ پردے کی آڑ سے جھانکتی ہے اور خالدہ کو آنکھ سے اشارہ کرتی ہے)

خالدہ: (اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں سے لگا کر) لو۔ (چمکارتی ہے)

(رفیعہ اندر آتی ہے اور سیّد کو اعتراض کی نظروں سے دیکھتی ہے)

رفیعہ: (گھٹی ہوئی آواز میں) آج کل کے لڑکے اس قدر بدمعاش ہو گئے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ شریف لڑکیوں کا تو گھر میں آنا دشوار ہے۔

(سیّد جل کر خالدہ کو ہتّے پر سے دھکیلنا چاہتا ہے، جو پہلے ہی ہٹ چکی ہے اور کھڑکی میں سے باہر جھانک رہی ہے)

رفیعہ: (ڈانٹ کر جس سے سیّد کو نفرت ہے) کیا بات تھی سیّد؟

خالدہ: (معصوم آواز میں) کچھ نہیں۔ ان کے کان پر جوں رینگ رہی تھی۔ یہ موٹی بھینس کی بھینس۔ میں نے پکڑ کر پھینک پھانک دی۔ اب کہتے ہیں...... (سیّد کو اُٹھتا دیکھ کر) جلدی سے کھڑکی میں سے باہر جھانکنے لگتی ہے (گویا کچھ ہوا ہی نہیں)

(سیّد بھنّا کر اُٹھتا ہے اور باغ کی طرف جو دروازہ ہے اُس میں سے چلا جاتا ہے۔ خالدہ اور رفیعہ زور زور سے ہنستی ہیں)

تیسرا سین

(سیّد اور رفیعہ ایک ہی صوفے پر بیٹھے ہیں۔ دونوں ذرا بہتر اور مہذب نظر آ رہے ہیں۔ رفیعہ البم میں تصویریں لگا رہی ہے اور سیّد ٹانگ پر ٹانگ رکھے اخبار دیکھ رہے ہیں)

رفیعہ: چھٹیوں نے تو سیّد تھکا دیا۔ جی ہی نہیں لگتا۔

سیّد: ہوں۔ بوٹنگ کو چلتی ہو؟

رفیعہ: ہاں خلّو کو بھی بُلا لیں گے۔

سیّد: نا بھئی خلّو ٹلّو کا جھول ہے۔

رفیعہ: اوہو خلّو بغیر چاہے کچھ مزہ نہ آئے خود کو بھی۔

سیّد: کیسے مجھے۔ توبہ کرو۔ سارے وقت تو مجھ سے اُلجھتی رہتی ہے۔ تمہیں کچھ دو انصاف سے اُس دن اُس نے میرا جینا دوبھر کر دیا تھا کہ نہیں؟

رفیعہ: اچھا اب میں اسے منع کر دوں گی۔ آج میں نے خالدہ، ظفر اور غفّار کو کھانے پر بلایا ہے۔ خلّو تو چار بھی نہیں پیئے گی۔

نوکر: (دروازہ ہی میں سے جھک کر) ظفر میاں آئے ہیں۔ آپ کو بُلا رہے ہیں۔

سیّد: یہ کیا بیہودگی ہے واہ کہ دروازہ میں سے کوّے کی طرح کھڑے گردن جھکا جھکا کر چلا رہے ہیں۔

نوکر: (اندر آکر ذرا کھسیانی آواز میں) ظفر میاں آئے ہیں۔

سیّد: کتنی دفعہ کہا کہ ایسے دُور سے نہ چلایا کرو۔ گویا۔۔۔۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ کوئی طریقہ نہیں۔

نوکر: (اور بھی مُردہ آواز میں) ظفر میاں آئے ہیں۔

سیّد: (جل کر) بس بکے چلے جانا۔۔۔۔۔ رٹ رٹ۔ رٹ رٹ۔ کہہ دو آتے ہیں۔

رفیعہ: (البم سمیٹ کر) نہیں ظفر کو یہاں بلا لو نا۔ یہیں بھیج دو۔

سیّد: نہیں ٹھہرو۔

(نوکر آدھا جا کر لوٹ آتا ہے)

رفیعہ: (نوکر کو ڈانٹ کر) جاؤ میں کہتی ہوں۔ کہہ دو سیّد کام کر رہے ہیں۔

سیّد: ٹھہر بد تمیز (نوکر مُنہ بنا کر لوٹتا ہے) بھئی مجھے کام ہے ہم دونوں جا رہے ہیں موٹر خریدنے ظفر کے لئے۔

رفیعہ: (کھڑے ہو کر نوکر کو ڈانٹتی ہے) جلتے ہو کہ نہیں کہہ دو نہیں آتے سیّد۔

(نوکر بھاگتا ہے تو اندر داخل ہوتے ہوئے ظفر سے ٹکرا جاتا ہے۔ بے طرح ڈر کر بھاگتا ہے)

ظفر: ارے بھئی آئے کیوں نہیں تھے۔ چلو گے؟ (سگریٹ سُلگاتا ہے)

سیّد: ہا۔ ہاں چلو۔

رفیعہ: ٹھہرو تو۔ ظفر! اماں جان نے کہا ہے کہ تم مجھے فلاسفی پڑھانے آیا کرو۔

ظفر: (ناک سکیڑ کر) فلاسفی! میرے باپ نے فلاسفی نہیں پڑھی تو تمہیں کیا خاک پڑھاؤں گا۔

رفیعہ: تو خیر اکنامکس پڑھا دینا۔

ظفر: کیا بک رہی ہو۔ یہ بنیوں والے مضمون میں کیا جانوں۔ میں سائنس سٹوڈنٹ ہوں۔

رفیعہ: حکومت۔ اماں جان نے کہا ہے۔ شرم نہیں آتی اُن کا کہنا ٹالتے۔

سیّد: (ہاتھ ہلا کر) نہیں ظفر۔ اماں جان نے قطعی نہیں کہا۔ دل سے گڑھ رہی ہے۔

ظفر: مگر بھئی مجھے آتے بھی جب ہی تو پڑھاؤں یا ویسے ہی۔

رفیعہ: اچھا پوئٹری (POETRY) پڑھا دیا کرو (ہنس کر) اب بچ کر کہاں جاؤ گے!

سیّد: کچھ نہیں جی۔ جھوٹ بول رہی ہے اسے ضرورت بھی نہیں۔

رفیعہ: میں نے کیا جھوٹ بولا۔

سیّد: یہی کہ اماں جان نے کہا کہ کوئی نہ کوئی الٹا سیدھا مضمون ضرور ہی ظفر سے پڑھو۔ (ظفر سے) جب اس کا دل کسی کام کے کرنے کو چاہتا ہے تو میرے یا اماں جان کے سر تھوپ دیتی ہے اور کچھ ایسا پھندا ڈالتی ہے کہ بس ہی نہیں چلتا۔

رفیعہ: (تیزی سے) اور جو میں نے پچھوا دیا تو!

سیّد: کس سے پچھوا دو گی ؟

رفیعہ: خلو سے۔ دوسرے ظفر تمہارا ہی فائدہ ہے۔

ظفر: فائدہ! میرا کیا فائدہ ہے۔ نہ پڑھو گی نہ کچھ۔ جان ضیق میں رکھو گی —— سینکڑوں دفعہ لڑائی ہوگی۔ خواہ مخواہ بھلا کیا فائدہ۔

رفیعہ: تمہارا یہ فائدہ ہے کہ تمہیں بہانہ ڈھونڈھ کر مجھ سے ملنے نہ آنا پڑے گا۔ مزے سے ایک بہانہ موجود رہے گا اور غفار کو بھی اعتراض نہ ہوگا۔ کیوں ؟

سیّد: (تڑپ کر) او.... ہ.... بس.... ظفر میں نے کتنا کہا تجھ سے کہ اس بلا سے بچا رہیو.... مگر تو بھی نرا چغد ہی نکلا۔ اب دیکھ تجھے کیسی جوتیاں کھلواتی ہے۔

ظفر: اجی کھلوائیں جوتیاں۔ میں جیسے اس کی چالوں میں آ ہی تو جاؤں گا۔

رفیعہ: لو ظفر اب تمہیں بھی روٹیاں لگیں اور سیّد کی طرح اترانا شروع کیا، ان کی صحبت نے تو تمہیں کوڑی کام کا نہیں رکھا۔

سیّد: میری صحبت۔ میری صحبت کیا بری ہے۔ تم اپنی کہو۔ تمہیں خالدہ کی صحبت نے جنگلی بنا دیا ہے بالکل۔

(خالدہ منہ پھلاتے آتی ہے اور بالکل سید کے قریب بیٹھ جاتی ہے)

خالدہ: ہر وقت میاڈکر۔ ہر وقت میاڈکر۔ تمہارے خیالوں کی دنیا میں مَیں ہی چھائی ہوئی ہوں۔

سید: (منہ بنا کر) ضرور!

رفیعہ: تو اب پِٹوائے دیتی ہوں۔ کیوں غلّو۔۔۔۔

ظفر: (بات کاٹ کر) کیوں۔۔۔ ٹھہرو، غلّو کیا تمہارے سامنے امّاں جان نے کہا کہ رفیعہ کو پڑھاؤں۔

خالدہ: (سنجیدگی سے) کتنی مرتبہ کہا کہ ظفر میرا نام اس قدر پیار سے نہ لیا کرو۔ سید کو رشک ہوتا ہے۔ کیوں سید؟

سید: (برا مان کر) لاحول ولاقوۃ۔

رفیعہ: تو کل سے ظفر مجھے پڑھانے آیا کریں گے۔

ظفر: نہیں۔ قطعی نہیں۔۔۔۔ بس۔۔۔۔

رفیعہ: خیر تو بس محمود صاحب کو لکھوں گی وہ پڑھا دیا کریں گے۔

سید: جی نہیں۔ محمود سے نہیں۔ ہمارے یہاں ان کی آمدورفت نہیں۔

رفیعہ: آمدورفت نہیں تو اب ہو جائے گی۔

سید: جی نہیں۔ نہیں ہو گی۔

رفیعہ: (چڑ کر) یہ بھی تمہاری دھونس ہے۔ ظفر پڑھائیں نہیں۔ محمود صاحب کی آمدورفت نہیں۔ کیوں ان کے پڑھانے پر کیا اعتراض ہے آپ کو ـــــ؟ پوئٹری ان سے اچھی کون پڑھا سکتا ہے۔

ظفر: اجی ـــــ وہ ہے زمانہ بھر کا ـــــ لوفر ـــــ

سید: جی نہیں۔ یہ بات نہیں ہے (طعن سے مسکرا کر) ان سے بڑھ کر کون لوفر ہو گا۔

رفیعہ: (چونک کر) کون؟

سید: جی آپ۔ خالدہ وغیرہ وغیرہ۔

خالدہ: ہوش میں سید، تمہاری وغیرہ وغیرہ ہوں گی لوفر۔ ہم کیوں ہوتے۔

سیّد: جی نہیں، آپ تو سب سے بڑھ کر۔ خدا بچائے۔

خالدہ: (حیرت اور رنج سے) سُن رہی ہو۔

رفیعہ: سُن رہی ہوں، روز ہی سُنتی ہوں۔ سیّد تو خیر پاگل ہیں ہی مجھے تو ظفّر پر حیرت ہو رہی ہے کہ اماں جان کی بات نہیں سُنتے۔

ظفر: میں کہتا ہوں امّاں جان بچاری کو خبر بھی نہیں۔ تم دل سے بنا رہی ہو۔

رفیعہ: (آہٹ سُن کر) شِشش! لو امّاں جان خود آ رہی ہیں۔

(ظفر سگریٹ پھینک کر ٹھیک سے بیٹھ جاتا ہے۔ خالدہ جلدی سے سیّد کے پاس سے اُٹھ کر دُور بیٹھ جاتی ہے۔ پردہ کھلتا ہے اور سیاہ شیروانی اور تنگ پاجامہ پہنے غفّار داخل ہوتا ہے)

رفیعہ: (حیرت سے) ارے!

(سب زور سے قہقہہ لگاتے ہیں۔ خالدہ واپس سیّد کے پاس بیٹھ جاتی ہے ظفّر نیا سگریٹ سُلگا لیتا ہے۔ سیّد تر شروئی سے گھٹنا ہلا رہا ہے)

غفّار: (اس خاموش ایکٹنگ سے اکتا کر) کیا بات ہے بھئی؟

(سب پھر زور سے ہنستے ہیں)

سیّد: چُغد!

غفّار: (مجرمانہ انداز سے) کون؟

ظفر: اونہہ..... ہم..... سب (بات ٹال کر) تم اپنی کہو۔

غفّار: (سب کی طرف سے بے توجہ ہو کر) رفیعہ طبیعت تو اچھی ہے؟

رفیعہ: (نیم باز آنکھوں سے سیّد کو دیکھ کر لو اب کیا جواب دوں) ہاں مگر میری طبیعت تھی کب خراب؟

غفّار: میرا مطلب ہے مزاج تو اچھا ہے۔

رفیعہ: میں بدمزاج کبھی تھی ہی نہیں۔

غفّار: (ٹھٹک کر) یہ تو میں نے نہیں کہا کہ تم بدمزاج ہو۔

رفیعہ: پھر؟

غفار: (پشیمان ہوکر) میں نے تو ویسے ہی پوچھا تھا۔

رفیعہ: (دبی زبان سے) رسما۔

غفار: ہاں رسماً ہی سمجھ لو اب۔

سیّد: ارے کانٹوں کی جھاڑی سے کیوں اُلجھ رہے ہو!

(تھوڑی دیر بے تکی خاموشی رہتی ہے)

رفیعہ: (ایک دم سے) اسے ہے زعفران دینا تو بھول ہی گئی۔ میں آج شاہی ٹکڑے پکا رہی ہوں۔

سیّد: چل جھوٹی کبھی باورچی خانہ میں جھانکتی بھی تو نہیں۔

رفیعہ: تم کون سیّد؟ (چلی جاتی ہے)

خالدہ: (باغ کی طرف دروازے سے جاتے ہوئے) سیّد خدا یہاں آؤ تم سے ایک ضروری بات کہنا ہے۔

سیّد: (منہ پھلائے) کیا بات! پھر کوئی "پھڑ" و "چھڑ"...

خالدہ: نہیں نہیں تم آؤ تو سہی۔

(سیّد اُٹھ کر جاتا ہے۔ خالدہ اس کے بازو میں ہاتھ ڈال کر اُسے کھینچتی ہوئی چلی جاتی ہے)

ظفر: (جیسے خواب میں) افوہ! یہ لڑکیاں!!

غفار: کیوں، کون لڑکیاں؟

ظفر: سب لڑکیاں، ایک وایک .... سب ناگنیں ہیں۔

غفار: (غیر شاعرانہ گفتگو سے متنفر ہوکر) میں تو نہیں سوچتا۔ یہ کیوں؟

ظفر: (بہت سا دھواں ہوا میں پھیلا کر) ہوں۔ تم بے چارے سوچتے ہی کیا ہو۔

غفار: (بُرا مان کر) کیوں؟ مجھ میں بے چارے پن کی ایسی کیا بات ہے!

ظفر: یہ ..... یہ کہ تم..... تم.... جانے بھی دو اب۔

غفار: آخر کچھ کہو بھی۔

ظفر: کہوں کیا (کچھ جل کر) تم پچے ہو پچّے اور رفیعہ ناگن۔

غفار: (بگڑ کر) قطعی نہیں۔ کم از کم رفیعہ کے بارے میں تمہیں غلط فہمی ہوئی، وہ اس قدر.....

ظفر: (طعن سے جملہ پورا کر کے) بھولی ہے! کیوں؟

غفار: یقیناً۔

ظفر: (زور زور سے ہنستا ہے اور مصنوعی کھانسی کھانستا ہے) بھولی! ضرور!!

غفار: (ذرا سختی سے) تم یہ بھی جانتے ہو یہ تم کس کے سامنے کہہ رہے ہو؟

ظفر: (جل کر بھویں سکیڑ کر اسے دیکھتے ہوئے) شاید آپ کے سامنے۔

غفار: اور شاید تم یہ بھی جانتے ہو کہ ——

ظفر: کہ جناب کو رفیعہ سے محبت ہے اور اُسے چاہتے ہیں۔

غفار: یقیناً ایک فرشتہ خصلت لڑکی کے لئے ہیں.....

ظفر: رفیعہ۔ فرشتہ خصلت!

غفار: بے شک۔ کیوں نہیں..... آخر.....،

ظفر: (بات کاٹ کر اپنی تیز زبان میں) تم شاید اُن بے وقوفوں میں سے ہو جو آنکھ میچ کر ہر لڑکی کو حسین، معصوم اور نیک قرار دے دیتے ہیں (ایک دم ذرا اُٹھ کر) غفار! تمہارا ارادہ۔ میرا مطلب رفیعہ سے شادی کرنے کا ہے۔

غفار: یہ بات عرصہ ہوا طے ہو چکی۔

ظفر: تو تم ٹھکانے لگ چکے۔

(واپس کرسی پر لیٹ جاتا ہے)

غفار: (کچھ نہ سمجھ کر) یعنی!

ظفر: (تھوڑی دیر غفار کو گھور کر) اونہہ! تم نہیں سمجھتے۔ تم کچھ نہیں سمجھتے۔ تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔

غفار : نہ جانے کیا بک رہے ہو۔

ظفر : (کچھ نہ سن کر) تم نہیں جانتے ان لڑکیوں کو۔ یہ سب ۔ ۔ ۔ ۔ سب بلیاں ہیں بلیاں تم نے دیکھا ہے ایک چوہے کو بلی کیسی جھنجھوڑیاں دیتی ہے۔ کبھی اس ران کو دبایا۔ کبھی اس پنجے پر کچپلی مار دی۔ کبھی کمر میں گدگدایا ——— اور کبھی پورا ہڑپ کر گئیں۔

غفار : (متحیر ہو کر) صنف نازک کے بارے میں تمہارے بڑے لچر خیالات ہیں۔

ظفر : (جلدی جلدی) صنفِ نازک، صنفِ نازک۔ اوہ کس قدر بے معنی لفظ ہے۔ کس ——— نہ جانے کس بے وقوف نے انہیں صنفِ نازک کا خطاب دیا ہے۔

غفار : (ظفر کی بیوقوفی پر مسکرا کر) تو تمہارے خیال میں عورتیں صنفِ نازک کہلانے کی مستحق نہیں۔

ظفر : مستحق! مستحق ہونے کی خوب رہی۔ اجی یہ دنیا کے سارے آرام اور چین اٹھانے کی مستحق ہیں۔ کولھو کے بیل کی طرح جت کر ہم کام کریں۔ مر پچھاڑیں ہم۔ دنیا بھر کی آفتیں اٹھائیں ہم اور یہ صنفِ نازک بن کر ہمارے اوپر بھوت کی طرح سوار ہو جائیں اور پھر صنفِ نازک اپنی سی کرنے پر اُتر آئیں تو وہ گت بنائیں کہ جینا دشوار کر دیں۔

غفار : میرے خیالات شکر ہے کہ تم سے مختلف ہیں اور رہیں گے۔

ظفر : اور پھر انہی خیالات کے برتے پر تم رفیعہ سے شادی کرنے کا دعوےٰ رکھتے ہو (ایک دم سے) کبھی تم نے براہِ راست بھی رفیعہ کی رائے معلوم کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا مطلب ہے شادی کے بارے میں۔

غفار : ہاں مجھ سے ایک دفعہ یہ غلطی ہو گئی تھی۔

ظفر : (غصہ سے چیخ کر) غلطی! کیا آدمی ہو تم ۔ ۔ ۔ ۔

غفار : ہاں ہاں غلطی (رنجیدہ ہو کر) اس کے والد کے انتقال کے فوراً ہی بعد۔

ظفر : پھر اُس نے کیا کہا؟

غفار : کچھ نہیں، مت یاد دلاؤ ظفر، وہ میری بیوقوفی تھی۔ وہ رونے لگی۔

ظفر: (حیرت سے) رونے لگی۔

غفار: ہاں میری بیوقوفی۔ ایسے موقع پر دل دُکھانا۔

ظفر: ہوں ـــــ ضرور روئی ہوگی۔ تمہاری بدحواسیوں پر وہ بار بار رو چکی ہے۔ مگر دل دکھانے کو تم سے کس نے کہا تھا!

غفّار: دل ہی دُکھانا ہوا ایسے صدمے کے بعد۔

ظفر: (ہاتھ جھٹک کر) تو پھر تم قیامت تک کسی لڑکی کو نہیں سمجھ سکتے۔ اچھا (کچھ سوچ کر رُک رُک کر) فرض کرو رفیعہ...... کو...... رفیعہ مرجائے...... تو تم....

غفار: کم از کم میرے سامنے تو ایسی باتیں نہ کرو۔

ظفر: (دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دبا کر) اُفوہ۔ کیسے کہوں تم سے غفار (مُردہ آواز میں) ہم سب بے وقوف ہیں۔ ہم سب چوہے ہیں۔ جن سے یہ خونخوار بلیاں کھیل رہی ہیں۔ میں، تم، سید۔ سب چوہے ہیں بزدل چوہے۔

غفار: (کچھ نہ سمجھ کر) میں تو یہ نہیں سوچتا۔

ظفر: (بے چین ہو کر) چپ رہو غفار۔ تم مجھے پاگل کر دو گے۔ اوہ۔

غفار: (نہایت سکون سے) میں ذرا اماں جان کے پاس جا رہا ہوں۔ تم بھی چلتے ہو؟

ظفر: (پریشان ہو کر) تم جاؤ۔ میں ذرا دیر میں آؤں گا۔

(غفار جاتا ہے جسے ظفر رحم کی نگاہوں سے تکتا ہے۔ تھوڑی دیر سوچتا ہے پھر اُٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیتا ہے۔ دو تین کر سیوں میزوں سے بے خیالی میں ٹھوکر لگتی ہے۔ کارنس کے پاس جا کر تصویریں دیکھنے لگتا ہے۔ رفیعہ کی تصویر کو غور سے دیکھتا ہے)

ظفر: (بڑبڑاتے ہوئے) ہوں۔ غفار رفیعہ کی تصویر دیکھتا ہے۔ مگر رفیعہ کو نہیں۔ (دیر تک غور سے کبھی پاس سے کبھی دور سے تصویر کو اُٹھا کر دیکھتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کا سر تصویر کی طرف جھکتا ہے۔ رفیعہ دبے پاؤں داخل ہوتی ہے اس کی پشت سے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر دیکھتی ہے۔ ظفر تصویر پر اپنے ہونٹ لگا دیتا ہے)

رفیعہ: (اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تحکمانہ لہجہ میں) دیکھا۔ پکڑے گئے نا ـــــ!
کہو اب؟

(ظفر ایک دم مڑ کر اسے غصہ سے گھورتا ہے اور جلدی سے تصویر پیٹھ کے پیچھے کر لیتا ہے)

رفیعہ: اب تو تمہیں مجھے پڑھانے کے لئے آنے میں کوئی اعتراض نہیں۔

(ظفر ایک جھٹکے سے تصویر میز پر رکھ کر آتشدان کے پاس بیٹھ جاتا ہے)

رفیعہ: (اس کی ٹھوڑی چھو کر) بے چارا ظفر۔ بہانے کیا کرتا تھا۔ آج۔

ظفر: (اس کا ہاتھ جھٹک کر) اونہہ! تم واقعی سانپ ہو۔

رفیعہ: اور تم چھچھوندر جسے نہ میں نگلتی ہوں نہ اگلتی ہوں۔ مگر میں کہتی ہوں چھچھوندر کی دیدہ دلیری تو دیکھو سانپ کے منہ سے لگ رہی تھی۔

ظفر: (مسکرا کر) بھگت تو رہی ہے چھچھوندر اپنے اعمال کی سزا۔

(سعید کچھ بھنایا ہوا آ کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ پیچھے پیچھے خالدہ کندھوں کو ہلکی سی جنبش دیتی ہوئی داخل ہوتی ہے)

رفیعہ: آہا۔ ایک اور چھچھوندر!

ظفر: (خالدہ کو دیکھ کر) ایک اور سانپ بھی۔

خالدہ: ظفر تم کو کس نے بتایا کہ سعید نے مجھے سانپ کہا۔

رفیعہ: کسی نے بھی نہیں۔ انہیں تو وحی آتی ہے۔ بے چارے کو ابھی ابھی شہادت کا رتبہ ملا ہے۔

خالدہ: (پژمردہ ہو کر) میں سمجھتی تھی کہ سعید ہی اس قدر شاعرانہ بات کہہ سکتا ہے۔ پر اب معلوم ہوا کہ ظفر بھی۔ خیر سعید تم کبھی تو کوئی نئی بات نکالا کرو جس سے مجھے فخر کرنے کا موقع ملے۔

(سعید منہ بناتا رہتا ہے)

(رفیعہ خالدہ کے پاس جا کر اس کے کان میں کچھ کہنا چاہتی ہے)

ظفر: (بغاوت کر کے) یہ کانا پھوسی یہاں نہیں ہو گی (رفیعہ کو کھینچ کر) تم لوگ چپکے چپکے باتیں نہیں کر سکتیں۔

رفیعہ: خلّو! پھر بتاؤں گی۔ اچھا۔

خالدہ: اور میں (سیّد سے آہستہ سے) بتا دوں سیّد تمہاری شاعری؟

سیّد: (اپنی جگہ جھوم کر) بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری شاعری۔

خالدہ: رفّی (سیّد کو دیکھتی ہے) میں نے اُنہیں ایک بات کہنے کے لئے بُلایا تو یہ خود ایک بہت ضروری بات کہنے لگے۔ بولے (پیار سے) کہہ دوں سیّد؟

سیّد: (پہلی دفعہ مسکرا کر) بے حیا ہو تم دونوں۔

خالدہ: پھر اُتر آئے اپنی اوقات پر۔ پھر تم نے مجھ سے شادی کی درخواست کیوں کی تھی؟

ظفر: اچھا۔!

رفیعہ: (خوشی سے اُچھل کر) اور خلّو یہ ظفر اتنی دیر یہاں کیا کرتے رہے۔ دیکھو نا آندھی کی وجہ سے ساری تصویروں پر گرد جم گئی تھی۔ انہوں نے سا ــــ ب چاٹ کر صاف کر دی (اپنی تصویر اُٹھا کر) یہ دیکھو کس قدر چمک گئی۔ ظفر تم چاہو تو اسے گھر بھی لے جا سکتے ہو۔ اطمینان سے صاف کر لینا۔

(ظفر کھسیانہ مسکراتا ہے)

رفیعہ: نہیں لیتے۔ بس یہی تو مجھے جہالت کی باتیں کھلتی ہیں۔ اچھا کسی دن چھپا کر لے جانا۔ یہ رکھی ہے۔

(ظفر اُٹھ کر تصویر لے کر جیب میں ڈال لیتا ہے)

سیّد: رفیعہ تو تم نے طے کر لیا کہ ظفر سے شادی کرو گی؟

رفیعہ: ہاں فی الحال تو میں ظفر ہی سے کر رہی ہوں۔

ظفر: (بگڑ کر) یہ فی الحال سے تمہارا کیا مطلب! (سیّد سے) یار میں نے ایسی لڑکیاں ہی کہیں نہیں دیکھیں۔ سُنا کرتے ہیں۔ بڑی سیدھی سادی ہوتی ہیں۔

خالدہ: اوہو جیسے تم نے دیکھی بھی بہت سی لڑکیاں ہیں ۔ لے دے کر ہم دونوں ذرا ڈھنگ کے تمہیں دکھائی دیئے تو تم ہم پر ہی پیش ہو گئے اور سیدھی سادی لڑکیوں کو آج کل کون پوچھتا ہے۔ پڑی گھروں میں روٹیاں پکایا کرتی ہیں۔

رفیعہ: اور کیا سچ بتاؤ تمہیں "وہ گڈّے" پسند ہیں۔

ظفر: (مسکرا کر سید کو دیکھتے ہوئے) تم سے تو غنیمت ہی ہوں گی۔

خالدہ: (ایک دم سے) لو گویہ تو بتاؤ جب رفیعہ ظفر سے شادی کرے گی تو غفار کیا کرے گا؟

رفیعہ: (جلدی سے) وہ خودکشی کرے گا یا ہمیشہ میرے نام پر کنوارا بیٹھا رہے گا۔

ظفر: کس قدر اتراتی ہو تم۔

خالدہ: بھئی یہ تو عجیب گڑبڑ ہے۔ میرے خیال میں اُسے کل معاملات سے آگاہ کر دیا جائے میں اُسے سمجھا دوں گی ابھی بلاتی ہوں۔ (اُٹھتی ہے)

ظفر: (گھبرا کر) بھئی میں جا رہا ہوں۔

خالدہ: نہیں۔ تمہیں یہیں رہنا چاہیئے۔ ورنہ پھر پورا مرحلہ طے نہ ہو گا۔

سیّد: ہٹو جی سب واہیات ہے۔ چلو جی ظفر یہ دونوں فساد پر تُلی ہوئی ہیں۔

رفیعہ: اگر تم دونوں چلے جاؤ گے تو بھئی میں صاف مکر جاؤں گی۔

سیّد: (ایک دم مڑ کر) یعنی؟

رفیعہ: یعنی یہ کہ تم پھر مجھ سے نہ کہنا کہ غفار کو دھوکا دیا۔

سیّد: اور تم دھوکا دو گی۔

رفیعہ: اور کیا۔ ورنہ تم مت جاؤ۔

سیّد: خیر اس میں بھی تمہاری کوئی چال ہے (بیٹھ جاتا ہے) بیٹھو بھئی ظفر۔

خالدہ: تو میں غفار کو بلانے جاتی ہوں (چلی جاتی ہے)۔

سیّد: ظفر تم نے فیصلہ کر ہی لیا کہ رفیعہ سے شادی کرو گے۔

ظفر: میں شادی کر رہا ہوں یا رفیعہ مجھ سے شادی کر رہی ہے، چہ خوش!

سید: ہاں وہ ایک ہی بات ہوئی۔

ظفر: ایک ہی بات کیسے ہوئی؟ چھچھوندر سانپ کو نگلتی ہے یا سانپ چھچھوندر کو؟ اب تو یہ سانپ ہی جانے کہ وہ چھچھوندر کو نگلے گا یا یونہی چباتا رہے گا۔

رفیعہ: بالکل غلط۔ سانپ چباتا کب ہے اس کے دانت ہی نہیں ہوتے۔

ظفر: تم دانتوں والا سانپ ہو۔

(ہاتھ سے جسامت بتاتا ہے)

رفیعہ: دیکھو سید، اب یہ ظفر ہی بات نکال رہے ہیں۔

(خالدہ اور غفار آتے ہیں)

خالدہ: لو ایک اور چھچھوندر۔

رفیعہ: (جلدی سے) دیکھو غفار ظفر مجھے سانپ کہہ رہے ہیں۔

غفار: (بے وقوفی سے) یہ کیوں؟

ظفر: یہ یوں کہ یہ سانپ ہے ہی جو۔

(لڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے)

غفار: (بیٹھ کر) یہ ظفر تمہاری غلطی ہے۔

ظفر: (جل کر) اور تمہاری بے وقوفی! رفیعہ جس شخص سے شادی کرے گی اس بدنصیب کو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا ہم لوگ ابھی یہی سوچ رہے تھے۔

رفیعہ: (بناوٹی رنج سے) اوہ! مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اس قدر خوفناک ہوں۔

غفار: بالکل غلط۔ میں تمہیں خوفناک بالکل نہیں سمجھتا۔

(ایک دم موضوع کے چھڑ جانے سے گھبرایا ہوا ہے)

رفیعہ: نہیں میں تمہاری زندگی برباد نہیں کروں گی۔

غفار: (جوش سے) برباد نہیں۔ تم میری زندگی آباد کرو گی۔

رفیعہ: نہیں میں تمہیں نگل جاؤں گی۔ سانپ ہی جو ٹھہری۔

غفار: (شدت جوش سے کانپ کر) کیسی باتیں کرتی ہو۔ تم مجھے نگل بھی جاؤ تو بھی میرے لئے عین راحت ہے۔

خالدہ: مگر اب تو رفیعہ نے فیصلہ کر لیا۔

غفار: (چونک کر) کیا فیصلہ کر لیا۔

خالدہ: یہی کہ وہ تمہیں نہیں نگلے گی۔

رفیعہ: ہاں اب تو میں ظفر کو نگلوں گی۔ یہ ہے تو پھر یہی سہی۔

(ظفر پریشان ہو کر مسکراتا ہے)

غفار: (سمجھ کر) تو . . . تو تمہارا یہ مطلب ہے کہ مجھے ٹھکرا رہی ہو۔

رفیعہ: اوہنہ! اب تم نے بھی غلیظ شاعری شروع کر دی۔

غفار: (پریشانی سے انگلیاں چٹخا کر) اور ظفر تم مجھے دھوکا دیتے رہے۔

ظفر: غفار بچے نہ بنو۔ یہ فتنہ تمہارے بس کا نہیں تھا۔ شکر کرو کہ میرے ہی اوپر بیتی اور تم بچ گئے۔ تم دیکھنا وہ میری گت بنائے گی کہ تو بہ ہی بھلی۔

غفار: کاش میری ہی وہ گت بن جاتی۔

خالدہ: مگر غفار سوچو تو ——

غفار: ایک عرصہ دراز سے یہ بات بزرگوں نے طے کر دی تھی۔

خالدہ: یہ بات تو ٹھیک ہے کہ آبائی حق تو تمہارا ہے۔ مگر یہاں تو رفیعہ کا معاملہ آن پڑا ہے۔ وہ ایک ضدی ہے۔

غفار: (اندوہ گیں ہو کر) بس —— جا رہا ہوں (نہایت اداسی سے) رفیعہ! خدا کرے تم خوش رہو۔

(کھڑا ہو جاتا ہے)

ظفر: مجھے کوئی دعا نہیں دیتا (بڑبڑا کر) جیسے رفیعہ کو بڑی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ لوگ مجھے دعا نہیں دیتے۔

رفیعہ: (غفار کے پاس جا کر پیار سے) غفار تم غصہ تو نہیں ہو؟

غفار: (غصّہ سے) نہیں۔

رفیعہ: اور رنجیدہ!

غفار: (رقت سے) نہ رنجیدہ۔

رفیعہ: (ایک دم اس کا حسین چہرہ ہاتھوں میں لے کر بڑی محبت سے دیکھتی ہے) تم بڑے پیارے ہو غفار تم نہیں جانتے مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔

سیّد: (تنبیہاً) پھر پھیلایا جال۔

رفیعہ: (ویسے ہی اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے) تم کون ہوتے ہو سیّد بیچ میں بولنے والے۔ (غفار سے) میں تمہیں بچپن سے پسند کرتی ہوں۔ بہت ہی پسند کرتی ہوں۔

(ظفر متحیّر آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا ہے)

غفار: (اُمید بھری آواز میں) رفیعہ!

رفیعہ: (بڑی رومینٹک آواز میں) ہاں۔

غفار: (اُس کے بازوؤں پہ ہاتھ پھیر کر) تم نے ابھی کہا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔

رفیعہ: ہاں اور ہمیشہ اسی طرح محبت کرتی رہوں گی (اس کا منہ قریب کر کے) تمہیں یاد ہے غفار بچپن میں میں کس قدر تمہاری شرارتیں پسند کرتی تھی۔

سیّد: جھوٹی۔ غفار نے کبھی شرارت کی ہی نہیں۔

غفار: (سیّد کی پروا نہ کر کے جوش سے) تو پھر —— تو پھر —— رفیعہ!

رفیعہ: ہاں۔ پھر اب میں نے فیصلہ کر لیا —— کہ ظفر سے شادی کرنے کے بعد میں فوراً تمہیں گود لے لوں گی —— کیوں ظفر! (اُس کا چہرہ جھکا کر پیار کرنا چاہتی ہے)

(ظفر ایک دبی ہوئی اطمینان کی سانس لیتا ہے اور آرام کرسی پر لیٹ جاتا ہے)

غفار: (جسم میں ایک دھکا سا محسوس کرتا ہے اور خاموش دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے) سانپ!!!

(بغیر دوسری نگاہ ڈالے ایک دم پہلے دروازہ سے نکل جاتا ہے)

رفیعہ: (حیرت سے مسکراتے ہوئے اپنے خالی ہاتھ دیکھتی ہے) ارے!

(ظفر، سعید اور کچھ کچھ خالدہ بھی حیرت سے منہ پھاڑے بیٹھے ہیں)

ظفر: (گھٹی ہوئی مردہ آواز میں) سانپ!!!

فسادی

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

افرادِ ڈرامہ

عزت: بائیس سالہ لڑکی۔ صندلی رنگ ۔معمولی نقشہ۔ بھولا بھالا چہرہ کسی قدر حسین۔ بہت جلد ہر بات کا یقین کر لیتی ہے۔ ذرا ڈرپوک اور دوسروں پر بھروسہ کرنے والی، زود رنج۔

الماس: بیس سالہ گوری چٹی تندرست لڑکی۔ طبیعت میں چلبلا پن۔ ناک پر غصّہ بات بات پر روٹھنا اور آنسو بہانا۔ بول چال بند کرنے کی عادت۔ گانے کی شوقین خوش آواز عزت کی چچا زاد بہن۔

ایاز: دبلے پتلے، تیکھے نقشہ، متانت اور سنجیدگی کا مجسمہ، زود رنج مگر صابر۔ کم سخن جلد گھبرا جانے والے، گورنمنٹ میں اچھے عہدے پر، تازہ تازہ تقرر ہوا ہے۔ عزت کے بچپن کے منگیتر، الماس کے بھائی۔

نشاط: اٹھارہ اُنیس برس کا جوان جو صرف پندرہ برس کا لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ نحیف آواز کا بیمار۔ سفید رنگ۔ مگر بلا کی چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں اور غضب کا چرب زبان اور خوش مزاج۔ نچلا نہیں بیٹھنے دیتا۔ ایاز کا چھوٹا بھائی۔

حورا: دس گیارہ برس کی موٹی تازی سُرخ وسپید لڑکی۔ ہر وقت اتراتی اور اماں کے لاڈ کی وجہ سے بِھڑکتی رہتی ہے۔

جگنو : آٹھ برس کا بچّہ ۔ لڑاکا اور شریر ۔ بُری طرح چھیتا اور بات بات پر لڑتا ہے ہر وقت کھاتا رہتا ہے ۔

امّاں جان : چالیس پینتالیس سالہ بھاری بدن کی بیوی ۔ بہت غصیل ۔ ڈھیل ڈھال ۔ اور دبنگ آواز ۔ ذرا چالاک ، بے وقوف ۔ سمجھنے سے پہلے غصّہ ۔ پھولی ہوئی سانس معذور ۔

محمود : خوش وضع ، جوان ، سانولا ، تندرست اور ہنس مکھ ، بے فکر ، تیل کا سوداگر ۔ خوب امیر ۔ الماس کا منگیتر ۔

موسم : آخری جاڑے ۔

زمانہ : بس یہی ہمارا اور آپ کا ۔

پہلا سین

(عزّت کا کمرہ ۔ ایک کشادہ کمرہ جو ایک پلنگ ، چند کرسیوں اور زمین پر چاندنی اور قالین کے فرش سے مزیّن ہے ۔ ایک کونے میں چوکی ہے ۔ دو تین صندوق بھی ہیں ۔ جن پر سلیقہ سے جا نماز یا کوئی کپڑا بچھا ہوا ہے ایک کونے میں ایک لمبی سی کوچ جس کے پاس ہی کھڑکی ہے جس میں ایک چائے کی پیالی رکھی ہے ۔ عزّت کوچ پر اس طرح لیٹی ہے کہ دونوں گھٹنے پیٹ میں اڑے ہوئے ہیں اور کوئی کتاب غور سے پڑھ رہی ہے ۔)

ایاز : (خاموشی سے کمرے میں داخل ہو کر نرمی سے) عزّت میں نے تمہیں بارہا منع کیا ہے کہ اس طرح روشنی کی طرف پیٹھ کر کے نہ پڑھا کرو ۔ مگر ۔ ۔ ۔

نشاط : (صوفہ کے قریب والی کھڑکی سے چڑھتے ہوئے جملہ پورا کرتا ہے) تم مانتی ہی نہیں ۔

ایاز : (نشاط کی طرف ایک دم مڑتے ہوئے) نشاط احمد میں نے تم کو بارہا منع کیا ہے کہ اس طرح اُچکّوں کی طرح کھڑکیاں اور دریچے نہ پھلانگا کرو ۔ مگر ۔ ۔ ۔

عزت: (آہستہ سے) تم مانتے ہی نہیں۔

نشاط: قبلہ بھائی جان میں نے آپ کو بارہا منع کیا ہے کہ مجھے یہ اسمی مجموعہ نشاط احمد قطعی پسند نہیں۔ مگر آپ ہمیشہ۔ نشاط "احمد" ہی کہتے ہیں آپ مانتے ہی نہیں۔

الماس: (جوّلی کا ہاتھ پکڑے داخل ہو کر) ہم ایک دوسرے کا کہنا بالکل نہیں مانتے۔ یہ جوّلی اپنے بھورے جوتے پر سیاہ پالش کئے بغیر نہیں مانتا ذرا دیکھیے گا آپ کے جوتے کیسے بیہودہ رنگ کے ہو گئے ہیں۔

(جوّلی اترا اترا کر پاؤں چھپانا چاہتا ہے اور اس کوشش میں اپنے نیکر کو سیاہ انگلیوں سے میلا کر رہا ہے)

ایاز: ارے جوّلی (ناصحانہ انداز میں) چچ چچ! اتنے بڑے ہو گئے اور اتنے بدتمیز۔ توبہ۔ توبہ!

نشاط: (چاء کی چھوٹی پیالی ایاز کے سامنے کرتے ہوئے) ذرا پہلے ان محترمہ عزت کو دیکھئے یہ "سگھڑاپا" ہے۔ جوّلی بچارا تو خیر بچہ ہے اور یہ مکرمہ تو ماشاء اللہ.....

عزت: (شرمندہ ہو کر) تو اس میں کیا پھوہڑپنا ہے؟

نشاط: (طعنہ سے) جی! یہ تو مہا سگھڑاپا ہے (ایاز سے) بھائی جان! قسمت پھوٹی بھو۔ جوّلی غریب کو ڈانٹ رہے ہو اور عزت صاحبہ کو کچھ نہیں کہتے۔ وہ بچارا چھوٹا جو ہے۔ مت رو جوّلی چچ چچ۔ بے چارا روتا بھی تو نہیں۔ مت رو.....

(جوّلی اپنی دردناک حالت کا احساس کر کے واقعی رونے لگتا ہے)

نشاط: (چمکار کر) مت رو۔ غریب کو ابھی تو بخار آیا تھا جب بے چارے کے سوئیاں لگی تھیں اور اب ڈانٹ پڑ رہی ہے۔ کیا کرے۔

(جوّلی زور سے روتا ہے۔ ایاز کچھ کھسیانا کچھ جھنجلایا کھڑا ہے۔ عزت مسکرا رہی ہے۔ الماس کچھ غضب ناک کچھ پریشان)

الماس: (ایاز سے) واہ بھائی جان اتنا کیوں ڈانٹتے ہیں (جوّلی کو پکڑ کر لے جاتی ہے)

ایاز: نشاط تم بڑے وہ ہو۔ آخر ان باتوں سے فائدہ؟

نشاط: (مُسکراتا ہوا عزّت کے بہت پاس گھُس کر بیٹھ جاتا ہے) ہاں تو بھائی کیسے آپ کی قسمت پھُوٹی یار ہی؟

ایاز: (جل کر) چُپ رہو نشاط (بڑے بڑے ڈگ بھرتے چلے جاتے ہیں)

نشاط: (عزّت کے اور قریب سرک کر) عزّت آپا!

عزّت: نشاط بھئی ذرا ہٹ کر بیٹھو (ذرا ہٹ جاتی ہے)

(نشاط پھر قریب گھُس کر بیٹھ جاتا ہے)

عزّت: اوہنہ اکھا لیا نشاط تم نے تو (اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

نشاط: (فوراً کرسی کے ہتّے پر بیٹھتے ہوئے) ابھی کہاں کھایا - ابھی تو چبا رہا ہوں۔

عزّت: (دھکیلتے ہوئے) ہٹ بھئی یہاں سے۔

نشاط: تُو خود ہٹ یہاں سے۔

عزّت: دیکھو نشاط - میں تم سے بڑی ہوں۔ خبردار جو "تو" کہہ کر بولے۔

نشاط: جی ہوئیں بڑی - ایسے بڑے بہت دیکھے ہیں۔

عزّت: بدتمیز کہیں کا - میں تجھ سے بہت بڑی ہوں - چار برس کے قریب۔

نشاط: ہوا کرو - مگر عقل تو نہیں ہے۔

عزّت: (جل کر) تم تو بس نہ معلوم عقل کے پُتلے ہی ہو نا۔

نشاط: پُتلی وُتلی ہوگی تم - ہم تو سیدھے آدمی ہیں۔

عزّت: ہو گے۔

نشاط: ہو گے کیا - ہیں ہی "بہ مستقبل کی چیزیں"، تم ہی ہو - تم ہی اس آسرے پر ہو کہ نہ معلوم کیا کیا ہو گی - ایاز کی بیوی ہو گی —— میری خدا نہ کرے بھاوج ہو گی —— رم سرنا کی ......

عزّت: (تھپڑ مار کر) بس چُپ اُلّو کہیں کا - زبان ہے قینچی۔

نشاط: دیکھو اگر ہم ماریں گے تو اپنی بزرگی لے کر آؤ گی۔

عزّت: بھئی نشاط کیوں دق کرتے ہو - جاؤ نا۔

نشاط: ہوں۔ اور جب غرض پڑتی ہے تو؟

عزّت: بھیا میرا دماغ مت چاٹ۔ خدا کے واسطے جا۔ یا اللہ!

نشاط: (طعنہ سے) یا اللہ۔ بے چاری کو اپنا گھر یاد آ رہا ہے۔ وہاں تو کوئی بھی دماغ نہیں چاٹتا۔ مت رو۔ ہم اب تجھے دق نہیں کریں گے۔

عزّت: پھر وہی تو تڑاق۔ نشاط مہربانی سے میرے کمرے میں سے نکلو۔ ورنہ۔۔۔۔

نشاط: کیا کیا۔ ورنہ۔۔۔ لم ٹنگو سے شکایت کر دو گی۔

عزّت: (چڑ کر) ہائے خدا۔ تم نہیں جاؤ۔ میں خود ہی غارت ہو جاؤں گی۔

نشاط: بسم اللہ۔

(عزّت بھناتی ہوئی جاتی ہے)

نشاط: اچھا نہیں۔ اب نہیں عزّت آپا (جھک کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) آپا! آپا!! (آہستہ سے پیار کر لیتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ لیکن دروازے سے ہی لوٹتا ہے) ارے سنو تو عزّت!

عزّت: (دھیان نہ دیتے ہوئے) کیا ہے بھئی؟

نشاط: سنو، کیا تمہیں یہ لم دراز خاں پسند ہیں؟

عزّت: (جھنجھلا کر) کون لم دراز خاں؟

نشاط: (ہاتھ نچا کر) کیسی بنتی ہو۔ ارے وہی جو تمہارے گلے پیدا ہوتے ہی باندھ دیئے گئے۔ چڑی کے غلطے کی شکل، کیا خوب نام ہے۔ ایاز! غلطے!

عزّت: (ہنسی کو دباتے ہوئے) اپنی تو شکل دیکھو۔ سوئے جیسی ناک۔ مرتنگڑے کہیں کے۔

نشاط: مجھ غریب کی تو ناک آنکھ کا سوال ہی نہیں۔ مگر پھر بھی خاکسار کی ناک ان کی بٹے جیسی ناک سے بدرجہا بہتر ہے۔ کیوں جھینپتی ہو۔ کہہ دو، "قائل ہو گئی" ناک واقعی خطرناک جسامت کی ہے۔

عزّت: کوئی نہیں۔

نشاط: ارے، ہم خوب جانتے ہیں۔ وہ خود تم سے نفرت کرتے ہیں۔ اجی وہ کیا تم پہ مرتے ہیں۔

وہ تو چچی جان کا دل رکھنے کو مجبوراً تمہیں قبولیں ہی قبولیں۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ورنہ ان کی تو کالج بس مس پر بھا کر سے بہت ہی۔۔۔۔

عزت: (بے طرح ذلیل ہو کر) تو یہاں کون مرتا ہے ان کے لئے۔ ان کی مس پر بھا کر ہوں یا کوئی ہوں۔

نشاط: بھئی چچی جان کی دل شکنی کا خیال ہے۔

عزت: (خودداری سے) معاف کیجئے، چچی جان کا دل خاک نہیں ٹوٹے گا۔ وہ ہزار دفعہ انکار کر دیں۔ اونہہ!

نشاط: جی معلوم ہے بس رہنے دیجئے۔

عزت: نشاط! (غصّہ سے کھڑی ہو جاتی ہے)

نشاط: عزت! (کھڑکی والے صوفے پر دراز ہو جاتا ہے)

(عزت کتاب اٹھا کر ساڑھی سنبھالتی ہوئی تیزی سے باہر نکلنے کے لئے بڑھتی ہے دروازے پر گھبراتے ہوتے ایاز سے ٹکر ہو جاتی ہے کھسیانی ہو کر لوٹ آتی ہے)

(نشاط منہ اور ناک بچوں کی طرح چھپا چھپا کر ہنستا ہے)

ایاز: عزت تمہارا قلم ملا؟

عزت: (نرمی سے) نہیں۔ نشاط کہتے ہیں۔۔۔۔ (نشاط کھڑکی میں کود جاتا ہے) کہ انہوں نے آپ کو دے دیا۔

ایاز: مجھے۔ ارے!۔۔۔۔ ارے بھئی نشاط۔۔۔۔۔۔ لو وہ غائب ہو گیا۔ نشاط احمد۔۔۔۔!

(دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے)

نشاط: (کھڑکی میں نیم دراز) ہوں۔۔۔۔۔۔ (معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے) کر دی شکایت اپنے چہیتے سے! (ہاتھ چلا کر) کیا کر لیا انہوں نے۔ بڑے۔ گولی ہی تو مار دی نا؟

عزت: (مجرمانہ لہجہ میں) میں نے شکایت تو نہیں کی تھی۔

نشاط: (منہ بنا کر) "میں نے شکایت تو نہیں کی" بڑی معصوم بنتی ہیں۔ کون مسخرہ اُن سے ڈرتا ہے (اندر آ کر) جاؤ سو مرتبہ شکایت کرو۔ نہیں دیتے قلم۔ کر لو کچھ۔

عزت: بلا سے نہ دو۔ مگر میری جان چھوڑ دو (بے تو جہی سے پڑھنے کی کوشش کرتی ہے)

ایاز: (دروازے سے) ارے نشاط! تم نے مجھے تو عزت کا قلم نہیں دیا۔

نشاط: (مصنوعی حیرت سے) نہیں دیا۔ ارے تو شاید عزت آپا کو دیا ہوگا۔ میں نے دیا کسی کو ضرور ہے۔

(عزت نشاط کی مکاری پر حیرت سے مسکراتی ہے)

(جولی دوڑتا ہوا آتا ہے اور ایاز کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتا ہے حورا ننّھی گڑیاں ٹھنکتی ہوئی پیچھے پیچھے آتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو کھسوٹنے لگتے ہیں)

نشاط: ہیں ہیں۔ ارے حورا دیکھ ... بس ... بس ... دوست جولی بھئی آپ کے مارا اور ہم نے تمہیں ٹھونکا۔ ارے بس۔ یا۔ آ۔ ... آ ... س

(بیچ بچاؤ ہو جاتا ہے)

ایاز: تم دونوں کیوں لڑ رہے ہو؟

حورا: پہلے اس نے ... آں ... آں ... وہ بورڈ اُلٹ دیا ... اور لے کے ...

جولی: (تیزی سے) ہے گپّن ... خود تو مارا ... آپی تو اُلٹا ... اور جھوٹا نام ہمارا لگا رہی ہیں۔ ہم نے تو ... واہ ... آں ...

حورا: نہیں۔ نہیں۔ ہم اسے مار کے رہیں گے۔ چاہے کچھ ہی ہو جائے۔ اس نے مارا ہی کیوں (جھپٹتی ہے)

نشاط: (دونوں کو علیحدہ کرتا ہے) ارے رے رے کیوں کھائے لیتے ہو۔

امّاں جان: (ایک غمناک چنگھاڑ سنائی دیتی ہے) ارے یہ کیوں حورا ڈکرا رہی ہے۔ ہیں۔ (سانس پھولی ہوئی دروازہ میں نظر آتی ہیں) میں کہتی ہوں ... یہ ...

حورا : اماں...... ں- یہ جولی نہیں مانتا......(دُکھ بھری آواز سے روتی ہے)

نشاط : بیٹا جولی آگئی تمہاری موت سالڑو (چٹکی بجاکر) چل...... بھاگ........

(جولی تیر کی طرح دوسرے دروازہ سے غائب۔ اماں جان حورا کو گھسیٹتی اور سارے گھر پر بڑبڑاتی چلی جاتی ہیں۔ ایک سکون سا کمرے پر چھا جاتا ہے۔ گویا مطلع صاف ہوگیا)

دُوسرا سین

(نشاط کا کمرہ۔ ایک پلنگ پر نشاط چادر اوڑھے لیٹا ہے۔ آہٹ پر سوتا بن جاتا ہے۔ عزت دبے پاؤں آتی ہے اور آہستہ آہستہ تازہ اخبار کے ورق اُلٹنے لگتی ہے۔ دوسرا دروازہ آہستہ سے کھلتا ہے اور ایاز پنجوں کے بل داخل ہوتا ہے اور عزت کی پُشت پر سے جُھک کر اخبار دیکھنے لگتا ہے۔ عزت چونکتی نہیں۔ ایاز کا بایاں رخسار عزت کے بالوں سے چھُو رہا ہے اور عزت کے میز پر رکھے ہوئے ہاتھ سے ناخن سے ایاز نادانستہ کھیل رہا ہے۔ ایاز کچھ جُھک کر کان میں کہتا ہے۔ جس کا جواب عزت بہت آہستہ سے دیتی ہے۔ دونوں مُسکراتے ہیں۔ ایاز کچھ اور کہتا ہے جس کا جواب عزت صرف نظروں سے دیتی ہے۔ نشاط کی چمکیلی آنکھ بار بار جھپک رہی ہے۔ کبھی ایک کبھی دوسری۔ الماس کے بھاری قدموں اور گنگنانے کی آواز آتی ہے۔ ایاز اسی دروازہ سے واپس چلا جاتا ہے۔ الماس ایک کھٹکے کے ساتھ داخل ہوتی ہے)

نشاط : افوہ...... (گویا الماس کے گانے سے بیدار ہوا ہے) اونہوں، دماغ اُڑا دیا۔ بھئی آپا کئی دفعہ کہا کہ خدا کے واسطے یوں نہ لہکا کرو۔ جگا دیا لے کے۔

الماس : (مجرمانہ مگر مُسکرانے کے انداز میں) لو...... واہ میں نے کیا کیا (سُر پھر ہلکی لہروں میں شروع کر کے)

نشاط : (اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے) ارے آپا تم نے جگا دیا۔ شکر ہے...... ورنہ آج تو ختم ہی ہوگئے تھے۔

الماس: کیوں (گیت برابر نہایت مُردہ سروں میں جاری ہے)

نشاط: بڑا ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا کیا دیکھا کہ میرے کمرے میں ایک چڑیل گھس آئی اور کاغذوں کو کھڑ بڑ کھڑ بڑ کرنے لگی۔ اتنے میں ایک بھوت آ گیا اور دونوں میں وہ خناؤں خناؤں لڑائی ہوئی کہ خدا کی پناہ ... اتنے میں تم نے گانا شروع کر دیا۔

(عزت سب کچھ سمجھ کر گویا سُنا ہی نہیں)

الماس: (کچھ نہ سمجھ کر) ہٹو ..... جنے کیا بک رہے ہو۔

نشاط: سچ کہتا ہوں آپا! تمہارے بابو جی کی قسم!

الماس: (ذرا تنگ کر) ذرا ہوش میں ــــ کون میرے بابو جی!

نشاط: ارے خدا کے لئے آپا بیچارے بابو جی کو نہ بھول جانا ورنہ بے موت مر جائیں گے ارے وہی تمہارے وہی تمہارے والے بابو جی، وہی جن کے پاس صرف ایک پتلون ہے جو کہ پہلے سفید تھی مگر اب نہایت رشک کشمشی رنگ کی ہوتی جارہی ہے۔ لو۔ اب بھی نہیں سمجھیں! وہی جو تیل بیچتے پھرتے ہیں۔ بابو محمود خاں تمہارے منگیتر۔ آپا مار ڈالے گا۔ یاد رکھنا بھوکا رکھے گا کنجوس۔

الماس: (بے طرح چراغ پا ہو کر) واہ۔ جیسے خود تو بڑے لاٹ صاحب ہونا ــــ بڑے رئیس اعظم گھر کے۔ وہ تیل کے مرچنٹ ہیں ..... بیچتے پھرتے ہیں۔ ..... ہُنہ .....

نشاط: چولہے میں ڈالو اس تیل والے کو۔ بڑا کنجوس ہے۔ ایک سگریٹ نکال لو تو فوراً کھٹ کھٹ گن لے گا۔ آپا ایک ساڑھی بیس سال پکڑوا دے گا۔ بڑا گرو ہے وہ چالاک!

الماس: (جل کر) تم خود بھاڑ میں جاؤ ..... اُتو ..... (بھناتی ہوئی چل دیتی ہے)

عزت: (جاتے ہوئے) تو یہ ہے نشاط۔ بیچاری الماس کو خفا کر دیا۔ محمود تو ایسا اچھا آدمی ہے۔

نشاط: تو پھر تم محمود سے ہی کیوں بیاہ نہیں کر لیتیں؟ چھوڑو ان سارس صاحب کو!

عزت : (اپنی آفت آتی دیکھ کر) نشاط تمہاری عقل تو خراب ہو گئی ہے۔

(تیزی سے چلی جاتی ہے۔ نشاط زور کا قہقہہ لگاتا ہے)

تیسرا سین

(عزت کا کمرہ۔ عزت کرسی پر بیٹھی آگے پیچھے جھول رہی ہے۔ تصویروں کا ایک البم گھٹنوں پر کھلا رکھا ہے۔ نشاط مقررہ کھڑکی سے چڑھتا ہے)

نشاط : (کھڑکی میں سے گلدان ایک طرف پھینکتے ہوئے) یہ راستے میں کیا کھڑاک لگا رکھا ہے ؟

عزت : یہ راستہ ہے۔ بندروں کا راستہ کھڑکیاں اور روشندان ہوتے ہیں۔

نشاط : اور اونٹ کا ؟

عزت : (فوراً سمجھ کر جلتے ہوئے) کیسا اونٹ !

نشاط : اب الماس کی طرح آپ غریب اونٹ کو بھی بھول گئیں !ـــــ دلاؤں یاد !

عزت : نشاط جاؤ۔ بس فوراً جاؤ۔ چلو۔ میں تمہاری ایک بات نہیں سنتی۔

نشاط : (بہت ہی قریب ہو کر بیٹھتے ہوئے) یہ لو (ایک کتاب دیتا ہے)

عزت : (سب بھول کر) ارے کہاں سے لائے ؟ (ہاتھ بڑھاتی ہے)

نشاط : (رکھائی سے) کیسی مطلبی ! ارے منہ دھو جا کے پہلے لکس سے۔ پھر آنا۔

عزت : (ذرا ہٹ کر) اتراتے کیوں ہو۔ کہاں سے ملی ؟

نشاط : (کتاب دیتے ہوئے) کہاں سے ملی ؟ تمہیں کیا اس سے۔ اجی سارے شہر میں ڈھونڈی۔ لائبریری سے ملی۔ سارا دن سائیکل پر رگڑا ہوں۔ تب ہاتھ آئی ہے۔ تمہارے وہ (کنڈھے جھکا کر منہ چڑاتا ہے) بھلا تمہارے لئے اتنا دوڑتے۔ خیر۔ ان کی کیا۔ وہ تو بچارے مجبور ہیں۔ میں نے مس پربھاکر کو دیکھا ہے اس قدر اسٹائیلش لیڈی ہے کہ بس کیا بتاؤں۔

عزت : اونہہ۔ ہوا کرے ہیں۔

نشاط : جی ہاں۔ ہوا کرے ہیں۔ اب تو غریب بھائی جان کی قسمت پھوٹ ہی گئی۔ چچی جان کا

دل رکھنے کو.....

عزت: نشاط میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ کسی کا دل نہیں توڑا کرتا۔ معاف کرنا میری اماں ایسی گری پڑی نہیں ہیں چچی نے ہی خوشامد کی تھی۔

نشاط: ہاں ہاں میں کب کہتا ہوں..... چچی ہی تو اپنے بیٹے کی دشمن ہیں۔ سچ کہتا ہوں اماں جان بھائی جان سے بہت کم محبت کرتی ہیں۔

عزت: (اپنی ہتک کی انتہا محسوس کرتے ہوئے) ایاز میں ایسے کون لعل جڑے ہیں۔ کیا دنیا میں کوئی دوسرا ہے ہی نہیں!

نشاط: بے شک بے شک۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تم خود اُن سے نفرت کرتی ہو۔ "دوسرا" بے شک ان سے بہتر ہے (اپنے سینے پر انگلی رکھتا ہے)

عزت: (اس کا مطلب سمجھ کر ہنستی ہے) چل بدتمیز۔

ایاز: (حورا کا ہاتھ پکڑے آتا ہے) عزت ابھی آج فلم دیکھنے چلو گی؟

نشاط: آپ کا حکم اور یہ نہ مانیں مجال نہیں۔

ایاز: (اپنے مطلب کو اُلٹے معنوں میں لیتا دیکھ کر) میرا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ ضرور ہی جائیں۔

نشاط: (معنی خیز لہجہ میں) ہاں کوئی خاص ضرورت تو نہیں۔ مس پرِیما کر جائیں گی؟

ایاز: (مسکرا کر) ہاں شاید۔ مجھے ٹھیک نہیں معلوم۔

(عزت کا چہرہ تمتما جاتا ہے)

ایاز: بھئی حورا نے مجبور کیا ہے کہ اس فلم میں ان کی روحانی دوست مِس آکی کام کر رہی ہے۔ لہٰذا وہ ضرور جائے گی۔

نشاط: بھئی عزت تو جائیں گی۔ میرا کچھ ٹھیک نہیں۔

عزت: (بھی آج ایاز میں) جی نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔

ایاز: (عزت کے لہجہ سے چونک کر) کیوں؟ آخر وجہ!

عزت: (کڑک کر) اپنا دل۔ کیا کوئی زبردستی ہے؟

ایاز: (چڑھ کر) زبردستی کی نہ ضرورت، نہ کسی کو شوق۔ ہر ایک کو اپنے اوپر پورا اختیار ہوتا ہے۔

عزّت: ہوتا نہیں ہے بلکہ ہے۔

نشاط: بھئی میرے پاس تو ایک پائی بھی نہیں جو سینما جاؤں۔

حورا: (چونک کر ایاز سے) بھائی جان میری پائی۔

ایاز: ارے.... تم ہی کو تو دے دی تھی...... یہیں تو تھی...... میں ابھی تو اُچھال رہا تھا۔

حورا: واہ۔ ہمیں نہیں دی۔ ہماری پائی (ٹھنکتی ہے)

ایاز: (ڈھونڈھتے ہوئے) ارے بھئی نہ معلوم کہاں گئی۔ ابھی تو تھی۔ اچھا حورا، ہم دوسری لادیں گے۔

حورا: (مچلنے کی دھمکی دیتے ہوئے) آں..... آں ہم تو وہی سی لیں گے۔ اپنی چمکتی ہوئی۔

نشاط: نہیں بھئی حورا ضد نہ کرو۔ بے کار ہے۔ اب تو وہ جھمجھاتی ہوئی تمہاری عمدہ والی کھو گئی۔ اب تم کالی ہی لے لینا۔ دوسری..... کالی...... مت رو..... غریب چھنتی بھی تو نہیں۔ ہائے کیسی چمکیلی تھی جیسے ستارہ۔ امّی نے صبح سے زمین پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر چمکائی تھی۔ چپ رہ حورا۔

حورا: (دردناک آواز میں دھاڑتی ہے) آں ہماری پائی۔ ہم تو آپ سے لیں گے۔

ایاز: کہتا تو ہوں کہ دوسری لادوں گا۔

نشاط: مگر اس چمکتی ہوئی کو کیسے بھولے۔ خیر اب وہ کالی ہی لے لے گی۔ لے لو حورا کالی کلوٹی ہی لے لو...... (چمکارتا ہے۔ حورا دھاروں دھار روتی ہے۔ ایاز پریشان کھڑا ہے)

امّاں جان: (دبنگ آواز سنائی دیتی ہے) ارے یہ کون حورا کو مارے ڈالتا ہے۔ چین نہیں لینے دیتے (دروازے میں سے) یہ کیا قصہ ہے (دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کے)

میں کہتی ہوں میری قسمت کا چین ہی اڑ گیا ہے ہوا کیا؟

نشاط: (جلدی سے) اماں جان حورا کی چمکتی ہوئی پائی بھائی جان نے کھیلتے کھیلتے نہ معلوم کہاں کھو دی۔ اب اُسے کالی دے رہے ہیں وہ ذرا رنجیدہ ہے۔

اماں جان: (جھلا کر) ایاز میاں بوڑھے ہو گئے۔ مگر بچوں کی چیزوں کی اب بھی ضرورت ہے آج کو پائی چھینی کل کو ننھی کی چُنی چھین لینا۔

ایاز: (جز بز ہو کر) اماں جان .... آپ تو خواہ مخواہ .....

نشاط: بھائی جان گستاخی معاف۔ بزرگوں کو اس طرح نہیں دھمکاتے "خواہ مخواہ" بھلا اماں خواہ مخواہ آپ کو کیوں دق کریں گی۔

ایاز: چُپ رہو نشاط۔ تمہاری بک بک ہر جگہ .....

نشاط: جی ہاں بزرگوں سے زبان چلانے سے روکوں تو بک بک۔ خوب۔

اماں جان: (روہانسی ہو کر) ارے میاں (سرد آہ بھر کر) مجھے کیا ذلیل کر و گے۔ خود سوار ہو گے تمہارے چھوٹے تمہارے جوتیاں لگائیں گے (بھنائی ہوئی چلی جاتی ہیں)

(ایاز کچھ جھلایا کچھ شرمندہ، کچھ سراسیمہ بیٹھا رہ جاتا ہے)

نشاط: (گویا کچھ ہوا ہی نہیں) ہاں تو بھئی عزت سینما جاؤ گی پہلے شو میں یا .....

عزت: (تیزی سے) میں نے کہہ دیا میں قطعی نہ جاؤں گی۔

نشاط: تو بھائی جان پر کیوں غصہ ہوتی ہو۔ انہیں ویسے ہی اماں جان نے کیسا کم ڈانٹا ہے۔

ایاز: (عاجز آ کر) نہ جاؤ کون کہتا ہے۔ (بڑبڑاتا چلا جاتا ہے)

نشاط: بھائی جان کا غصہ بہت بڑھ گیا ہے۔ بچاری عزت کو کیسا ڈانٹا۔

عزت: (ضبط سے) ہوئے غصہ تو میرا کیا بگاڑ لیں گے۔

نشاط: اور کیا عزت کا کون کچھ بگاڑ سکتا ہے کیوں ہے نا؟ (جھک کر اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھتا ہے) عزت آپا رو رہی ہو۔ واہ بھئی واہ (جھک کر اس کے بالوں کو چوم لیتا ہے اور پھر رخسار) عزت کے آنسو!

چوتھا سین

(عزت اپنے کمرے میں صوفے پر لیٹی ہے۔ کمرے میں صرف ایک ہلکا بلب جل رہا ہے۔ قریب میز پر ایک گلاس ٹھنڈے پانی سے بھرا رکھا ہے جس میں سے عزت کبھی کبھی ایک گھونٹ پی کر ویسے ہی رکھ دیتی ہے)

نشاط: (آہستہ سے داخل ہو کر ایک دم بجلی بجھا دیتا ہے) لو اب پڑھو چین سے۔

عزت: (گھبرا کر) ارے میرا دل اندھیرے میں بہت گھبراتا ہے۔ بھئی خدا کے لئے بجلی جلاؤ۔

نشاط: (بجلی جلا کر) تو پھر تم لیمپ سے کیوں نہیں پڑھتیں (دوسرے کمرے سے لیمپ لا کر رکھ دیتا ہے۔ گلاس ہٹا کر صوفے پر رکھ دیتا ہے)

عزت: آج تم نے شاباشی پانے کا کام کیا ہے۔

نشاط: کیا پڑھ رہی ہو۔ ہمیں بھی سناؤ (ذرا سی جگہ میں صوفے پر لیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ گلاس اُلٹ جاتا ہے اور دونوں بھیگ جاتے ہیں)

عزت: اُف بے وقوف کہیں کے۔ سارا بھگو دیا۔

نشاط: میرا نام لگا دو۔ میں نے بھگویا ہے کہہ دو ہاں۔

عزت: (اس کے جھوٹ پر متعجب ہو کر) نشاط۔ اور پھر کس نے پانی کا گلاس یہاں رکھا؟

نشاط: تم نے عزت۔ ارے کیا اس قدر جلدی باتیں بھول جایا کرتی ہو۔

عزت: انتہا ہے تمہارے جھوٹ کی۔

نشاط: اچھا ٹاس کر لو کہ کس نے گلاس رکھا (جیب سے پائی نکال کر) بولو ہیڈ یا ٹیل!

عزت: (مذاق سمجھ کر) ہیڈ۔

نشاط: (پائی اُچھالتا ہے) اہا۔ ہیڈ۔

عزت: (ہنستی ہے) ارے نشاط یہ پائی تو ٹوری کی ہے۔

نشاط: خوب! میری ہے۔

عزت: چل جھوٹے۔

نشاط: چل چھوٹی۔

عزت: نشاط میں تم سے بہت بڑی ہوں۔ تمہیں میرا ادب کرنا چاہیئے۔

نشاط: بالکل غلط۔ ہم ایک سرے سے تمہاری بزرگی کی مقبوری ہی نہیں مانتے کون کہتا ہے کہ تم مجھ سے بڑی ہو۔ بالکل غلط۔

عزت: تمہارے کہنے سے چھوٹی ہو جاؤں گی۔ جاؤ اب میں پڑھوں گی۔ جاؤ۔

نشاط: (دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے) ہم باجہ بجائیں گے۔

عزت: (کتاب ڈھونڈھتی ہے، صوفہ پر، میز پر، اور کتابوں میں، صوفہ کے نیچے، اِدھر اُدھر نہیں ملتی) ارے میری کتاب کہاں گئی نشاط؟

نشاط: (دوسرے کمرے میں باجہ بجاتے ہوئے) خاموشی سے سنو! کتنا عمدہ ریکارڈ ہے۔

عزت: خاک بھی اچھا نہیں۔ مگر میری کتاب!

نشاط: (باجہ اُٹھا کر لاتا ہے) تو تم ہی کوئی اچھا سا بجاؤ۔

(عزت بہت احتیاط سے ایک ریکارڈ لگاتی ہے۔ نشاط اس کی سُریلی آواز پر رقص کرتا ہے۔ عزت داد طلب نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ نشاط رقص کرتا کرتا عزت کے پاس آتا ہے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر رقص کرتا ہے۔ عزت ہنس رہی ہے ایک دم اس کے دونوں ہاتھ چھوڑ کر کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے زور سے بھینچ لیتا ہے۔ عزت تھوڑی دیر ہچکچاتی ہے۔ پھر آہستہ سے اُس کے ہاتھ اُٹھ کر نشاط کی پیٹھ پر جاتے ہیں اور ایک پل کے لئے اُس سے چمٹ جاتی ہے لیکن فوراً بچھو کی طرح کوئی ڈنک سا اس کے دل میں مارتا ہے اور نشاط کو زور سے دھکا دے کر فوراً دوسرے کمرے میں بھاگ جاتی ہے۔ نشاط زور سے تالی بجا کر ہنستا ہے۔ عزت تھوڑی دیر کے لئے قائل ہو جاتی ہے کہ نشاط اس سے بڑا ہے بڑا۔ . . . بہت بڑا)

پانچواں سین

(عزّت کمرے میں بیٹھی کچھ سوچ رہی ہے۔ نشاط کھڑکی میں سے چھلانگ مار کر آتا ہے۔ عزّت چونک پڑتی ہے۔)

نشاط: ہم سمجھ گئے۔ بولو بتائیں؟

عزّت: (دُکھائی سے) کیا سمجھ گئے۔ کچھ ہو بھی۔

نشاط: بھُوکی ہو۔

عزّت: ہٹو بھی۔

(جولی بسکٹ ہاتھ اور مُنہ میں لئے آتا ہے نشاط اُسے شکاری نظروں سے دیکھتا ہے)

نشاط: اَرے جولی یں بھکے جاتا ہے۔ ایک دن بنیر ا پیٹ ضرور پھٹے گا۔

جولی: (اترا کر) آں ہماری اُنگلی تو آپا نے بچادی تھی۔

نشاط: ہوں۔۔۔۔۔۔ تو اب یہ زخم پر مرہم تھوپ رہا ہے (لہجہ بدل کر) بھئی ہمارا جولی تو بس لاکھوں میں ایک ہے۔ یہ عزّت آپا بیچاری بھُوکی ہیں۔ انہیں سب بسکٹ دے دے گا۔ حورا کبھی نہیں دیتی۔ بڑی کنجوس ہے۔ عزّت تم نے یہ نہیں دیکھا کہ بے مانگے چیز دے دیتا ہے۔ اب یہ بسکٹ جو لئے ہے وہ ہمیں بے مانگے دے دے گا۔ اور خود اور لے آئے گا۔ خود دے دیتا ہے۔ مانگنے کی ضرورت کب ہے۔

جولی: (اکڑ میں آکر) لیجئے ہم اور لا دیں۔ ہیں لا دیں؟

نشاط: وہ تو تم لا ہی دوگے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ جولی غضب کا تیز ہے وہ چلا۔

(جولی سیڑھی میں آکر بے تحاشہ دوڑتا ہے۔ دروازہ پر بہت زور کی چوٹ لگتی ہے اور گر پڑتا ہے رونا چاہتی ہے کہ نشاط کہتا ہے)

نشاط: حورا صاحبہ گرتی ہیں تو فوراً بھیں بھیں روتی ہیں۔ جولی چاہے کتنے زور کی چوٹ لگے کبھی نہیں روتا وہ اُٹھ بیٹھا۔ وہ کھڑا ہو کر گیا بھی۔ وہ ہنس بھی رہا ہے (جولی ضبط کر کے اُٹھتا ہے۔ زبردستی کی ہنسی ہنستا ہے اور چلا جاتا ہے۔ عزّت بے تاب

ہو کر ہنستی ہے)

نشاط: عزّت کھو کیسا نشکار کیا ہے۔

عزّت: ہٹ بچّے سے چھین لیا۔ فریبی میں تو نہیں کھاتی۔

نشاط: اپنے بس نہ کھاؤ گی (زبردستی بسکٹ ٹھونس دیتا ہے۔ سارا بسکٹ کا چُورا عزّت کے مُنہ پر لگ جاتا ہے جو ہنس بھی رہی ہے اور غصہ بھی ہے)

امّاں جان: بھاڑ میں جائیں بسکٹ۔ تیرے یاوا نے دوکان لگا دی ہے۔ جو ہر وقت بسکٹ بسکٹ۔ ابھی جو دیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا نشاط نے لے لیا۔ اوئی! یہ نشاط کا دماغ کیوں چل گیا (دندناتی ہوئی داخل ہوتی ہیں) نشاط بیٹا یہ کون سا ڈھنگ ہے کہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نشاط: (نہایت سلجھی ہوئی آواز میں) امّاں جان ذرا پہلے میری سنئے۔ عزّت کو بھوک لگ رہی تھی۔ انھوں نے ذرا سا بسکٹ لے کر کھا لیا۔

امّاں جان: (چونک کر، بسکٹ کا چُورا منہ پر دیکھ کر، ہونے والی بہو کے اچھے اطوار نہ دیکھ کر) اوئی، عزّت نے جو آ کے بسکٹ کیوں لے لیا۔ کیا گنجینہ میں تالا پڑا ہے خود نکال لیں۔

نشاط: امّاں جان وہ بے چاری تکلف کرتی ہیں۔ آپ کھانے پر اُنہیں اس قدر کم کھلاتی ہیں۔ انہیں بھُوک لگتی ہے۔

امّاں جان: (بے بات کے الزام سے چراغ پا ہو کر) لو اور اندھیر سنو۔ میں کیوں کم کھانا دیتی وہ آپ ہی کم کھاتی ہیں۔

نشاط: ہاں اصل میں بسکٹوں سے پیٹ بھر جاتا ہے۔ بھائی جان ہمیشہ لا دیا کرتے ہیں آج کل وہ بھی نہیں لاتے۔

امّاں جان: (ہونے والی بہو کی منگیتر سے بسکٹ منگا کر کھانے والی بات کو سخت معیوب سمجھ کر) اوئی یہ نگوڑا بسکٹوں کا کیا شوق ہے۔ جی چاہتا تھا تو گنجینہ میں سے لے لیتے ہوتے (چلی جاتی ہیں۔ عزّت جسے امّاں اور بیٹے نے بولنے کا بالکل موقع نہ دیا حیرت

سے منہ کھولے دیکھتی رہتی ہے۔ نشاط کی ہنسی سے چونک کر موٹے موٹے آنسوؤں سے رونے لگتی ہے۔

چھٹا سین

(ڈرائنگ روم نما کمرہ جس میں دو پلنگ پانچ چھ کرسیاں اور زمین پر فرش ہورہا ہے ایک نیچی سی کوچ پر الماس بیٹھی کچھ سی رہی ہے۔ محمود نیم دراز بظاہر تاشوں کی گڈیاں لگا رہا ہے۔ لیکن الماس سے سرگوشیاں بھی کر رہا ہے اماں جان پلنگ پر لیٹی پیر دلوا رہی ہیں اور انّا کے شوہر کے معشوقانہ مظالم بھی سُن سُن کر ناقدرانہ رائے پاس کر رہی ہیں۔ جوّلی اماں کے کندھے سے لگا منہ سے فٹ بال میں ہوا بھرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے اور ہر سانس پر ٹھنکنے لگتا ہے :بچوں بیچ قالین پر حورا اور ایاز کیرم کھیل رہے ہیں۔ عزت چوکی کے کونے پر ہاتھوں پر ٹھوڑی رکھے کسی خیال میں غرق ہے)

حورا : واہ ۔۔۔۔۔۔ آں ۔۔۔۔۔۔۔ بے ایمانی آپ تو سیدھے ہاتھ سے کھیل رہے ہیں۔

جولی : اونہہ ۔ ہنک ۔ ہنک ۔ بھئی ختم ہوگئی ۔ کیا کریں بجنے ؟

الماس : پہلے ہی کہا تھا کہ زرد پر سوائے کالے کے کچھ اچھا نہ لگے گا۔ (عزت سے) کیوں نا عزت آپا دکھ دکھاتی ہے۔ عزت وہیں سے سر ہلا دیتی ہے)

(نشاط دبے دبے آتا ہے اور فرمانبردار بیٹے کی طرح اماں جان سے لگ کر بیٹھ جاتا ہے)

محمود : ارے بھئی ۔۔۔۔۔۔ کچھ دال میں کالا ہے ۔ عزت اور نشاط کی جنگ ہوگئی ۔ کیوں بھئی عزت ؟

عزت : جی نہیں ۔ کوئی بھی نہیں ۔

نشاط : مجھے کسولی کی سیر تو کرنی نہیں جو لڑتا پھروں ۔

محمود : مگر ہوئی ہے لڑائی ۔ سُنا ایک لبکٹے سے نکڑے پر جوتا چل گیا ۔ عزت بے چاری

نے بڑی مصیبت سے جولی کو پھانس کر بسکٹ چھینا۔ اس پر نشاط کی نیت آ گئی۔
سُنا ہے مار کٹائی تک نوبت آ گئی۔

نشاط: آپ سُنا بہت کرتے ہیں۔ کون سے کان سے سُنتے ہیں؟

محمود: (الماس کی طرف اشارہ کر کے) انھوں نے......

نشاط: (قہقہہ لگا کر) بھئی خوب اس کا کان تو خوب مروڑ دیجئے۔ اجی بالکل گنگ ہو گیا ہے۔

الماس: (ذرا چڑ کر) میں نے تو نہیں کہا کہ جو مُسا چلایا گیا ہو۔

نشاط: کچھ بگڑنے کی بات نہیں ہے۔ تیل کا بھاؤ گر رہا ہے (جولی سے) جولی بھیا یہ تو کب
تک ہوا بھرے گا۔ لائیں بھر دوں۔

(ہوا بھرنے لگتا ہے)

محمود: بھئی، ہم بھی کیرم کھیلیں گے۔ الماس آؤ ہم تم ایک طرف۔

الماس: ذرا ٹانکہ ختم کر لوں۔ جب تک عزّت کو لے لو۔

محمود: آؤ عزّت!

عزّت: جی نہیں۔

محمود: نہیں کیسے (زبردستی پکڑ کر بٹھا لیتا ہے کھیل شروع ہوتا ہے)

نشاط: آؤ جولی ہم تم فٹ بال کھیلیں۔ لیکن بھئی ہاتھوں کی ہے۔

جولی: ہاں بھئی۔

(نشاط اور جولی بیچ میں گیند اچھالنا شروع کر دیتے ہیں۔ بال بار بار عزّت کے
اوپر گرتی ہے دو ایک دفعہ اس کا پیر بھی نشاط سے بھولے میں کچل جاتا ہے
جس کی وہ بہت ڈھٹائی سے معافی مانگتا ہے ایک دفعہ عزّت گیند لے کر
دور پھینک دیتی ہے نشاط جل کر کھیل بند کر کے کیرم دیکھنے لگتا ہے)

نشاط: واہ بے چاری حورا ہار رہی ہے بے ایمانی ہو رہی ہے۔ صفا

حورا: آں......بے ایمانی۔

نشاط: جناب وہ آپ کے ساتھ نہیں کھیلے گی۔ بلکہ ہمارے ساتھ کھیلے گی۔ وہ بور ٹو اُلٹ

دے گی۔

(اورا سٹیج میں آکر بورڈ اُلٹ دیتی ہے۔ دوسرا کھیل شروع ہو جاتا ہے ابا، نشاط، عزت اور محمود۔ تین دفعہ عزت کی اُنگلی میں نشاط سے اسٹرائیکر لگتا ہے اور دو دفعہ بورڈ کے نیچے پیر دب جاتا ہے۔ عزت روہانسی ہو کر ہٹ جاتی ہے)

عزت: میں نہیں کھیلتی۔

نشاط: ہارتے وقت جولی بھی یہی کہتا ہے (مُنہ چڑا کر) ہم نہیں کھیلتے۔

محمود: اچھا بھئی۔ اب سے کچھ گڑبڑ نہ ہو گی۔ عزت یہ بازی ختم کر دو۔

(کھیل شروع ہو جاتا ہے)

عزت: (اپنی دانست میں بورڈ ختم کر کے) یہ لیجیے مِلیں!

نشاط: (تلخ لہجہ میں) اور یہ۔ یہ ان دو بدنصیب گوٹوں کو کون ڈالے گا۔ ہیں!

(عزت شک کی نظروں سے نشاط کو دیکھتی ہے اور کونے میں رکھی ہوئی گوٹوں کو ایک ہی وار میں ڈال دیتی ہے۔ نشاط جولی کے گدگدی کرتا ہے گویا اس نے کچھ دیکھا نہیں)

جولی: بھیّا نے یہاں دو گوٹیں نکال کر رکھ دی تھیں۔

عزت: بے ایمان آدمی کے ساتھ میں نہیں کھیلتی۔

نشاط: شکریہ۔ تو پھر کیجیے ادھر سے مُنہ کالا۔ آپا وہاں بیٹھیں گی۔

عزت: تم خود مُنہ کالا کرو۔

نشاط: جی! میری اور آپ کی بول چال بند تھی۔ بھئی حد کر دی انہوں نے بھی ڈھٹائی کی میں مُنہ لگاتا نہیں اور آپ ہیں کہ بولے چلی جاتی ہیں۔

عزت: اور یہ جو بار بار گیند میرے ہی اوپر آ کر گر رہی ہے، یہ کیا ہے؟ آخر میری اُنگلی میں تمہارا اسٹرائیکر بار بار کیوں لگ رہا ہے؟ بولتے نہیں تو غنیمت ہی تھا۔

نشاط: یہ تو سب اتفاق سے لگ جاتی تھی۔

عزت: لعنت تمہارے اتفاق پر کہ وہ بس میرے ہی لئے رہ گیا ہے۔

نشاط: (آگے جھک کر) تو پھر ملاپ کر لو نا۔ بولو!

عزت: میں تم سے لڑی کب تھی!

نشاط: پھر یہ منہ کیوں کپّا ہو رہا ہے؟ (گال پھُلا کر نقل کرتا ہے)

(عزت ہنس دیتی ہے)

نشاط: ہاتھ ملا لو۔

(عزت ہاتھ بڑھاتی ہے)

نشاط: (جھجک کر) اس کے ہاتھ کو ایسے دیکھتا ہے گویا اس میں کوئی غلاظت بھری ہے) ٹھہرو بھئی ہم ویسے ہاتھ نہیں چھو سکتے (ہاتھ کو کرتے کے دامن میں لپیٹ کر) لو اب ملاؤ۔

عزت: (بگڑ کر) جب میرے ہاتھ ناپاک ہیں تو پھر ملانے کی ہی کیا ضرورت ہے۔

(پھر لڑائی ہو جاتی ہے)

نشاط: اچھا نہیں (دونوں ہاتھ ملاتے ہیں) نشاط زور سے اس کا ہاتھ دباتا ہے اور خوب جھٹکتا ہے (محمود سے) محمود بھائی میں سمجھتا تھا کہ عزت میں ذرا تو خودداری ہوگی بھئی کمال کی بے حیا ہیں کہ ادھر لڑیں اور اُدھر خوشامد کر لی۔

عزت: چل ہٹ!

نشاط: (اور قریب آتے ہوئے) سچ بتاؤ مجھ سے لڑ کر اُداس تو بہت تھیں۔

عزت: ہیں! اے ہٹ بھی مجھے تیری خفگی کی کیا پرواہ ہوگی۔

نشاط: بھئی یہ تو تم ہی خوب جانتی ہو۔ (دونوں خوب ہنستے ہیں)

ساتواں سین

(عزت گرم شال اوڑھے پلنگ پر لیٹی ہے۔ منہ تمتمایا ہوا ہے۔ حرارت اور زکام ہے۔ کبھی کبھی کھانستی ہے۔ ایاز دوسرے دروازے سے داخل ہوتا ہے اور عزت کے پلنگ کے پاس والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

نشاط: (نہایت نرم آواز میں) عزت کیسی ہو؟

عزت: (جواب میں کھانستی ہے اور اپنا ہاتھ ماتھے پہ لے جاتی ہے) درد ہے۔

نشاط: (محبت سے اس کے بالوں اور پیشانی پر ہاتھ پھیرتا ہے) تم ایک ہفتہ میں تو اچھی ہو جاؤ گی۔ کیوں؟ (جواب کے لئے اس کی آنکھوں کو دیکھتا ہے)

(عزت سر ہلاتی ہے۔ لیکن آنکھوں میں آنسو ہیں)

ایاز: (کچھ سراسیمہ ہو کر بہت ہی آہستہ سے) کیوں؟ کیوں؟

عزت: کچھ نہیں (بے چینی سے کروٹ لیتی ہے)

نشاط: (کی آواز باہر سے) جی ہاں۔ عزت کے پاس بیٹھے ہیں۔

(ایاز کچھ گھبرا کر شرماتا ہوا کھڑا ہو جاتا ہے اور بغیر کچھ کہے باہر نکل جاتا ہے)

نشاط: (اطمینان سے سیٹی بجاتا آتا ہے) ارے تو کیوں اس قدر ٹھونس جاتی ہے جو مرنے لگتی ہے۔

(عزت کچھ چڑ کر مسکرا دیتی ہے)

نشاط: (پلنگ پر اس طرح بیٹھ جاتا ہے کہ ایک ہاتھ عزت کے اوپر سے لے جا کر دوسری طرف پلنگ کی پٹی پر رکھتا ہے) بہت گال پھول چکے تھے (گال ہلکے سے نوچتا ہے) میں کہتا ہوں کہ اب بھی تو مجھ سے بچ گئے ہیں۔

عزت: دیکھو میں اٹھ کر چلی جاؤں گی اگر تم نے مجھے دق کیا (اٹھنا چاہتی ہے)

نشاط: (نہیں اٹھنے دیتا اور جھک کر گال پر پیار کرتا ہے۔ خاموشی سے اس کے رخسار پر رخسار رکھ دیتا ہے) عزت۔ میری عزت۔ عزت!

(عزت کچھ مسحور سی آنکھیں پھاڑے خلا میں گھور رہی ہے)

(نشاط عزت کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کے ہونٹ چوم لیتا ہے۔ عزت کانپنے لگتی ہے)

الماس: (گنگنانے کی آواز آتی ہے اور دروازے میں آ کر) نشاط تم تو کہہ رہے تھے کہ محمود عزت کے پاس بیٹھے ہیں۔

نشاط: (ذرا بھی نہ گھبرا کر) میں کھا گیا اُن کو۔ ارے چلے بھی گئے وہ میرے آنے سے پہلے۔

(الماس جلتی ہوئی بڑبڑاتی چلی جاتی ہے)

ایاز: (دوسرے دروازے سے آکر) نشاط میں سمجھا تم میرے لئے کہہ رہے تھے کہ میں عزت کے پاس بیٹھا ہوا ہوں۔

نشاط: کب؟ (مکاری سے) تو کیا آپ بیٹھے تھے۔ ہوا کیا اس میں!

ایاز: اماں جان ذرا معیوب سمجھتی ہیں۔

نشاط: (جلے کٹے لہجہ میں) اماں جان کس بات کو معیوب نہیں سمجھتیں۔ اس دنیا میں سب ہی ہر بات کو معیوب سمجھتے ہیں۔ اب اگر بجائے آپ کے میں عزت سے شادی کرنا چاہوں تو سب معیوب سمجھیں گے (ایاز کو بے طرح حیران دیکھ کر) اگر الماس محمود کی بجائے سعید اُن کے بڑے بھائی سے شادی کرے تو کون معیوب نہ سمجھے گا۔ حالانکہ سعید محمود سے ۹۹ فیصدی زیادہ انسانیت رکھتے ہیں۔ یہ دنیا تو سب باتوں کو معیوب سمجھے گی۔ اب اگر آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے ابھی عزت کے رخسار اور ہونٹ چُومے تو آپ اسے معیوب سمجھیں گے (ایاز کی حیرانی کو نظر انداز کرتے ہوئے) معیوب سمجھنے کی خوب کہی۔ اب عزت جو آپ کی بہ نسبت مجھ کو زیادہ پسند کرتی ہے کیا یہ معیوب بات نہیں کرتی؟ بالکل معیوب! قطعی معیوب!! اُسے کیا حق کہ مجھے زیادہ پسند کرے اور آپ کو کم یا بالکل نہیں۔

(عزت گویا کچھ کہنے اور سُننے کی اس میں طاقت نہیں)

ایاز: (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) نشاط تم کیا کہہ رہے ہو؟

نشاط: میں وہی کچھ کہہ رہا ہوں جو آپ نے سُنا اور سمجھے۔ مگر میں معیوب اور غیر معیوب ہونے کے سوال کو ہی بیہودہ سمجھتا ہوں۔ یہ سراسر غلطی تھی کہ عزت کے پیدا ہوتے ہی اُسے آپ کے ساتھ منسوب کر دیا جائے۔ کیا یہ معیوب نہ تھا؟ عزت کچھ بھی نہ جانتی تھی بے چاری۔ جب سے وہ بڑی ہوئی آپ ہی کو شوہریت کے لئے مقرر کیا ہوا پایا۔ لیکن وہ بھی تو انسان ہے۔ اس کی خود کی بھی تو کوئی آزادرائے ہے۔ وہ مجھے پسند کرتی ہے خواہ ہفتہ بھر بعد وہ تمہاری قانوناً بیوی ہو جائے

ایاز : (پراگندہ خیالوں کو یکجا کرتے ہوئے) تو نشاطؔ کیا تم سچ کہتے ہو۔ کیا تم عزّت کو پسند کرتے ہو؟ تم بچے ہو، عزّت سے چار سال چھوٹے ہو۔ تم ابھی ایک طالب علم ہی ہو۔

نشاط : (تلخ ہنسی ہنس کر) یہی تو معیوب بات ہے۔ ایک عمر میں چھوٹا طالب علم اور ایک بڑی لڑکی سے۔ توبہ، توبہ۔ اپنے سے بڑے سے تو محبّت ہی نہیں کی جا سکتی جب ہی تو عزّت آپ سے محبت نہیں کر سکتی۔

(گویا عزّت کمرے میں ہے ہی نہیں)

ایاز : مگر نشاط ذرا سوچو تو کیسی عجیب بات ہے۔ میری عقل.....

نشاط : یہ دوسرا لفظ "عجیب" اور بھی گھناؤنا ہے۔ بھائی جان آپ تو دنیا کے غلام ہیں۔ آپ وہی سوچ سکتے ہیں جو دنیا سوچتی ہے۔ آپ کے خیالات تک دوسروں کے غلام ہیں۔ آپ کی عقل اپنی نہیں۔ "اناجی" اور دوسرے اُستادوں کی عقل کی نقل ہے آپ بڑے بیٹے ہیں۔ اماں کے ارمانوں کی آماجگاہ ہیں۔ برسرِ روزگار ہیں۔ تندرست ہیں عزّت کے منگیتر ہیں اور میں! ایک کمزور چھوٹے سائز کا جو ابھی صرف طالب علم ہی ہوں۔ جو بقول عزّت "پیلا مینڈک" روز کا روگی"، لیکن معاف کیجئے گا۔ میرے خیالات خود میرے دماغ سے نکلتے ہیں اور وہ آپ کے جھوٹے واہموں سے زیادہ سچے، زیادہ بلند مگر زیادہ "معیوب" اور زیادہ "عجیب" ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ ایک عقلمند لڑکی میرے دماغ کی قدر نہ کرے اور آپ پر مجھے ترجیح نہ دے۔ مگر پھر وہی معیوب ہونے کا سوال بیچ میں آتا ہے۔

ایاز : (بے طرح مجروح ہو کر بھاری آواز میں) نشاطؔ تم نے میرا دماغ پریشان کر ڈالا۔ اُف! (سر کو دونوں ہاتھوں سے زور سے پکڑتا ہے) عقل تک ...... نہیں۔ ابھی ابھی ...... افوہ ...... (عزّت سے) عزّت نشاط کیا کہہ رہا ہے بولو، کیا سب سچ ہے کہ تمہارے دل میں میرے لئے ذرا بھی جگہ نہیں۔

(عزّت دبی سسکیوں سے رونے لگتی ہے)

نشاط: عزت (مذاق کے لہجہ میں) یہ سب معیوب ہے۔ تم خواہ کسی کو چاہو۔ مگر منگیتر ازل سے ابد تک تم ایاز ہی کی ہو۔

(عزت تڑپ کر اٹھتی ہے اور جھپٹ کر دوسرے کمرہ میں چلی جاتی ہے)

نشاط: عزت یہ سب معیوب ہے (زور سے ہنستا ہے، ایاز مجروح اور پراگندہ کرسی کا ہتھہ پکڑے کھڑا ہے)

آٹھواں سین

(عزت کا کمرہ۔ الماس عزت کے کپڑے تہ کرکے صندوق میں رکھ رہی ہے۔ سامانِ سفر نظر آتا ہے۔ چاروں طرف کپڑے۔ بستر، جوتے، موزے بکھرے ہوئے ہیں اداسی چھائی ہوئی ہے)

الماس: عزت آپا، آخر ایسی جلدی جانے کی کیا تھی۔

عزت: الماس میرا دل بہت ہی گھبرا رہا ہے۔ اماں کے دیکھنے کے لئے بہت دل چاہتا ہے (آنسو بھر آتے ہیں)

الماس: تو تم نے تار کیوں دیا۔ بھائی جان کو کچھ پتہ نہیں وہ تو کل شام کو ہی اپنے دوستوں کے ساتھ چلے گئے۔

عزت: ہوں۔ (کسی خیال میں پڑ جاتی ہے)

نشاط: (آج پہلی دفعہ رنج کے آثار چہرے پر لئے ہوئے آتا ہے اور الماس اور عزت کے قریب والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) دنیا نہ معلوم اتنی بزدل کیوں ہے۔ کیوں اتنا ڈر سب پر چھایا ہوا ہے۔ ابھی ابھی انسان ایک بات کہتا ہے اور دوسرے لمحہ میں ڈر کر چپ ہو جاتا ہے۔ ساری ہمت رخصت۔ آج کل بھی پڑھ لکھ جانے کے بعد لڑکیاں کتنی بزدل ہیں...... ہوں...... ذلیل......

(عزت رحم طلب نگاہوں سے نشاط کو دیکھتی ہے اور پھر کپڑے تہ کرنے لگتی ہے)

نشاط: آپا الماس کبھی تم نے بھی محمود سے کہا ہے کہ تم اسے چاہتی ہو اور پھر رُک گئیں۔

الماس: (منہ شرم سے لال کرکے) واہ .... چل بدتمیز...... واہ.....
دماغ ہی چل گیا۔

نشاط: (ہنس کر) تو اتنی غصہ کیوں ہوتی ہو۔ سچ بتاؤ اُسے چاہتی ہو؟

الماس: نشاط! میں اماں جان سے کہہ دوں گی۔ کیسی بڑی باتیں کرتا ہے۔

نشاط: معیوب نا؟...... پھر وہی بے ہودہ لفظ معیوب!...... اُفوہ...... آپا
تمہیں محمود کی قسم جو تم نہ بتاؤ کہ محمود کو چاہتی ہو کہ نہیں؟

محمود: (دروازے میں سے جھانک کر) ہم بتائیں!
(الماس جھنجھناتی ہوئی اٹھ کر جانے لگتی ہے)

محمود: غصہ کیوں ہوتی ہو۔ بھئی ہم جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ کہا ہے اور دو دفعہ کہا ہے۔
اور کہتے بس نہیں۔

نشاط: اہا پھر بھلا میں کہوں تو کیوں بھائی جان خودکشی کی دھمکی دیں۔ اگر میں کہوں کہ
میں عزت کو چاہتا ہوں تو کیوں عزت صرف دکھاوے کو مسوری
تار دے کر چل دے بتاؤ نا آخر وہ بھی تو مجھے چاہتی ہے۔ محمود بھائی کیا یہ جھوٹ
ہے (الماس اور محمود حیرت سے منہ پھاڑے نشاط کو دیکھ رہے ہیں جو روتی
ہوئی عزت کو اعتراض کی نظروں سے دیکھ رہا ہے)

محمود: نشاط یہ بہت بڑی باتیں ہیں۔

نشاط: (جل کر) بہت بڑی باتیں ہیں اور تم جو کہو تب؟

محمود: ہماری منگنی تو بزرگوں نے کی۔

نشاط: ہاں تم لوگ بیل گائے جو ٹھہرے۔ ان کی شادیاں بھی ایسے ہی ہوتی ہیں۔ تمہارے
حقوق صرف اس وجہ سے وسیع ہیں کہ وہ تمہاری عقل سے نہیں ملے ہیں بلکہ صرف
دوسروں نے دیئے ہیں اور میرے...... میرے چونکہ خود مختاری پر مبنی
ہیں وہ......

محمود: مگر نشاط.....

نشاط: عزت بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہے۔ لیکن خود سے نہیں۔ اسی لئے تو مجھے اُس سے ہمدردی ہے۔ خواہ تم لوگ اسے ایک ہفتہ بعد ہی ایاز کی بیوی بنا دو۔ کچھ فرق نہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہی ایاز کی بیوی بننے کے لئے مقرر کر دی گئی وہ عادی ہے کہ صرف ایاز کی ہی بیوی رہے۔ خواہ وہ نشاط کو چاہے۔ دنیا ڈرپوک ہے۔ اسی لئے وہ بھی ڈرتی ہے۔ اعتراض سے ڈرتی ہے "اعتراض" یہ ایک تیسرا گھناؤنا لفظ ہے۔

نوکر: چلئے گاڑی کا وقت آگیا ہے۔

(الماس اور محمود حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ عزت بار بار آنسوؤں کو پونچھ رہی ہے۔ نشاط جمے ہوئے قدم رکھتا ہوا عزت کے پاس جاتا ہے اُسے محبت سے چمٹا کر پیار کرتا ہے)

نشاط: خدا حافظ۔ پھر ملیں گے۔ کب؟ دیکھتا ہے۔

(عزت خاموشی سے آنسو پونچھ رہی ہے)

ڈھیٹ

وہ : عورت خواہ کتنا ہی بلند مرتبہ پالے، بڑے سے بڑا کام انجام دے لیکن پھر وہ عورت ہے۔ ایک کمزور ہستی۔

میں : تھوڑی دیر کے لئے مانو کہ میں یقین نہیں کرتی۔ تب ؟

وہ : تمہارے ماننے اور نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ دنیا کہتی ہے، بڑے بڑے علمائے دین اور فلسفیوں کے قول دیکھ لو۔

میں : میں تب بھی نہ مانوں تو؟

وہ : تو یہ تمہاری زبردستی ہے۔

میں : تمہیں کامل یقین ہے کہ یہ میری زبردستی ہے؟

وہ : اور نہیں تو کیا۔

میں : تو تم مان گئے کہ میں زبردست ہوں۔ اب تو یقین ہوا کہ ہماری کمزوری کی ساری افواہیں غلط ہیں۔

وہ : واہ۔

میں : کہہ دو کہ "کٹ حجتی" کرتی ہو۔

وہ : خواہ مخواہ لڑتی ہو۔ یہ تو تمہاری ہمیشہ سے عادت رہی ہے۔ ہٹاؤ ان جھگڑوں کو مگر تمہیں تو ہمیشہ سے لڑائی دنگا اچھا لگتا ہے یاد ہے (آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی) بچپن کا بھولا بھالا زمانہ۔ کتنا دلفریب وقت تھا۔ کاش پھر وہی ہنسی خوشی اور بے فکری کے دن لوٹ آئیں۔ یاد ہے تمہیں جب ہم تم املی کے درخت

کے نیچے گھروندے بنا بنا کر کھیلا کرتے تھے۔

میں : اور تم سے لڑ کر میں گھر نوچ کھسوٹ کر چل دیتی تھی۔ایں!

وہ :(ہنس کر) ہاں مگر ایک دن تو تم بری طرح پٹ گئیں اور میرا منہ کھسوٹ ڈالا (اور ہنس کر) اور اُلٹی میری ہی شکایت کر دی۔

میں : تمہارا کرتہ بھی تو نوچ ڈالا تھا۔ پھر اُلٹی تم نے ہی خوشامد کی۔

وہ : (اور بھی زیادہ ہنستے ہوئے) ہاں ہاں اور پھر وہ یاد ہے وہ جو ہم نے تم نے آپا کا صابن چُرا کر کتے کے پلّوں کو نہلایا تھا۔ جس پہ آپا نے خوب کان اینٹھے تھے۔

میں : اور وہ بھی ہم تم بیروں پر لڑے تھے۔

وہ :(ہنسی سے بیتاب ہو کر) اوہ.... ہاں اور جب مکھن روٹی چھونے میں چھپا کر کھایا تھا۔

میں: تب ابا جان نے صبح کا ناشتہ کاٹ دیا تھا۔

وہ : ہاں، ہاں۔

میں : تو تمہیں یہ سب باتیں یاد کر کے... شرمندگی سی ہوتی ہے۔

وہ : ایں..... کیا...... نہیں تو یہ تو بچپن کی سہاونی شرارتیں تھیں۔ جن کی یاد....

میں: بھلا ان شرارتوں میں سہانے پن کی کیا بات تھی۔

وہ : واہ کیا تمہیں بچپن نہیں یاد آتا۔

میں: آتا کیوں نہیں۔

وہ : پھر!

میں : پھر بھی کہ افسوس ہوتا ہے، برا لگتا ہے کہ ایسے بے وقوف کیوں تھے۔ بھلا اس میں سہاونا پن کیا ہو سکتا ہے۔ املی کے پیڑ کے نیچے گھروندے بنانا... نوچ کھسوٹ .... بیروں پہ مار کٹائی۔ چپکے چپکے بستر میں چھپ کر مکھن کھانا اور پھر پٹنا جو کہ بچپن کی سب سے عزیز سہانی شے ہے۔ سب بیہودگیاں تھیں اور شکر ہے کہ وہ نالائق زمانہ گزر گیا اور کبھی نہ آئے گا۔

وہ : واہ! بچپن کی ہر بات بھولی ہوتی ہے۔

میں : بھولپن کون سا کمال ہے۔ ہر پاگل اور بے وقوف آدمی ساری عمر بھولا رہتا ہے۔ تمہاری نظروں میں وہ بہت ہی خوش نصیب ہے پھر بن جاؤ نا بھولے۔

وہ : تم تو کج بحثی کرنے لگتی ہو۔ بچپن میں اور پاگل پن میں بہت فرق ہے۔ ہم تم بڑی سمجھ سے کھیل کھیلا کرتے تھے۔ میں ڈپٹی صاحب بنتا اور تم بیگم صاحبہ بنتی تھیں۔

میں : تم نے تو مجھے اور بھی بچپن سے نفرت دلا دی۔

وہ : کیوں؟

میں : میں نے تم سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ بھئی اس پاجی لفظ "کیوں" کو اس طرح میرے سر پہ نہ پٹخ دیا کرو۔

وہ : یعنی؟

میں : لو۔ یہ تم نے اس سے بھی مہمل اور بیہودہ لفظ نکالا۔ اونہہ!

وہ : تم تو عجیب باتیں کرتی ہو۔ یہ ہماری ذہانت کا ثبوت نہ تھا کہ ہم تم بزرگوں کے طے کئے ہوئے رشتے کو کس بھول پن اور عقلمندی سے ذہن نشین کر چکے تھے۔

میں : قطعی بھول پن لیکن عقلمندی سے نہیں۔

وہ : ہیں! یعنی میرا مطلب ہے کہ کیوں نہیں؟

میں : مطلب یہ کہ ہم تم جب بھولے تھے تب تک تو ٹھیک تھا لیکن تم تو ویسے ہی بھولے اور سہاؤنے ہو۔ مگر میں بڑی ہو گئی۔ کچھ بلیھٹی نہیں بات!

وہ : کیا اس سے تمہارا مطلب ہے کہ جو رشتہ ہمارے تمہارے درمیان بچپن سے قائم ہے تکمیل کو نہیں پہنچنا چاہیئے؟

میں : یعنی؟

وہ : یعنی کیا؟

میں : یہ لیجئے۔ آپ تو جب چاہیں "یعنی"، "کیوں" کہہ کہہ مجھ سے بلے چوڑے جواب وصول کر لیں اور میں کہوں تو چکرائیں۔

وہ : تم تو .....

میں : "کٹ حجتی کرتی ہو۔" یہی کہنے والے تھے نا تم ؟

وہ : مجھے آج تک شبہ بھی نہ ہوا تھا کہ تم اس رشتہ کو ناپسند کرتی ہو۔

میں : اور شبہ ہونے کی وجہ بھی کیا۔

وہ : تم ہی تو کہہ رہی تھیں کہ .....

میں : کیا کیا ؟

وہ : نہ معلوم کیا کہتی تھیں۔

میں : اللہ رے بھولپن! تمہارے ہی دل میں کوئی ایسا ویسا خیال آیا ہوگا میرے سر تھوپ رہے ہو۔ واضح رہے کہ ہم بھی تھوڑی سی عقل رکھتے ہیں۔

وہ : بے وقوف تو میں ہی تھا جو اس دھوکے میں تھا۔

میں : یعنی یہ جو ہماری منگنی تھی یہ "دھوکا" تھا۔ تم بزرگوں تک پہنچ رہے ہو۔ پتہ ہے یہ دھوکا دادا ابا کا قائم کیا ہوا ہے۔ میں تو تمہیں ایسا نہ سمجھتی تھی۔ ٹھیکرے کی مانگ بڑی پکی ہوتی ہے جناب۔

وہ : (کھسیا کر) تم مجھے ہر وقت بے وقوف سمجھتی ہو۔

میں : توبہ توبہ۔ لیکن اگر سمجھوں بھی تو کیا ہوا؟ منگنی شادی میں عقلمند بے وقوف کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک روحانی رشتہ ہے جس کا فیصلہ خدا نے پہلے ہی آسمان پر کر دیا ہے

وہ : یعنی یہ کہ بیوی میاں کو اُلّو سمجھتی رہے ؟

میں : اس میں مضائقہ ہی کیا ہے ؟

وہ : بھلا ایسے گھر میں نباہ کیسے ہوگا؟

میں : نباہ! نباہ ایسے ہوگا کہ تم کما کر لانا میں سلیقے سے خرچ کروں گی۔ تم ڈپٹی صاحب ہوگے اور میں بیگم صاحبہ۔ مزے سے رہیں گے۔

وہ : معاف کرنا۔ تم ذرا بے شرمی پر اتر آئی ہو آج۔

میں : اس میں بے شرمی کیا ہے۔ تم ہی تو اُس روز کہہ رہے تھے کہ ہماری زندگی بڑے

مرے سے گزرے گی۔ تم مندر کی دیوی ہو گی اور میں پجاری۔ یہ ہو گا۔ وہ ہو گا۔ جو آج میں نے کہا تو برا مان گئے۔ آج کچھ دل میں ٹھان کر ہی آئے ہو۔

وہ : اگر میں کچھ کہوں تو اور بات ہے۔ میں مرد ہوں۔

میں : مجھے اس بات کا یقین ہے۔

وہ : تم بدتمیز بھی ہو۔ آج تک میں کتنے دھوکے میں تھا۔ شکر ہے کہ جلدی آنکھیں کھل گئیں۔

میں: یعنی؟

وہ : یعنی۔ اب تم کتنی دفعہ "یعنی" کہہ چکی ہو۔

میں: کبھی ناؤ ندی پر اور کبھی ندی ناؤ پر۔ آگے کہو کیا آنکھیں کھل گئیں؟

وہ : یہی کہ ہماری تمہاری نہیں بن سکتی۔

میں : کیوں نہیں بن سکتی۔ کہیں تمہارا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ منگنی ہی ختم۔

وہ : یقیناً۔

میں : تم ٹھیکرے کی منگنی توڑ دو گے؟

وہ : بے شک!

میں : مگر میں تو یہ نہیں چاہتی۔ میں تو تم سے ہی شادی کرنا چاہتی ہوں۔

وہ : مگر میں تو قطعی نہیں چاہتا۔

میں : تم تو دبولتے ہو۔ آخر وجہ کیا؟

وہ : فرض کرو مجھے تم پسند نہیں۔

میں : پھر اور کون بدنصیب پسند آئی؟

وہ : کوئی ہو یا نہ ہو مجھے تم پسند نہیں آسکتیں۔ (حد سے زیادہ چڑ کر)

میں: مگر مجھے تو تم پسند ہو۔

وہ : لاحول ولا قوۃ کیا بے حیائی ہے۔ کوئی مرد ایک لڑکی کو یوں ٹھکرائے اور وہ ذرا بھی خودداری نہ رکھتے ہوئے مصر ہو۔

میں : اور تم جو اُس دن کہتے تھے کہ اگر تم مجھ سے خدانخواستہ شادی نہ کرو تو میں
دیوانہ ہو جاؤں۔

وہ : میں مرد ہوں۔

میں : دیکھو ایک دفعہ کہہ چکی کہ مجھے بخشتہ یقین ہے کہ تم مرد ہو۔ اب جو کچھ کہوں گی تو
چل جاؤ گے۔

وہ : مرد چاہے جو کچھ کریں۔ مگر عورت اگر اظہارِ محبت یوں دیدہ دلیری سے کرے تو اُسے
معیوب سمجھتے ہیں۔ کجا۔ . . .

میں : قطع کلام ہوتا ہے۔ پھر کیسے اظہار کریں ؟ اب اظہار کا بھی نیا طریقہ ایجاد کریں۔
اگر تمہیں میرے عشق میں دیوانہ ہونے کا پورا پورا حق حاصل ہے تو کسی کی مجال
نہیں کہ مجھے تمہارے لئے اپنا گلا گھونٹنے سے روکے۔ میں جس طرح چاہوں اپنے
خیالات کا اظہار کروں۔ کوئی ہوتا کون ہے۔ واہ !

وہ : مرد کے عیب بھی چھپ جاتے ہیں۔ وہ جو کچھ چاہے کرے۔ لیکن عورت . . . .

میں : چت بھی میری پٹ بھی میری۔ میں پوچھتی ہوں کون کہتا ہے کہ عورت بڑی بات
کرے تو زیادہ گنہگار ہو گی۔

وہ : گنہگار کا ذکر نہیں ہے۔ عورتوں کے لئے عام طور پر یہ بات بہت معیوب سمجھی جاتی
ہے کہ وہ مرد کے انکار پر بھی اپنے منہ سے درخواست کریں۔ لوگ سنتے ہیں تو تھڑی
تھڑی کرتے ہیں۔

میں : تم ہی تو اُس دن کہتے تھے کہ "لوگوں کو بکنے دو" دوسرے اب تم لوگوں میں جا کر تھوڑا
ہی پھونک دو گے۔ کسی کو کیا معلوم کہ میں نے تم سے کیا کہا۔

وہ : اوہ تمہاری بحث کبھی ختم نہ ہو گی مجھے خوشی ہے کہ ہم اور تم دوزخ جیسی زندگی
سے بچ گئے۔

میں : کیسی دوزخ اور کیسی جنت ؟ تم مر بھی جاؤ تو آبا جان منگنی توڑنے نہ دیں گے دوسرے
جائداد تمہیں کوڑی کی بھی نہ ملے گی۔

وہ : مجھے جائداد کی ہوس نہیں۔

میں : اور یہ ڈپٹی کلکٹری ابا جان تمہیں خاک دلوائیں گے۔

وہ : چولہے میں ڈالو ڈپٹی کلکٹری کو۔

میں : لیکن تمہیں میرا بھی خیال نہیں۔ پرسوں ہی تم نے کہا تھا کہ مجھ خاکسار کے بُت کی بچپن سے پرستش کرتے رہو اور دل و دماغ پر خاکسار ہی چھائی ہوئی ہے اور وہ کیا شعر تھا معاف کرنا ...... وہ ...... "کیا دل کی کلی"، جنے کیا ہوا اور "صنم" اور گریباں چاک" اور "در کے بھکاری" کا بھی کچھ تھا۔ بتانا ذرا پھر سے۔

وہ : لاحول ولا قوۃ۔ توبہ ہے۔ یہ آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ حد ہے بے شرمی کی!

میں : کیا کہہ رہی ہوں۔ وہی جو تم ہمیشہ کہتے ہو۔ آج جو میں کہتی ہوں تو جلے مرتے ہو۔

وہ : تم اس رشتے کو ناموزوں خیال کرتی ہو۔

میں : ہیں! ہوش کی لو۔ کھاؤ قسم کہ میں نے کبھی یہ کہا ہو کہ میں تمہیں شادی کے لئے ناموزوں سمجھتی ہوں۔

وہ : تم مجھے ناپسند نہیں کرتیں (پرانی روشنی آنکھوں میں عود کر آتی ہے)

میں : قطعی نہیں۔ ... میں ... اب جو میں پرستش وغیرہ کا کچھ کہوں گی تو تم کہو گے بے شرمی۔ یہ۔ وہ۔

وہ : تم مجھے بے وقوف کہتی ہو آنکھوں کی روشنی معدوم ہو جاتی ہے۔

میں : کبھی نہیں۔ دراصل میرا مطلب بھولے سے ہوتا ہے۔ یوں ہی لاڈ میں کہتی ہوں۔

وہ : تم کیا کہہ رہی ہو آج میں چکرا یا ہوں۔ ابھی کچھ دن ہوئے تم مجھ سے کھل کر بات بھی نہ کرتی تھیں۔ میرا نام لیتے ہوئے جھجکتی تھیں۔ شرما کر سر جھکا لیتی تھیں۔

میں : اونہہ! وہ تو میں بنا کرتی تھی۔ تمہیں وہ باتیں پسند تھیں۔ اچھا اب میں شرمایا کروں گی۔ بس!

وہ : اوہ۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ یا خدا کیا یہ سچ ہے۔ میں کبھی بھی ایسی لڑکی کے ساتھ

زندگی نہ گزار سکتا جو مجھے پسند نہ کرتی ہو اور میرا مذاق اُڑائے۔

میں : کیا کہا! کیا؟ میں تمہیں پسند نہیں کرتی۔ تم اظہار کو معیوب سمجھتے ہو اور بگڑ جاؤ گے۔ لیکن سچ مچ میں نے تو تمہیں کبھی ناپسند نہیں کیا۔

وہ : کیا تم ایسے شوہر کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہو جو تمہیں ناپسند کرتا ہو؟

میں : اوّل تو تم مجھے ناپسند ہی نہیں۔ دوسرے شادی بیاہ کے معاملہ میں ان غیر شاعرانہ باتوں کا کیا دخل۔ تم ہی لوگ تو کہتے ہو کہ ہندوستانی دوشیزہ بڑے سے بڑے شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی نباہ کر سکتی ہے۔ وہ شوہر کو دیوتا سمجھتی ہے ایک دیوتا کے لئے ضروری نہیں کہ وہ عقلمند ہی ہو۔ ہندوستانی دوشیزہ تو ایک مرکھنے بیل کے ساتھ بھی سکھ سے رہ سکتی ہے۔ کجا تم۔

وہ : (غصّہ سے مختلف رنگ بدل کر بھنبھناتے ہوئے) تمہاری باتیں تکلیف دہ اور ہتک آمیز ہیں مجھے سخت حیرت ہے۔

میں : تمہیں تو آج حیرت ہی ہوئے چلی جا رہی ہے۔

وہ : میں پاگل جو ٹھہرا۔

میں : میں نے سب کچھ مانا۔ لیکن ایک دیوتا کے لئے پاگل واگل کا سوال ہی نہیں کہا نا میں نے کہ وہ جیسا بھی ہو پھر مجازی خدا ہے۔ اگر سجدہ سوائے خدا کے جائز ہوتا تو وہ اسی دیوتا کے حضور میں پیش کیا جاتا۔ عورتیں وہی پارسا اور نیک ہیں جو بڑے شوہروں کو نباہ رہی ہیں۔ ہماری بخشش شوہر کی فرمانبرداری میں ہے۔

وہ : بس۔ بس۔ میں تمہاری باتیں نہیں سن سکتا۔

(بھن بھناتے تن تناتے ہوئے غائب)

کہتے ہیں جو اگر شادی بیاہ کی باتیں لڑکیاں کرتی ہیں تو منہ پکا پکا ہو جاتا ہے۔ میں دوڑی ہوئی آئینے کے سامنے گئی۔ واقعی منہ پر ٹھیکرے[1] ٹوٹ رہے تھے۔

---

[1] ٹھیکرے ٹوٹنا ایک عام محاورہ ہے۔ بمعنی پھٹکار برسنا۔

خدمتگار

"کتنی دفعہ تم سے کہا کہ بھئی جلدی لایا کرو۔ مگر سنتے ہی نہیں!" میں نے پچھلی سیٹ پر کتابیں پٹخ کر کہا۔ "ڈیڑھ گھنٹے سے پاگلوں کی طرح ٹہل رہی ہوں۔ غضب خدا کا ڈھائی بج رہے ہیں۔ خدا کی قسم آج اّبا سے ضرور کہوں گی کہ بہادر سے وقت پر موٹر نہیں لائی جاتی تو میرے لئے دوسرا انتظام کریں۔" اور میں کتابیں سرکا کر بیٹھ گئی۔

"تو سرکار ناراض کیوں ہوتی ہیں۔ کل ذرا جلدی لایا تو فرمایا اتنی جلدی لے آتا ہے۔ میں لائبریری میں پڑھ بھی نہیں پاتی۔" بہادر نے بدتمیزی سے میری نقل کرتے ہوئے کہا۔

"چپ رہو، ایک تو غلطی کرتے ہو اور اوپر سے ٹرّاتے ہو۔" میں نے جھڑک کر کہا۔

"اتنا غصہ کریں گی تو سوکھ کر کانٹا ہو جائیں گی۔" بہادر نے تنبیہاً انگلی ہلا کر کہا۔

"دیکھو بہادر! بک بک مت کرو۔" میں نے غصّے کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔

"تو پھر آپ بھی ...... تو پھر آپ غصّہ کیوں ہوتی ہیں۔ ایسا برُا منہ لگنے لگتا ہے۔"

"تمہاری بلا سے۔"

"تمہاری بلا سے۔" اُس نے اترا کر نقل کی۔

مجھے ہنسی آنے لگی۔

"آج تو مارے غصّہ کے پیچھے جا بیٹھیں۔ آگے آتیے نا۔" اس نے کھڑکی کھول کر حکم دیا۔

"نہیں، چلو، بک بک نہ کرو۔ جہاں میرا دل چاہے گا بیٹھوں گی۔"

"اچھّا تو پھر چلا لیجئے خود۔ ہم سے نہیں چلتی۔" اس نے نہایت لاپرواہی سے کھڑکی سے سہارا لے کر کہا۔

" بہادر شاید تم بھول رہے ہو کہ تم نوکر ہو"، میں آج لڑنے پر تُلی ہوئی تھی۔

" تو لیجئے میں استعفیٰ دیتا ہوں، بس!" وہ موٹر سے ہٹ کر زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور لاپروائی سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

" بہادر بدمذاقی مت کرو، مجھے واقعی غصّہ آ رہا ہے"، میں نے جھلا کر کہا۔

" واقعی!" اس نے ہنس کر مذاق اُڑایا۔

" بہادر سیدھی طرح موٹر چلاتے ہو کہ ......"

" تو پھر آگے آیئے نا۔ اچھا قصور، معاف کیجئے پیر چھوتا ہوں۔ آپ کا پھولا ہوا مُنہ دیکھ کر سچ مچ میرے ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں اور موٹر اُلٹ جاتی ہے اور ....."

" نہیں میں آج پیچھے ہی بیٹھوں گی"، میں نے صلح پہ رضا مند ہوتے ہوتے کہا۔

" نہیں آپ آج آگے ہی بیٹھیں گی۔ اب معافی جو مانگ لی ہے۔" اس نے خوشامد سے کہا۔

میں اُتر کر آگے بیٹھ گئی۔

" اگر آپ آگے نہ بیٹھتیں تو میں موٹر تھوڑی چلاتا۔" وہ شرارت سے مُسکرایا۔

" بہت بے حیا ہو" میں نے کہا۔

" کون؟" اس نے ایسے کہا گویا وہ خود مجھے بے حیا سمجھتا ہے۔

" بدتمیز۔ میں آج ضرور ابا سے کہوں گی کہ تم کبھی وقت پر نہیں آتے۔" میں نے اپنی ہنسی کو روکتے اور بات ٹالنے کے لئے کہا۔

" تو پھر خود ہی موٹر چلانا سیکھ لیجئے نا۔ یوں آتی ہے یوں۔" اس نے چٹکی بجا کر کہا۔

" سیکھوں ہی گی۔" میں نے بے توجہی سے فیصلہ کیا۔

" تو پھر سیکھئے نا۔ آج ہی سے شروع کیجئے، چلو جبلی پارک"، اس نے موٹر موڑ کر کہا۔

" کیا واقعی دو روز میں سکھا دو گے؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

" اور کیا۔ دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ مگر یوں تھوڑی ..... اونہنک ... پہلے سیر بھر مٹھائی

اس نے ہونٹ بھینچ کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مٹھائی وٹھائی کا جھول ہے۔ یونہی سکھاؤ۔"

"خوب! بھئی واہ تو پھر سکھانا بھی جھول ہے۔ اچھا سودا ہے۔ ایسی [illegible] کی موٹر کسی اور سے سیکھئے۔" اس نے اکڑ کر کہا۔

"اچھا اب اتراؤ نہیں ورنہ ابّا سے کہہ دوں گی۔ وہ جوتے لگیں گے کہ یاد ہی کرو گے۔" میں نے دھمکی دی۔

"اچھا یہ ہے تو پھر یہ ہی سہی، جائیے کر دیجئے۔ سو دفعہ شکایت۔ نہیں سکھلاتے۔"

"تو اتنا اکڑتا کیوں ہے۔ اچھا چل مل جائے گی مٹھائی سکھاؤ تو۔" میں نے وھیل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تو پھر... خیر... سُنیئے تو....... تمہارا وعدہ تو کچھ ویسا ہے۔" اس نے بے اعتباری سے کہا۔

"بدتمیز تجھے میرا اعتبار نہیں۔"

"اور جو نہیں، پھر!"

"دیکھو کدھر گھماؤں"، میں نے بات ٹالنے کے لئے وھیل پکڑ کر کہا۔

"سیدھی طرف"

"ارے رے رے۔" میرے منہ سے نکلا اور موٹر بال بال تار کے کھمبے سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

"سیدھی سڑک پر جا رہی ہیں اور موٹر نے کی کیسی جلدی ہے۔" اس نے مذاق اُڑایا۔

"اچھا لیجئے۔ سنبھالئے۔" اس نے الگ ہو کر کہا۔ میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ موٹر کی اسپیڈ بڑھی اور ہوا سائیں سائیں کر کے میرے دل میں اُترنے لگی۔

"بہادر۔ ارے" میں نے تکلّف سے کہا۔ "ارے پکڑو۔"

"آپ ہی پکڑ دیئے۔ . . ہاں زور سے . . . . ارے بھاگی" اور وہ زور سے ہنسا۔

موٹر کی اسپیڈ بڑھی اور میں گھبرا ہٹ۔ بس چلانے پر مجبور ہوئی اور ایک زور کا جھٹکا لگا موٹر اُلٹتے اُلٹتے بچی۔ بہادر نے ایک دم بریک دبا دیا تھا۔ میں نے ہاتھ ہٹا لئے اور واقعی غصّہ ہو کر بیٹھ گئی۔ مجھے پسینہ آ گیا تھا۔

"اچھا لیجئے...... لیجئے۔ اب کے نہیں۔" اس نے خوشامد سے کہا۔

"چلو گھر سیدھے"، میں نے غصّہ سے حکم دیا۔

"اب چلائیے نا! اس میں ڈرنے کی کیا بات تھی۔ ہونہہ...... اسی برتے پہ موٹر چلائیں گی۔" اس نے موٹر گھر کی طرف موڑ کر کہا۔

"اور چلائیں کیسے؟ جیسے لوٹ ہی تو گئی نا۔ بہت چلی آپ سے موٹر!"

بہادر ہنستا رہا اور میں اُتر کر کھسیانی اندر چلی گئی۔

"ارے بندو!" بہادر نے مالی کو پکار کر کہا "بیوی کو موٹر چلانی آ گئی" اور وہ طویل قہقہہ لگا کر موٹر گیراج میں لے گیا۔

ذرا سوچئے ایک ذلیل نوکر جو چھوٹی عمر سے ہمارے ہاں رہا۔ دن بھر ٹپٹپا۔ برتن مانجھتا۔ جوتے صاف کرتا۔ ذرا بڑے ہو کر چھوٹے موٹے کاموں کے لئے ڈرائیور کی خدمات انجام دیتا اور یہ دماغ! وجہ یہ ہے کہ مجھے اور بھیّا کو سوائے بہادر کے کبھی کوئی دوست نصیب نہ ہوا۔ چنانچہ ہم نے ہمیشہ اس کے لاڈ برداشت کئے۔ بھیّا تو جلد ہی اسکول میں بورڈر ہو گئے۔ اور بہادر نے مجھ پر رعب جمانا شروع کیا۔ ہر بات میں اس کی ہی ور رہتی۔ رُوٹھ جاتا تو ایک بات کرنے والا ہی ہاتھ سے جاتا۔ ابّا۔ دوسرے ابّاؤں کی طرح ہم سے کبھی لاڈ پیار نہ کرتے تھے۔ ویسے بہادر کو خود انہوں نے سر چڑھا رکھا تھا۔ کبھی میں نے اگر اس کی شکایت بھی کی تو ہنس کر ٹال دیا۔ چھٹپن میں تو اگر کبھی میں بھولے سے بہادر کو مار دیتی، تو وہ تڑاق سے چانٹا مارتا کہ منہ پھر جاتا۔ ابّا کو فخر تھا وہ اُلٹا مجھ کو ڈانٹتے کہ "تو پہلے کیوں مارتی ہے۔" ویسے جب بہادر کا جی چاہتا۔ مجھے چھپ چھپ کر خوب ٹھونکتا۔ بھیّا سے بھی وہ برابر ہی کا برتاؤ کرتا۔ اب تک جب وہ کالج سے آتے ہیں تو دونوں میں گھُل مل کر وہ باتیں ہوتی ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ آقا اور نوکر ہیں۔

موٹر سیکھتے دنوں کی بجائے ہفتے ہوگئے۔ سوائے لڑنے اور صبر کرنے کے موٹر سیکھتے وقت اور کچھ نہ ہوتا۔ کبھی سوچتی بھاڑ میں جائے، تانگے میں کالج چلی جایا کروں گی۔ موٹر نہ ہوئی مصیبت ہوگئی۔ مگر پھر بہادر سبز باغ دکھاتا اور میں چکمہ میں آکر سیکھنے کو تیار ہو جاتی۔

بہادر کو ہر بات میں دخل دینے کا حق ہے۔ پڑھے نہ لکھے۔ ٹوٹی پھوٹی اردو آتی ہے۔ اس پر یہ زور کہ اردو کا اخبار گھر میں آنا لازمی۔ جہاں میں اور ابا اپنی سنجیدہ بحث شروع کرتے بہادر اپنی بدتمیز رائیں پاس کرنا شروع کر دیتا۔ میری بات کو کاٹتا اور میں جل جاتی۔ مگر ابا کہتے "یہ خوب سیاسیات کو سمجھتا ہے اسے اُلو نہ سمجھو۔"

بڑی ہنسی آتی جب بہادر صاحب مولا بہشتی، نتھا دھوبی اور ننو چمار کے لڑکے اور مسجد کے مولوی صاحب کے بیچ میں ٹوٹی ہوئی اینٹ پر بیٹھ کر چین اور جاپان، جرمنی اور آسٹریا کے موجودہ تعلقات پر رائے زنی فرماتے۔ اوٹ پٹانگ، جھوٹ سچ واقعات پر روشنی ڈالی جاتی۔ ننوا نوجوان لڑکا خودکشی اور فراری کے واقعات جو اُسے ازبر یاد ہوتے تھے۔ نہایت جوشیلی آواز سے سُناتا۔ مولا کو ہمیشہ ہندو مسلمانوں کی باہمی جنگوں کا ذکر سُننے میں مزہ آتا۔ اس کا بس نہ تھا کہ ہندوؤں کو پیس ڈالے۔ نتھا گو ہندو تھا مگر اُسے فسادوں سے دلچسپی نہ تھی۔ دوسرے وہ مولا کے تگڑے بازو دیکھ کر ذرا خوش مزاج ہی رہنا پسند کرتا تھا۔

ایک دن میں اخبار پڑھ رہی تھی کہ بہادر کمرہ صاف کرتے آئے۔ اخبار کو جھانک جھانک کر دیکھنا ان کی عادت ہے۔ ان کے "پھٹے" ہوئے اخبار میں تصویریں نہیں ہوتیں۔ اور اس وجہ سے انہیں میرے اخبار میں جھانکنے کے لئے نرم ہونا پڑتا ہے۔

"یہ کون ہے؟" وہ ایک تصویر کو دیکھ کر بولے۔

"یہ ایک لیڈر ہیں" میں نیکی کے دم میں تھی۔

"لیڈر!" یہ لفظ ان کے اخبار میں کم آتا تھا۔ "لیڈر"

"ہاں" میں نے مختصر طور پر کہا۔

بہادر کی غرض اٹکی تھی مجھے معلوم ہوگیا۔

"تو یہ لیڈر کون ہوتے ہیں۔ یہ تو جانور لگتا ہے"۔

"چُپ بدتمیز۔ یہ بہت بڑا آدمی ہے"

"کوئی پان چھ گنہ کا؟"

"بے وقوف ہو تم"

"ویسے ہی تو نہیں جیسے لیڈر صاحب یہاں آتے ہیں"۔

"کون؟"

"وہی جو پرسوں بھی آئے تھے"

"وہ پلیڈر تھے بے وقوف یہ لیڈر ہے"۔

"اچھا" اس نے بالکل نہ سمجھ کر کہا۔

"یہ رہنما ہے"

"یہ.... رہنما.... اچھا.... قطب نما" وہ اترانے لگا۔

"تو تم اسے نہیں جانتے؟"

"نہیں"

"تمہارے اخبار میں کچھ نہیں لکھا۔"

"اُس میں ایسے بیہودہ لوگوں کا کہاں ذکر۔ دو تو ورقے ہوتے ہیں سارے اخبار میں۔ زیادہ تر تو بس غزلیں ہی ہوتی ہیں اور آٹا بھی تو بہت دنوں میں ہے۔"

"کیسے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ملک کے جہلاء اپنے لیڈر کو نہیں جانتے۔" میں نے تاسف سے کہا۔

"تو اس میں میرا کیا قصور! مجھے تو فرصت نہیں ملتی جو ان "نما" صاحب کے پاس جاؤں۔ چوراہے تک تو جانے کی مہلت نہیں ملتی"

"تم جیسے اس کے پاس جا بھی بہت سکتے ہو" میں نے ہنس کر کہا۔

"کیوں، کیا وہ سات تالوں میں رہتا ہے یا کیا؟"

"جی وہ تم جیسے بڑ پونجیے سے ضرور ملے گا۔"

"ہم تڑپو بجنے کا ہے سے ہیں یہ دیکھنے" بہادر نے ذرا سیدھے کھڑے ہو کر کہا۔

"وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ دُور سے دیکھ لینا ہی اُسے غنیمت ہے۔ تمہاری تو وہاں تک رسائی بھی نہ ہو گی۔"

"ایسے اُس میں کون سے لڈو لگے ہیں جو ہم کھا جائیں گے۔ دماغ کیوں دکھاتے ہیں، کیا بہت روپیہ پیسہ ہے؟"

"بہت۔ دوسرے انہیں روپے کی پروا نہیں۔ کھدر پہنتے ہیں۔

"تو اس میں کیا ہوا۔ ننوا چمار ہمیشہ سے کھادی پہنتا ہے۔ مولا بھی ایک تہبند میں چھ مہینے گزار دیتا ہے۔ ہم بھی سرکار اور بھیا کی اُترن پہنتے ہیں۔"

"تم، ننوا اور مولا تینوں گدھے ہو۔ یہ تو قوم کی خدمت کرتے ہیں۔ غریبوں کا انہیں بڑا درد ہے۔"

"ارے! اور ہم کون خدمت نہیں کرتے۔ صبح سے جو جُتت جاتے ہیں تو شام کو کہیں دس بجے چھٹّی ملتی ہے۔ مولا کی کمر پانی بھرتے بھرتے ٹیڑھی پڑ گئی۔ ننوا کے ہاتھ چمڑا چھیلتے چھیلتے گھنا گئے۔ اب اور کون سی خدمت یہ لیڈر کرتے ہیں؟"

"جی تو جناب کا خیال ہے کہ ننوا، مولا اور آپ تینوں لیڈر رہیں۔ ضرور!" میں نے ہنس کر مذاق اُڑایا۔ تم لوگ گائے بیل کی طرح کام کرتے ہو۔ گدّی میں سے تو کچھ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ لوگ قوم کی خاطر قید میں جاتے ہیں۔ لوگوں کو سیدھا راستہ دکھاتے ہیں۔ ان کی بھلائی کے لئے کوئی اگر جان مانگے تو جان تک دے دیں۔"

"تو کوئی مولوی ہیں، رشی ہیں، کیا ہیں؟"

"ہٹ رشی اور مولوی سب ڈھونگ رچاتے ہیں۔ یہ تو رہنما ہیں۔"

"ارے کچھ بتایئے تو یہ کون ہوتے ہیں۔ جیسے؟"

"جیسے۔ وہ جو ..... تجھے یاد ہے؟ لکھنؤ میں جلوس نکلا تھا۔"

"وہ لاٹ صاحب کا!"

"ارے ہٹ ..... وہ جو امین آباد ....."

"وہ جو پیپا شاہ جی نے پنکھا چڑھایا تھا درگاہ پر؟"

"بس تھپڑ ماردوں گی جو تیں میں کہہ سے جائے گا۔ جا نہیں بتلاتے۔"

"تو پھر بتاتی نہیں ہیں ڈانٹے جاتی ہیں۔"

"ارے بھئی جب وہ قومی جھنڈیاں لگی تھیں.....؟"

"وہی تو لاٹ صاحب والا تھا۔ سارے میں روشنی ہی روشنی تھی۔ ایسی روک لگی تھی کہ کیا کہنا۔ منوں پھول لوگوں نے ڈالے تھے۔"

"نہیں ان کمبخت انگریزوں نے تو ہمارے ملک کو لوٹ لوٹ کر ناس کر دیا۔ غریبوں کا پیٹ کاٹ کر استقبال کے لئے روپیہ جمع ہوتا ہے اور دو چار عمدہ عمدہ سڑکیں صاف کر کے اور سجا کے ان میں سے انہیں گزروا دیا جاتا ہے۔ بڑے ہمارے ملک پر حکومت کرتے ہیں۔ کمبخت کہیں کے" میں نے جوش سے کہا۔

"اور یہ لیڈر کیا کرتے ہیں۔ یہ بھی تو جھنڈیاں لگا کر سڑکیں جھڑوا کر، اور ہار پھول پہن کر جلوس نکال دیتے ہیں۔ بہت ہوا تو کچھ بول دیئے۔ وے تالیاں پڑی پیٹ رہی ہیں۔ سمجھ میں خاک نہیں آتا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"تم بے وقوفوں کی سمجھ میں کیا آئے گا۔"

"تو پھر آپ جیسے....." وہ ہنسا "تو پھر یہ بے وقوفوں کے لیڈر نہیں۔"

"نہیں اور نہ بد تہذیب لوگوں کے" میں نے جل کر کہا۔

"تو پھر ہمیں کیا ضرورت جو ہم انہیں کوڑی بھر بھی دھاریں۔ بھئی ہمارا بھی کوئی لیڈر ہوتا۔"

"تم تو سمجھتے ہی نہیں۔"

"تو پھر سمجھائیے نا۔" اس نے عاجز ہو کر کہا۔

"یہ لیڈر غریبوں کے ہمدرد ہیں۔ تمہارے پیپا شاہ اور مداری شاہ تو ٹھگ ہیں۔ لوٹ لوٹ کر اپنا گھر بھرتے ہیں اور یہ تو غریبوں کی روزی کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کے حقوق دلاتے ہیں۔"

"پیپا شاہ کے یہاں بھی تو آئے دن لنگر بنٹتا ہے۔" بہادر نے دلیل پیش کی۔

"لنگر بنٹتا ہے۔ پیٹ بھرے پہنچ جاتے ہیں اور کچھ نہیں۔"

"تو پیٹ بھرے کیوں پہنچ جاتے ہیں۔ اب میں نہ پہنچ جاؤں۔ آپ نہ چلی جائیں۔" بہادر بولا۔

"تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔" میں نے عاجز آکر کہا۔

"اور جو کہتا ہوں سمجھایئے تو سُنتی ہی نہیں۔"

"کیا سمجھاؤں، کوڑھ مغز۔ ابھی یہ ہمارے حقوق [illegible] ارہے ہیں۔ ہمیں گورنمنٹ کی نوکریاں دلوائیں گے۔ ہمارے لئے سیٹیں ریزرو کرائیں گے۔ میں نے سمجھا ہی دیا۔"

"سیٹیں کیسی؟ ریل کی؟" کندۂ ناتراش بولا۔

"اوہو! گنٹھل۔ بھئی ہٹ میں تجھے نہیں سمجھا سکتی۔ ارے بھئی سیٹیں۔ اوہو کیسے بتاؤں اسمبلی میں سیٹیں۔"

"اچھا۔ اب میں سمجھا۔ بہادر نے سمجھنے کی کوشش چھوڑتے ہوئے کہا۔" اچھا، تو سب کو ڈپٹی کلکٹریاں ملا کریں گی۔"

"اور کیا۔"

"تب تو مزہ ہے۔ میں بھی ڈپٹی کلکٹری میں نام لکھواؤں گا۔"

"جوُتے لگیں گے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"جی۔ ای یہ بہت جوتے لگے اور ہاں نتوا کا لڑکا نویں درجے میں پڑھتا ہے وہ تو ضرور ہی ڈپٹی بن جائے گا۔"

"تم، تمہارے نتوا اور مولا ہی تو ڈپٹی بننے کے لائق ہیں۔ ذراسی گرہ میں بھی رکھتے ہو۔ ڈپٹی بنو گے۔"

"کیوں، اس میں کیا ہے۔ تھانہ داری تو میں ابھی کر دوں کہ کیا بتایئے۔"

"بھلا تم، جو نہ [illegible] تے دُھتے ہو کہ جُلاہے اور نتوا چمار مجسٹریٹ بنیں گے۔" میں ہنسی۔

"اچھا تو پھر [illegible] ں کا ذکر نہیں اور یہ گاندھی جی جو ہمارے ہیں وہ؟"

" وہ کیا کر سکتے ہیں وہ مجبور ہیں۔ بھلا کیسے ایک رذیل آدمی کو اونچے عہدے دے دیتے جائیں۔ تم ہی سوچو بہادر!

" تو پھر کیا؟ " پھر یہ نوکریاں بھی صرف بڑے لوگوں کے لئے ہی لے رہے ہیں تو بھئی ابھی روٹی کپڑے کا ٹھکانہ بھی نہیں ہوا اور نوکریاں بھی نہ ملیں تو یہ کیسے لیڈر۔ ان سے اچھے تو مداری شاہ ہیں جو کھانا کپڑا دیں اور پھر ان کا کہنا کرو تو جنت میں الگ جاؤ"۔ بہادر نے جلی ہوئی آواز میں کہا۔

" بس کھانا کپڑا ہی تو ضروریات نہیں۔ ان ذلیل خواہشات سے بلند و اعلیٰ اور بھی تو خواہشیں ہیں۔ یہ ضرورتیں تو صرف حیوانات کو ہیں کہ پیٹ بھر لیا اور بیٹھے ہیں سو گئے۔"

" واہ آپ بھی کیا کہہ رہی ہیں۔ اسے جب پیٹ بھر کے کھانا نہ ملے گا تو کوئی جیے گا کیونکہ جانوروں کے چرنے کے لئے گھاس تو ہے اور سونے کو بھٹے تو ہیں۔ بہت سے غریبوں کو تو یہ بھی میسّر نہیں۔ جانوروں کو ایک ایک کے در بھیک تو مانگنا نہیں پڑتی۔"

میں کھسیانی ہوتی جا رہی تھی۔ یہ بہادر بڑا اجنبی ہے۔ ایک بات کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔

" غریبوں کی زندگی بہت اچھی ہوتی ہے " میں نے فلاسفی چھانٹی۔ نہ کسی بات کا غم نہ فکر۔ مزے سے کھلی ہوا میں جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ روکھی سوکھی ملتی ہے۔ مگر چین سے۔ کپڑے کی فکر بھی نہیں ستاتی"

" بڑی اچھی ہے غریبوں کی زندگی۔ آپ کو کیا معلوم۔ ان کو یہ روکھی سوکھی بھی کن مصیبتوں اور فکروں کے بعد ملتی ہے۔ زمیندار کا جوتا سر پہ رہتا ہے۔ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ بھئی خوب کھلی ہوا میں مزے سے رہے۔ ذرا آپ تو دو روز مزے اٹھا کر دیکھیں آنکھیں کھل جائیں۔ آپ سمجھتی ہوں گی جھونپڑی بھی کوئی سرکار کا دورے والا ڈیرہ ہے کہ اندر مزے سے میز کرسی جمی ہوئی ہے اور نوکر لگے ہوئے ہیں۔ جھونپڑی میں بھلا بھل تو پانی بھرتا ہے اور دنیا بھر کے کیڑے مکوڑے کا ڈر۔ اس پہ نہ بستر نہ تکیہ۔ خوب!" بہادر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

میری عادت ہے کہ بہادر کی دلیلوں سے خواہ کتنی ہی قائل ہو جاؤں۔ مگر کہتی اپنی ہی رہتی ہوں۔ میں نے بات ٹالنے کے لئے کہا " تم تو ہو جاہل لٹھ تم سے کون مغز مارے۔ پڑھو

لکھو تو دنیا میں قدر بڑھے۔"

" تو پھر آپ پڑھاتی کیوں نہیں۔" اس نے ضد کی " دیکھئے پھر میری بھی قدر بڑھ جائے گی۔"

اس دن کی بحث اس بات پر ختم ہوئی کہ اگر بہادر ایمان داری سے مجھے موٹر چلانا سکھائے گا تو میں اس کو پڑھاؤں گی۔

ابھی چند روز ہی پڑھتے شروع ہوئے تھے کہ بہادر کو اپنی قدر بڑھ جانے کا گمان پیدا ہو گیا۔ بجائے نیچے بیٹھنے کے کھانے کے کمرے سے کرسی لا کر اس پر بیٹھ گئے اور کتاب کے ورق نہایت انہماک سے اُلٹنے لگے۔

" اٹھو یہاں سے۔" میں نے اس کا کان پکڑ کر کہا۔

" کیوں؟ کیا کرسی پر بیٹھنا بُرا ہے؟" اُس نے آنکھیں پھاڑ کر کان چھڑاتے ہوئے کہا۔

" ہاں" اور میں کرسی پر دراز ہو گئی۔

" اُٹھئے یہاں سے" بہادر نے آہستہ سے میرے کان چھو کر کہا۔

میں نے اس کے ایک تھپڑ لگایا " بدتمیز"

" آپ ہی نے تو کہا تھا کہ کرسی پر بیٹھنا بڑی بات ہے۔ لے کے ایسے زور سے میرے کان مروڑے۔"

" تم نوکر ہو اور پھر کرسی پر چڑھ کر بیٹھتے ہو۔"

" تو کیوں کیا نوکروں کے کان چمڑے کے ہوتے ہیں۔ بڑی آپ تو گاندھی جی کی چیلی بنتی ہیں۔ اللہ قسم اب تک درد ہو رہا ہے۔"

" تو کیوں گدھا پن کرتے ہو تم"

" کیا کیا میں نے؟"

" تم پھر اتنے گندے کیوں رہتے ہو۔ ذرا اپنے ہاتھ تو دیکھو جیسے بیل کے گھر" میں نے بات پلٹی۔

"کیا کروں۔ ساری عمر برتن مانجھتے، جوتوں پر پالش کرتے گزری۔ یہ دیکھئے کیسے گٹے پڑ گئے ہیں۔ اب موٹر کا کام کچھ کم گندہ ہے؟"

"تمہاری روح ہی گندی ہے،" میں نے فیصلہ کیا۔ "کپڑے دیکھو جیسے صافی!!"

"اتنے سے روپے۔ اماں، بہن اور اس کے پانچ بچے۔ اتنے کپڑے کہاں سے بناؤں"۔

"اور یہ جو بال جھبرے کتوں کی طرح آنکھوں پر پڑے ہیں، ہیرا" میں نے اُس کے سُرخی مائل سنہری بالوں کو پکڑ کر ہلایا۔

"اور جو مانگ پٹی کروں تو سرکار جوتے مار کر نکال دیں۔ جو سر منڈواؤں تو بھیا وہ ٹیپیں لگائیں کہ بھیجا نکل پڑے۔ دوسرے ایسی فکریں لگی رہتی ہیں کہ جی نہیں چاہتا" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"تم پڑھو گے بھی یا میرا سر ہی کھائے جاؤ گے؟" وہ خاموشی سے پڑھنے بیٹھ گیا۔

رشید ابا کے بے تکلف، ہم عمر دوستوں میں سے تھے۔ مجھ سے انہیں بچپن سے بے حد لگاؤ تھا۔ میں انہیں رشید چچا کہا کرتی تھی۔ وہ مجھے بہت چھیڑا کرتے تھے۔ وہ بڑے زندہ دل اور خوش طبیعت انسان تھے۔ مجھے دق بھی کرتے تھے۔ لیکن میری ذرا سی بات بھی وہ بڑی مسرت اور غرور سے مانتے تھے ان کی زندگی ہمیشہ ایک مجرد ہی جیسی گزری۔ والدین نے بچپن میں زبردستی شادی کر دی دو تین بچے ہوئے اور پھر جو بیوی سے علیحدگی ہوگی تو ملاپ ناممکن ہوگیا۔ رشتہ داروں سے دور ہم لوگوں کے سوائے کوئی ہمدرد غریب کا نہ تھا بھیا کو اور مجھے بہت ہی چاہتے تھے۔ مجھے بھی وہ بہت ہی اچھے لگتے تھے۔ ابا تو کبھی لاڈ پیار کرتے نہیں تھے رشید کی محبت ایک نعمت معلوم ہوتی تھی۔ وہ چند روز کے لئے آیا جایا کرتے تھے تو اُن کے آنسو آ جایا کرتے تھے۔ انہیں آئے ہوئے کئی روز ہو گئے تھے۔ انہیں مجھ سے بہت سی باتیں کرنا تھیں اور بجائے گھر میں بیٹھنے کے کہیں باہر کار میں جائیں۔ صبح ہی صبح جو بہادر میرے کمرے میں آیا تو میں نے پوچھا "رشید کہاں ہیں؟"

بہادر نے شرارت سے اپنی جیب میں جھانکا۔ پھر دوسری میں ہاتھ ڈالا۔ پھر حسرت

سے مُنہ بنا کر ہاتھ اور سر ہلایا گویا کہتا ہے "نہیں ملتے، کھو گئے"

"بتاؤ کہاں گئے ہیں؟" میں نے ہنسی کو روکنے کے لئے کہا۔

"پہلے یہ تو بتائیے کہ آپ نہیں آج کل پڑھاتی کیوں نہیں ہیں؟" بہادر نے کمر پہ ہاتھ رکھ کر پُوچھا۔

"نہیں پڑھاتی۔ پہلے بتاؤ"

"نہیں بتلاتے۔ پہلے پڑھاؤ" اس نے فوراً کہا۔

اُس کی کمینی عادت سے واقف ہوں اس لئے نرمی سے کہا "پڑھا دوں گی۔ بھئی آج میرا دل نہیں چاہتا"

"تو پھر میں بھی بتا دوں گا۔ آج میرا دل نہیں چاہتا۔" اُس نے "میرا" پر زور دیتے ہوئے کہا اور جانے لگا۔

"ٹھہرو بہادر" وہ مُڑ گیا۔

"بات یہ ہے۔۔۔ بھئی مجھے۔۔۔۔۔ میرے سر میں درد ہے۔ اس لئے آج تو نہیں ہاں کل پڑھا دوں گی۔"

"بات یہ ہے۔۔۔ بھئی مجھے۔۔۔۔ میرے سر میں درد ہے اس لئے آج تو نہیں ہاں کل پڑھا دوں گی" وہ نقل اُتار کر بولا۔

وہ بالکل جانے والا تھا۔

"اچھا بیٹھو" میں نے کہا اور وہ میرے سامنے پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"اور کتاب؟" میں نے پوچھا۔

"اور یہ آپ کے رشید چچا!" اس نے لفظ چچا کو بن کر بگاڑ کر بالکل بے تُکے پن سے کہا۔ "ذرا موٹر تیز کرو بس گھگی بندھ جاتی ہے۔ ارے رے رے اتنی تیز کیوں ہانکتے ہے" بہادر نے مسخری صورت بنا کر رشید کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں پڑھنا تو نکلو میرے کمرے سے چلو میں نہیں پڑھاتی۔"

"اہلو۔ لو بگڑ گئیں۔ بزدل نہیں ہیں تمہارے رشید چچا" اس نے پھر لفظ چچا کو

واضح طور پر کہا۔

میرا جی جل گیا۔ مگر کچھ کہتے بن نہ پڑا۔

"بہادر بھاگو یہاں سے میرا دماغ نہ چاٹو" میں نے عاجز آکر کہا۔

"آج وہ ......" اس نے پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا۔ مگر پھر رُک گیا۔

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ آپ کے تو سر میں درد ہے" وہ جانے کے لئے اُٹھا۔

"تم رشید کے لئے کیا کہہ رہے تھے؟" میں نے اپنے شوق کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "ہاں اب ان کا" جو ذکر ہے تو جلدی جلدی پوچھ رہی ہیں۔ نہیں بتلاتے جائیے۔" وہ دروازے کی طرف چلا۔ پھر بولا۔ "آج جب وہ برآمدے میں کھڑے تھے تو میں نے غور سے انہیں دیکھا۔ کیسے بے ہنگم لگ رہے تھے۔ بڈھے ہو گئے۔ مگر سُنا ہے شادی کے بڑے شوقین ہیں"

میں کھسیانی ہو گئی۔ رشید چھ سال سے مجھ سے شادی کرنے کے لئے کوشاں تھے۔

"میں نے سوچا" وہ دروازے کے پاس جا کر بولا "میں نے سوچا" بھئی کیسی بدقسمت وہ لڑکی ہوگی جو...... جس سے ان کی شادی ہوگی۔"

پیمانہ چھلک گیا۔ میں نے میز پر سے اُٹھ کر حکم دیا۔ "نکلو...... بہادر میرے کمرے سے"

وہ چلا گیا۔ لیکن فوراً پھر آکر کہا "اور ہاں وہ پھاٹک کے پاس کھڑے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے آپ کو بلانے کے لئے بھیجا تھا۔ چلتی ہیں آپ یا جا کے کہہ دوں نہیں آئیں سر میں درد ہے۔ پھر وہ چلا۔

کیا بتاؤں میرا کس قدر جی جلا۔ رشید نے مجھے بلانے کو بھیجا اور یہ یہاں باتیں بنانے لگا۔

"میں آرہی ہوں" میں نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔

"میں تو کہے دیتا ہوں طبیعت ٹھیک نہیں بخار آرہا ہے" وہ مسکراتا ہوا تیزی سے چلا۔

"نہیں" میں نے ڈانٹا اور جلدی سے مفلر لپیٹتی ہوئی اس کے پیچھے چلی۔

"تیز آیئے۔ ورنہ پھر نہیں لے جائیں گے" اس نے میری جلدی دیکھ کر طعنہ دیا۔

رشید جلدی سے ٹوپی گھماتے آگے بڑھے۔

"لیجیے سرکار آگئیں" اس نے فتح مندانہ بلند آواز سے کہا۔ کہنی تھیں نہیں جاؤں گی۔ سر میں درد ہے۔ میں نے کہا "چلیے بھی سیر کو چلیے تو سب ٹھیک ہو جائے گا" اس نے مکاری کی ڈرکر کے کہا۔

رشید کا چہرہ چمک اٹھا اور وہ حسبِ عادت میری نبض ٹٹولنے لگے۔

"اوہنہ" میں نے جل کر کہا اور کار میں بیٹھ گئی۔ بہادر ڈرائیو کرنے لگا۔

اتنی تیزی سے موٹر اسٹارٹ کی کہ معلوم ہوا بھونچال آگیا اور کھمبے سے موٹر ذرا ہی بچ کر نکلی۔

"ارے!" رشید نے آنکھیں پھاڑ کر کہا "ٹھیک سے نہیں ہانکتا۔"

سامنے لگے ہوئے شیشے میں میں نے بہادر کی ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کا مطالعہ کیا اور میں جل گئی۔ رشید سے کتنی مرتبہ کہا کہ "بھئی یہ 'ہانکنا'" کہاں کا لفظ ہے کوئی موٹر نہ ہوئی تانگہ یا چھکڑا ہو گئی جو ہانکی جائے۔ وہ فوراً خوش مزاجی سے کہتے ہیں کہ "میرا مطلب چلانے سے ہے" مجھے ان کی بعض باتوں سے نفرت ہے۔

باتوں میں خیال بھی نہ رہا اور بہادر نے موٹر کھڈوں اور نالیوں والی سڑک پر ڈال دی۔ ایسے کہ بات کرنا دشوار ہو گیا۔ جوڑ جوڑ ہل گیا۔

"ابے اِدھر کہاں لے آیا" رشید غرائے۔

"ارے تو آپ نے روکا بھی نہیں" اس نے الٹا الزام دیا۔ خیر! آگے سیدھی سڑک ہے۔

موٹر پھر لڑھکنے لگی۔ چار میل گئے۔ مگر سیدھی سڑک کا خاک پتہ نہیں۔

رشید کے منہ سے بات نہ نکل رہی تھی مجھے بھی صرف ہنسی آرہی تھی۔

"ارے بھائی وہ تیری سیدھی سڑک کدھر ہے" رشید نے پوچھا۔

"ہوں...... بھول گیا۔ یہ سڑک تو اٹھارہ میل تک کھڑ کھڑیا ہی چلی گئی ہے کیا موڑوں"

"اور نہیں تو کیا مار ڈالے گا،" رشید بھنائے۔ "یار تم تو بس وہی ہو سے کے جوڑ جوڑ ہلا ڈالا ہو منہ" رشید نے اپنا سر میرے سر سے ٹکرانے سے بچا کر کہا۔

سیر کیا خاک ہوتی۔ سارے راستے طوطوں کی طرح اڈّے پر پہنچ جائے بیٹھے رہے۔ سر پھوٹ جانے کا الگ ڈر۔ گدّیوں پر اُچکتے اُچکتے تھک گئے معلوم ہوا سیر نہیں بلکہ کشتی لڑ کر آ رہے ہیں۔ بہادر نے فتح مندانہ مسکراہٹ سے مجھے دیکھا گویا کہتا ہے کہ "دیکھا کیسی سیر کرائی؟"

"شام کو کہاں چلئے گا۔ پانچ بجے موٹر نکال لوں۔" اُس نے تڑاق سے کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا۔

"ابے ہٹ۔ ہم کیا مرنے کے لئے تیری موٹر میں جائیں گے" رشید نے ڈانٹا۔

رشید ہمیشہ بہادر سے بدتمیزی سے بولتے ہیں انہیں بڑی شکایت ہے کہ یہ نوکر ہو کر ذرا بھی مہذّب نہیں۔ ابا نے سر چڑھا لیا ہے۔ بیہودہ ہے۔ کسی دن ٹھیک کر دیا جائے گا۔ مگر بہادر خاک نہ سُنتا بلکہ صرف شرارت سے مسکرا کر اور بھی مذاق اڑانے پر تُل جاتا۔

تم اُتر کر باہر ہی بیٹھ گئے۔ رشید کو میرا اتنا خیال رہتا تھا کہ اگر ذرا سی چیز خریدتے تو سو مرتبہ میری رائے لیتے۔ ان کی کوٹھی اور فرنیچر میری خاص پسند کا تھا۔ موٹر ہم نے خود جا کر دہلی سے خریدی۔ جس پر خوبصورت حلقے میں میرا مونوگرام بنوایا تھا۔ ہر چیز پر میرا مونوگرام تھا۔ سارے نوکر میری پسند سے رکھے جاتے۔ اور نکالے جاتے تھے۔ رشید کے کپڑے اور مختلف چیزیں عموماً میرے پسندیدہ رنگ کے ہوتے انہوں نے کبھی میری مخالفت نہ کی جب میں چھوٹی سی تھی۔ جب ہی سے وہ مجھ سے ڈرتے تھے مجھے چھیڑتے اور جب میں خفا ہو جاتی تو بے چین ہو جاتے انہیں اس میں بھی مزہ آتا تھا مجھے اب تک ان سے روٹھ جانے کی عادت ہے ایک دفعہ انہوں نے مذاق ہی مذاق میں میری چاندی کی چوڑی مچھلیوں والے حوض میں پھینک دی تو میں دس بارہ کی ڈھونگ وہیں مچل گئی۔ بیچارے فوراً کوٹ اُتار کر

پانی میں اُتر گئے۔ مجھے اب تک یاد ہے وہ کتنے اچھے معلوم ہو رہے تھے۔ سبز کاہی ان کی ٹائی بالوں میں بے طرح اُلجھ گئی تھی اور سارے جسم پر سڑی گلی پتیاں چپکی ہوئی تھیں انہیں تکلیف پہنچا کر میرے دل میں گدگدی سی ہوتی تھی۔ مجھے بڑا فخر تھا کہ ایسا بارعب اور طاقتور انسان میرے سامنے بھیگی بلی بن جاتا تھا۔ بھیا کا تو دم نکلتا تھا۔ مگر میں بہت دلیر تھی ذرا سی بات پر انہیں باتیں سُنا کر رکھ دیتی وہ اُلٹے خوش ہوتے۔ مجھے ٹایفائڈ ہوا تھا۔ رشید نے اپنے پیشے کی ساری ترکیبیں مجھے موٹا کرنے کے لئے صرف کر دیں۔ اتنے ٹانک پلائے کہ میں پھول کر کُپا ہو گئی اور بہادر اور بھیا مجھے چڑا چڑا کر کھا گئے۔ ڈاکٹر بھیا کو بہت چاہتے تھے۔ مگر بھیا بے وقوف اُن سے کھنچے کھنچے رہتے تھے۔ رشیدا اور رشید کی ساری چیزیں میرے آنے کی منتظر تھیں بیگم کتنے ہی نئے سیٹ خریدے۔ کتنے ہی موٹر میرے مونو گرام سے سجائے گئے۔ مگر مجھے کبھی وہاں پہنچنا نصیب نہ ہوا۔ ایک سے جب رشید تقاضا کرتے وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے۔ رشید نے مجھے ایک نئے آتش دان کا نقشہ زمین پر کھینچ کر بتلانے تھے کہ سامنے سے ایک مرکھنی سی گائے دُم اٹھائے دوڑتی ہوئی سیدھی ہماری طرف لپکی۔ بندو پیچھے ڈنڈا لئے کر دوڑا غل سُن کر بہادر بھی اپنی کوٹھری میں سے جھانکا۔ نہ جانے کیا سوچ کر ایک چھوٹی سی لکڑی لے کر ایسے گائے کو ہماری طرف ہنکا کر لایا کہ وہ پھاٹک چھوڑ کے ہماری طرف آئی۔

گائے بیل اور بچھو تین چیزوں سے میرا دم نکلتا ہے۔

"ارے ادھر مت ہانک بہادر"، رشید ڈر کر ڈانٹنے لگے۔

لفظ "ہانک"، پر بہادر ہنسی سے لوٹ گیا۔ اگر ہم منڈیروں پر نہ چڑھ جاتے تو یقیناً گائے ہمارا آٹا کر دیتی۔ بہادر مجھے نظر غلط انداز سے چھیڑتا ہوا گائے کے پیچھے بھاگا چلا گیا۔ اگر رشید کو بہادر کی مکاریوں کا ذرا بھی پتہ چل جاتا تو وہ خدر مچا دیتے وہ اُسے صرف ایک بے وقوف گدھا سمجھتے تھے۔

اس دفعہ رشید کچھ ایسے پیچھے پڑے کہ ابا شادی پر راضی ہو گئے۔ میں اور رشید دن بھر

سامان خریدتے پھرتے۔ خالہ جان بھی انتظام میں مدد دینے آگئیں۔ اماں کے بعد وہی تھیں جو ہماری قریبی رشتہ دار تھیں۔

بہادر خاموشی سے ہمیں دن بھر موٹر میں لادے پھرتا تھا۔ رشید چھٹی لے کر آگئے تھے۔ اور مجھے ہفتوں بہادر سے بات کرنے کا بھی وقت نہ ملتا تھا۔ بہادر کی بد مزاجی بڑھتی جاتی تھی۔ وہ مجھ سے بالکل بات نہ کرتا اور اگر کرتا تو ترشی سے۔ بات بات پر ہر ایک سے اُلجھ پڑتا۔ یہاں تک کہ ابّا نے جو کچھ کہا تو غرّا کر انہیں گھورنے لگا۔ ابّا میں غضب کا تحمل ہے دوسرے وہ اُسے چاہتے بھی بہت ہیں۔ بالکل چپ رہ گئے مجھے بہادر کو دیکھ کر بڑا رنج ہوتا۔ بجیا کے چلے جانے کے بعد سہیلی کہو، بھائی کہو، یا نوکر سب کچھ یہ بہادر ہی تھا۔ رشید بے شک میرا لاڈ کرتے تھے۔ بہادر اور ہی تھا میرا بچپن کا ساتھی اور اب وہ مجھ سے بات تک کرنا پسند نہ کرتا تھا وہ پہلے سے زیادہ زرد اور دُبلا ہو گیا تھا مجھے یقین تھا کہ بہادر مجھ سے خفا ہے۔ یہ رشید تو نہ تھے کہ اگر کبھی خفا ہو بھی جائیں تو ان کا بہترین علاج یہ ہے کہ خود خفا ہو جاؤں۔ بس وہ فوراً اُلٹی خوشامد شروع کر دیتے تھے یہاں بہادر کا سوال تھا جو صرف خوشامد کرانے کا عادی تھا۔

رشید ایک دُکان پر سوٹ کا آرڈر دینے اُترے۔ میں نے بہادر سے پوچھا۔ "یہ تمہاری تھوتھنی کیوں سوجی ہوئی ہے"

کوئی اور وقت ہوتا تو بہادر ایسا منہ توڑ جواب دیتا کہ میں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی۔ لیکن وہ صرف کھسیانی ہنسی زبردستی ہنسنے لگا۔

"کبھی دماغ درست ہی نہیں ہوتا جب دیکھو جب منہ ڈبل روٹی ہو رہا ہے۔ آخر کوئی وجہ بھی ہو" میں نے نرمی سے ملامت کی۔

"میں کس پہ غصہ کروں گا بھلا۔ میں ایک پھٹا ہوا نوکر اور کسی سے غصہ ہو جاؤں تو پھر روٹی کہاں ملے گی" وہ افسردہ ہو کر مجھ سے دور دیکھنے لگا۔

"نہیں تم کچھ بدل ہی گئے ہو۔" رشید آگئے اور ہم واپس چلے آئے۔

میرا دل بہادر سے کھل کر باتیں کرنے کو چاہتا تھا۔ لہذا میں نے اُسے بُلایا۔

"بہادر ذرا میری ساڑھی پر استری کر دو۔"

"لیجئے! یہ کوئی میرا کام ہے۔ ننھا کو نہ بھیج دیتا ہوں"، وہ مڑا۔

"نہیں وہ ٹھیک نہیں کرتا۔ دوسرے وہ میری استری توڑ دے گا"۔

"اچھا لائیے مجھے ساڑھیاں اور استری دے دیجئے میں کرلاؤں گا"۔

"میرے کمرے ہی میں بڑی میز پر کرلو۔ میں تمہیں اپنی بجلی کی استری توڑنے کے لئے نہ دوں گی"۔

"تو پھر کروا لیجئے کسی اور سے"، اُس نے سوکھا منہ بنا کر کہا۔

"ادھر آؤ"، میں نے ڈانٹ کر کہا۔

وہ قریب آیا۔

"چلو"، میں نے اُس کا کان پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف لے جا کر کہا، "ساڑھیاں نکالو اور سیدھی طرح استری کرو"۔

وہ مسکرانے لگا۔ اس کا پتلا سا زرد چہرہ خون کی گرمی سے بادامی ہوگیا اور آنکھیں بھیگ گئیں وہ خوش تھا۔ صندوق میں سے ساڑھیاں نکال کر وہ استری کرنے لگا۔ میں کھڑکی کے قریب اسٹول پر بیٹھ گئی۔

اس کے کھردرے بڑے بڑے بالوں دار ہاتھ چمکتی ہوئی استری اور رنگ برنگی ساڑھیاں میرے لئے ایک کھیل بن گئیں۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک نئی جان پیدا ہوگئی تھی۔ استری کے ساتھ ساتھ اس کی چمکیلی آنکھیں آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں اس نے اپنے گداز زیریں لب کو دانتوں سے دبا رکھا تھا۔ جیسے کہ سخت مصروفیت اور کام کے وقت دبا لیتے ہیں۔ کف بے تکے پن سے اس کی آستینوں میں جھول رہے تھے۔ آپا کے چوڑے چکلے دامن کی قمیص اور بھیّا کے ڈھیلے ڈھالے پتلون میں وہ ایک تنکا معلوم ہو رہا تھا۔ گریبان کے تمام بٹن ٹوٹ گئے تھے اور اس کا کافوری سینہ بہت سا کھلا ہوا تھا۔ جس پر پسلیوں کا جال بخوبی نظر آتا تھا۔ اس کے بے رونق کنگھی بال بے ترتیب گچھوں کی صورت میں اس کی پژمردہ مگر بلند اور ذہین پیشانی پہ بکھرے ہوئے تھے۔

میں اسے متواتر غور سے دیکھ رہی تھی میرا دل دُکھ گیا۔ آہ بے رحم زمانہ نے اسے ایک

ذلیل و خوار خدمت گار بنا دیا تھا۔ ورنہ وہ ذہانت اور عقلمندی کا مجسمہ معلوم ہو رہا تھا۔ نہ جانے کتنے بلند دماغ صرف غربت کے ہاتھوں کچل کر خاک راہ سے بد تر ہو جاتے ہیں۔ اگر اُسے اعلیٰ تعلیم دی جاتی اور اس کے پاس روپیہ ہوتا تو وہ کتنی شاندار ہستی بن جاتا۔ وہ ایک ذلیل نوکر تھا جس نے بچپنے سے اپنی ہی جنس کی دل و جان سے خدمت کی تھی۔ لیکن پھر بھی کوئی بات تھی کہ وہ نمایاں ہستی معلوم ہوتی تھی۔ زندگی کے ہر معمولی سے معمولی اور بڑے سے بڑے کام میں وہ ایک قابلِ تعریف عقلمندی کا ثبوت دیتا تھا۔ میں اُسے محویت کے عالم میں تک رہی تھی۔ اس نے کئی دفعہ اُچٹتی ہوئی نظر میری طرف ڈالی اور مجھے اپنی طرف گھورتے دیکھ کر وہ بے اختیار ایک مظلوم مسکراہٹ میں ڈوب گیا۔

اس نے سیاہ باریک ساڑھی کی چار تہیں کر کے میز پر پھیلا دیا اور استری سیاہ بادلوں میں بجلی کی طرح تیزی سے کوندنے لگی۔

ایک سحر تھا کہ جس نے مجھے بے خود کر دیا۔ کوئی سخت سی چیز میرے گلے میں بار بار اٹکتی ہوئی معلوم ہوتی اور آنکھیں دھندلی سی ہو گئیں۔ میں کھڑی ہو گئی۔ بہادر کا ہاتھ رُک گیا اور اس نے مجھے ایک لمحہ تک بے معنی نظروں سے دیکھا۔ لیکن یکایک جذبات کے ہجوم اور خیالات کی خاموش گھٹائیں اس کی آنکھوں میں چھا گئیں۔ میں آہستہ سے اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ وہ پریشان ہو گیا۔ چہرہ کسی ناقابلِ بیان تکلیف سے تمتما اُٹھا۔ اس کے ہونٹ خون کی زیادتی کی وجہ سے انگارہ ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا پھوٹ جائیں گے اس کے ہاتھوں میں ایک لرزش تھی جسے وہ جھنجلا جھنجلا کر چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم نہ بتاؤ گے ؟" میں نے اُس کے استری والے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

وہ مضبوطی سے استری کو پکڑے رہا اور میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ کو جو کانپ رہا تھا اُس نے آہستہ سے ڈرتے ڈرتے میری طرف دیکھا اور اس مرتبہ ایسے کہ دوبارہ کسی سوال کی ضرورت نہ رہی۔ میں نے استری لے کر اس کے ہاتھ سے رکھ دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے گریبان بند کرنے لگا۔ پریشانی کے علاوہ اور کچھ بھی چھپانے کی کوشش کر رہا تھا اس کی پلکیں بوجھل ہو کر لرز رہی تھیں اور اس کے ہونٹ ایک سسکی میں چل جانے کو تیار تھے۔

"بولتے کیوں نہیں؟" میں نے نرمی سے قریب ہو کر کہا۔

"میں... میں.... کیا بولوں!" وہ لفظ چبانے لگا۔

"تم رنجیدہ نہیں رہتے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

وہ چُپ رہا۔

"کیوں رنجیدہ رہتے ہو؟" میں نے پھر کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" اُس نے پریشانی سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں نہیں معلوم! جھوٹے.....!" میں نے لفظ جما کر کہا۔

"سچ" اُس نے سر ہلا کر اپنے جھوٹ کا اور بھی پختہ ثبوت دیا۔

"میں دھوکے میں تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ تم مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو" میں نے سب کچھ سمجھ کر کہا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

اُس کی آنکھیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ "بنو مت۔ تم خوب سمجھتی ہو۔" مگر وہ چُپ تھا۔

وہ تھوڑی دیر کھڑا غیر مطمئن نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ اس نے چاہا کہ باہر چلا جائے۔ لیکن پھر ایک دم اس کا وہی غصّہ اور جنون عود کر آیا۔ وہ تیزی سے میری طرف جھپٹا۔ اور میرے اتنے قریب آ کر رُکا کہ میں سمجھی وہ ضرور میرے اوپر گر پڑے گا۔

"آپ سمجھتی ہیں..... آپ کھیل رہی ہیں۔ مجھ غریب سے..... آپ کھیل رہی ہیں...... آپ جانتی ہیں۔" اور وہ جھنجھلا کر اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ آنسو بے اختیار بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔

میں نے اُس کی طرف ہاتھ اُٹھایا۔ وہ خاموش میری طرف تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ خاموش افسانوں کی ضخیم جلدیں میرے سامنے کھل گئیں۔

"بہادر!" میں نے کہا۔

اور وہ میرے قریب گر پڑا۔ اور اپنا سر میری گود میں رکھ دیا۔ بڑی دیر تک وہ گہری سسکیاں لیتا رہا۔

"تمہیں رنجیدہ دیکھ کر میرا دل دُکھتا ہے بہادر" میں نے اُس کے سر کو سہارا دے

کر کہا۔

"تو نہ دیکھا کیجئے میری طرف" اُس نے غور سے کہا۔

"نہ دیکھا کروں تمہاری طرف" میں نے گویا خود سے کہا۔

"ہاں، کیا فائدہ؟"

"کیا ہر کام انسان فائدے کے خیال ہی سے کرتا ہے؟"

"ہاں اور جو نہیں کرتا وہ دُکھ اُٹھاتا ہے"

"کیا دُکھ بڑے کٹھن ہوتے ہیں؟"

"ہاں ایک بھوُ کے ننگے خدمت گار کے لئے۔" اُس نے انگلیاں چٹخا کر کہا۔

"اور جو بھوُ کے ننگے خدمت گار نہیں ہوتے انہیں کیا دُکھ نہیں ہوتا؟"

"کیا ان کو بھی دُکھ ہوتا ہے" وہ اُمید بھری آواز میں بولا اور سیدھا ہو بیٹھا۔

"ہاں۔"

"کیا وہ بھی اپنی لوٹی ہوئی کوٹھڑی ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ میرا مطلب ہے صاف ستھرے کمرے میں چھپ چھپ کر رویا کرتے ہیں" اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"ہاں۔"

"اور کیا وہ بھی ان ۔۔۔۔ وہ بھی ایک امیر اور طاقتور انسان کو دیکھ کر کہ وہ ۔۔۔۔۔ کہ جب وہ ۔۔۔۔۔ اس کو دیکھتے ہیں تو گھنٹوں جلا کرتے ہیں" اس نے چبا چبا کر بے ترتیبی سے کہا۔

"کون سے طاقتور امیر انسان کو؟ رشید کو!" میں نے شرارت سے کہا۔

"ہاں" اور وہ شرمندہ ہو کر زور سے ہنسا۔

"تم ۔۔۔۔ طاقتور انسان کی ہی تو پہچان نہیں کہ وہ موٹا ہو اور بہت سا روپیہ رکھتا ہو بلکہ ۔۔۔۔ بعض ۔۔۔۔ بلکہ ۔۔۔۔" میں الفاظ ڈھونڈنے لگی۔

"بلکہ؟" اُس نے شوق سے پوچھا۔

"تم بے وقوف ہو" میں نے اُسے دُور دھکیل کر کہا۔

آقا اور خادم کا رشتہ کبھی کا ٹوٹ چکا تھا۔

اس کے بعد چند دن کیسے گزرے۔ شاید ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس اتنا کہنا کافی ہے کہ مسلسل خفگیاں اور خودکشی کی دھمکیاں چلیں۔ اور آنسوؤں کی نہریں بہہ گئیں۔

ابا اتنے ہی سنجیدہ اور خاموش رہے۔

رشید کی نئی کار پر میرے مونوگرام کی جگہ ایک سیاہ ٹپہ نظر آنے لگا ہے انہیں اب چھٹی بالکل نہیں ملتی۔

میں کالج برابر جاتی ہوں۔

بہادر وقت پر موٹر اب بھی نہیں لاتا بلکہ ہمیشہ جلدی لاتا ہے۔

بچپن

ابھی چند روز ہی کا ذکر ہے کہ لائبریری صاف کرتے ہیں "عصمت" کے پرانے پرچے نظر پڑے۔ ایک عنوان دیکھ کر خیالات نہ معلوم کہاں سے کہاں دوڑ گئے یہ مضمون مس حجاب اسمٰعیل کا تھا اور عنوان "بچپن" تھا۔

مس حجاب اسمٰعیل (جب کہ وہ مس حجاب اسمٰعیل تھیں) اخباروں کی ہیروئن تھیں ایک رومینٹک سا نام جس میں کچھ جدّت، کچھ نزاکت اور کچھ افسردہ حُسن کی جھلک تھی اور پھر ان کے مضمون "اوہ معبود" لفظوں کی مسلسل قطاریں "دریچہ" "سمندری کوٹ"، "کاہیدہ جسم" "موم بتی جیسی انگلیاں" "ڈاکٹر گار" "بوڑھی بھینس" "چوہیا زوناش" اور ایسی ہی ادنےٰ عقل سے بالاتر باتیں کچھ عجیب سا بے وقوف بن جانے پر مجبور کرتی ہیں۔

آمدم بر سرِ مطلب۔ تو یہ مضمون ان کے سُریلے بچپن کے متعلق تھا۔ ہمیں ایک زیرِ لب مسکراہٹ کا مرہونِ احسان ہونا پڑا۔ بچپن! جسے دیکھو بچپن کے شیریں نغمے الاپ رہا ہے۔ "بے فکری کا زمانہ مسرّت سے بھرپور گھڑیاں" اور "کھیل کود کے دن" عموماً بچپن سے وابستہ سمجھے جاتے ہیں۔ ہم خود جب سب کو بچپن کی مزے دار باتیں اور مختلف قسم کے لاڈ پیار کے قصّے سُناتے دیکھتے ہیں تو اصلیت کو ذرا "ویسا" کر کے سُنا دیتے ہیں۔ "یوں کھیلا کرتے تھے"، "یوں امّاں جان نے پیار کر کے کلیجے سے لگا لیا۔" "یوں کھلونے تحفے میں آیا کرتے تھے۔" آپ ہی بتائیے کیا کریں۔ کیا سب سے کہہ دیں کہ بھئی جان بچی لاکھوں پائے اچھا ہوا کہ وہ ناپائدار زمانہ گزر گیا۔ ہم تو یہ کہتے ہیں جو یہ ناپائدار نہ ہوتا تو، ہم لوگوں کا جن کے نہ تو "چچا گار"، نہ "کیپٹن ہارلی" اور نہ "کاہیدہ جسم" اور نہ کبھی قہوہ وغیرہ ملے نہ چاکولیٹ کے

بنڈل کھانے کو ملیں، کیسے گذر ہوتا۔ ہم تو جب تک چھوٹے رہے مداری کے بندر جیسی حالت رہی صبح ہوئی اور آپا نے لوٹا اور منجن کا پڑیا سنبھالا اور پوری فوج کا منہ دھلانا شروع کر دیا۔ اب اکھ کہتے ہیں۔ ہنک ہنک بھئی کل ہی تو منہ دھویا تھا تو بعد ایک دھوکے کے جواب ملتا ہے پھر روٹی بھی آج مت ٹھوسنا کل ہی تو کھائی تھی۔ اب دیکھیے جواب ان کی فلاسفی کا۔ا۔ بھر بھر کے بکٹے منجن منہ میں بھر بھر کے رگڑے دے رہی ہیں۔ تو نشانہ تو باندھتی نہیں۔ کبھی انگلی پھسل کر ناک میں گھسی جاتی ہے تو کبھی گال کو دردرے منجن کے گھسے دیتی ٹھوڑی پر پہنچ جاتی ہے۔ گردن پر اس طرح پانچوں انگلیاں پیوستہ جیسے زیادہ کرایہ مانگنے والے تانگے والے کو دھکے دیئے جاتے ہیں۔ بہتیرا ٹھنک رہے ہیں مگر کچھ سنائی نہیں دیتا۔ ذرا سوچئے اب ذرا کالے رہ جائیں گے تو کیا ہرج ہو جائے گا۔ نہیں ہم بر دکھوّے کو جا رہے ہیں۔ جلد اکڑ خود آپا ملے ہوئے کپڑے پہناتے ہوتے فرماتی ہیں۔ روز صابن کے رگڑے، جو مزاحمت کرو تو حکم ملتا ہے "اگر روئی تو سچ مچ آنکھوں میں صابن گھسیٹر دوں گی" گویا اب تک صرف جھوٹ موٹ گھسیٹر رہی تھیں۔

اب منہ دھلنے کے بعد تولیہ کے داؤں دکھانے شروع کئے۔ گویا کوئی چپٹی بینی ہے۔ جو دبائی جا رہی ہے۔ خواہ ناک تولیہ ہی میں لپٹی چلی جائے مگر روؤ مت، سارے مراحل طے ہونے کے بعد جو کہا "کھانا"، تو کہا جاتا ہے "اوئی تو بڑا ایسی بھی کیا بلبلاہٹ ہے۔ صبح ہوئی اور روٹی کا پیٹنا پڑ گیا۔ ابھی چیل کوؤں نے کوڑا بھی نہ کریدا ہوگا۔ ایسا ہی ہے تو پیٹ سے روٹی باندھ کر سویا کرو"، کہو بھلا پھر منہ کیوں دھلا چیل کوؤں کا کیا دھلتا ہے۔ منہ انسان دھوتا ہے۔ کھانے کے لئے۔ ایک دن جو ہماری شوکت آپا بیچاری نے روز روز کی منجن بازی سے تنگ آکر کہیں کہہ دیا کہ "بھئی ہم آج منہ نہیں دھوئیں گے۔ کیونکہ ہم کھانا نہیں کھائیں گے"، تو آج تک ان کی جھنجل ہوتی ہے۔

اب ناشتہ کا دور شروع ہوا۔ آپا بیچاری کا تو یہ کہ انہوں نے تو رات کے کوفتے گرم کر لئے اور باسی روٹی میں گھی اور پانی کا چھینٹا دے کر باسی کوسی کھالی اور ہم جائے پئیں۔ آپا کو چائے خشکی کرتی ہے اب اگر چائے میں شکر نہیں ڈالی تو پھر لیجیے ایک کھائی بچاندیئے

جو مانگی تو کھا گیا۔ یہ تو یہ ہے! دو ہاتھ ہیں، ان سے کیا کیا کروں۔ بچی ذرا چھری تلے دم تو لے۔ شکر پر مری جاتی ہے۔ چیونٹی کہیں کی۔ لو۔ جو تھوڑی دیر منمنانے کے بعد ویسے ہی پی لی تو اور آفت۔ "اللہ رے ندیدن! ذرا صبر نہ ہوا۔ وہ پھیکی ہی غٹ غٹا گئی۔ لڑکی ذات ہو کر ایسی ندیدی۔ کیا پھیکی بھی نہ لگی۔"

یہ عورت ذات ہو کر تو میری بڑی مٹی خراب ہوئی۔

ابھی ناشتہ سے فارغ ہو کر دو ہی تین چکر لگائے ہوں گے کہ "ماسٹر صاحب آگئے" کی صدا آ گئی۔ خون میں ایک قسم کی کمزوری سی غالب آ گئی۔ رگ اور پٹھوں میں دم نہ رہا۔ جی چاہا چل جائیں۔ نہ معلوم اب کیا کریں۔ اب کتابیں ڈھونڈتے ہیں تو وہ نہیں ملتیں۔ کمبخت دوات کرسی پر رکھی رکھی آپ ہی الٹ گئی۔ تختی دھونا یاد ہی نہ رہا۔ قلم پر باجی مع اپنے تندرست جسم کے کھڑی ہو گئیں۔ گھر کے اس کونے سے اس کونے تک "ہائے بھئی۔ ہائے اللہ!" کرتے چکر کاٹ رہے ہیں۔ خیر خدا خدا کر کے کل مرحلے طے ہوئے اور چبوترے پر مسئلہ تعلیم نسواں حل ہونے لگا۔

کمبخت ایک کتاب آفت ہو کر چمٹ گئی۔ ابا میاں کے روز روز کے تبادلوں نے ایک مستقل مدرس تو ہم لوگوں کا رکھا نہیں۔ نئی جگہ گئے پھر سے وہی محمد اسمٰعیل صاحب کا قاعدہ یا پہلی دوسری کتاب شروع کر دی۔ کتاب کا رنگ و روپ ـــــــ اور قد و قامت کچھ ایسا ہو گیا کہ ہم ٹٹول کر بتا سکتے تھے کہ یہ ہماری کتاب ہے مگر اس میں جو بیش بہا مضامین تھے اُن سے ہم کورے ہی رہے۔ نہ معلوم کیسا طریقہ تعلیم تھا کہ مہینوں کٹکھنوں پر ہاتھ پھیرتے مگر کسی طرح کچھ نور علم ہم پر نزول نہ فرماتا۔

اے دلِ خانہ خراب ہے کہ نہ معلوم کہاں بہتا چلا جاتا ہے اپنی حالت کو دیکھنے اور دنیا پر نظر ڈالئے۔ جتنا بھی برتن مانجھ کر کبڈی کھیل رہا ہے اس کی "ویڈ یڈ" پر بے اختیار آنکھ اُٹھ جاتی۔ منگیا بھی گوبر تھاپ کر مزے سے ہمارے سامنے ہی جامنیں جھاڑ جھاڑ کر کھا رہی ہے۔ یہاں تک کہ ڈھالو اور ڈبکا باوجود پلے ہوتے کے آزادی سے دوڑتے اور، ہم "دیُل بر جا"، "وہ اس کا دیور ہے" "گنگا جمنا سے بڑی ہے" بکا کرتے۔ وائے بر حالِ ما۔

جب ماسٹر صاحب مطمئن ہو جاتے کہ ہم لوگ باقاعدہ ٹھک ٹُھکا چکے اور میرے بازوؤں اور رانوں پہ خوب گہرے گہرے نیل پڑ چکے (عورت ذات ہونے کی وجہ سے ماسٹر صاحب مجھ پہ ہاتھ نہیں اُٹھاتے تھے بلکہ نہایت میٹھی میٹھی چٹکیاں لیتے تھے بلکہ حکم تھا کہ "اگر اندر رہتا پایا تو مار ڈالیں گے" جب نہلاتے ہیں آپا یہ نیل دیکھتیں تو ان میں ایک نیل کا اور اضافہ کر دیتیں کہ کیوں ایسی جگہ جاتی ہے جو گرگر کے نیل ڈالتی ہے) اب املا کی باری آتی۔ یہ بدبخت سیاہ روشنائی نہ معلوم کن سائنٹیفک طریقوں سے تیار کی جاتی ہے کہ ہمارے قابو میں تو کبھی اس کا قوام آیا نہیں۔ کبھی تو ایسی کہ شوربہ لو تو لوتھڑے جھولتے چلے آتے ہیں اور کبھی یہ کہ دھر دھر کے قلم ٹھونک رہے ہیں اور سیاہی پھیکی پھڈک۔

خدا خدا کر کے چھٹی ملی۔ بستہ بغل میں، بدبودار سیاہی میں لتھڑی ہوئی اُنگلیاں تختیاں گھسیٹتے، منہ بسورتے چلے آ رہے ہیں۔ جو کسی نے کہہ دیا "پٹیں، مت رو، بیچاری!" بس وہیں پسر گئے۔ اب جو کہتے ہیں "بیوی کھانا"، تو جواب ملتا ہے "مجھے کھا لو۔ اے ہاں نہیں تو"، کھانے پر ہر چیز ثقیل۔ بہت گرم۔ بہت ٹھنڈی اور دیر ہضم ہو جاتی ہے۔ بوٹی مانگو تو جواب ملتا ہے "میری بوٹیاں نوچ لو"۔ جو کہا "ہمیں بھی انڈا دو۔ چنو کو جو دیا" تو جواب ملتا ہے "اب کھا پچی لاؤ تو انڈے بھی دوں اور کیا میرے باوا نے دھڑ دڑ رکھوا دی ہے" آپا بیچاری کو بس چند گودے کی ہڈیاں ایک آدھ سینے کی یا گردن کی ہڈی مل گئی وہ انہوں نے کھا لی۔ سالن نہ بچنے کی وجہ سے دو تین انڈے تلوا لئے۔ بانٹنے والے کی یہی تو خرابی ہے کہ اُلٹا سیدھا ملتا ہے دوپہر کو چُن چُن کر سب کی ایک قطار بنا دی جس کی ٹٹی لگی ہے۔ پنکھا چل رہا ہے ہم پر دفعہ ۱۴۴ قائم ہے۔

ہلو مت۔

کروٹیں مت لو۔

فرش پہ لوٹیں مت لگاؤ۔

خربوزے تربوز جو ٹٹی کے پاس رکھے ہیں انہیں گنو مت، نہ ہی چھوؤ۔

پنکھے کی جھالر میں جھولو مت۔

گھس کر مت بیٹھو۔

یہ مت کرو۔

وہ مت کرو۔

اب ذرا ان "سمتوں" پر غور کیجیے۔

ٹٹی کے کمرے سے چھوٹتے ہی چنو اور شمیم تو کھیلنے چلے جاتے لیکن عورت ذات گڑیاں کھیلتی۔ قول ہے کہ ڈھنگ سے بیٹھ کر گڑیاں کھیلو۔ سلیقہ آتا ہے۔

کیا بتاؤں مجھے ان کمبخت گڑیوں سے کیسی للّٰہی ہے۔ ان گڑیوں سے کوئی کیا کھیلے: بچوں کی شکل۔ کپڑوں کے ڈھیر تھے کہیں اگر بڑوں والی بات تھوڑی بھی کہ چاہے نہلاؤ دھلاؤ کچھ نہیں بگڑتا۔ یہاں تو یہ حال کہ دو دن میں چوہا۔

گڑیوں میں عام طور پر بیاہ کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ ہماری بہت سی گڑیاں تھیں لیکن ایک چکٹ سا گڈا۔ وہی فرداً فرداً ہر گڑیا کا خدائے مجازی بنتا۔ اگر کبھو بھی گڈے اور بنوا دیئے جائیں تو نہ معلوم کس سائیکولوجیکل نقطۂ نظر سے جواب ملتا نہیں بس گڑیوں سے کھیلو گڈے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

ابھی رسم کتخدائی ختم بھی نہ ہونے پائی کہ مولوی صاحب آگئے ۔ ۔ ۔ سے کل حواس کھوئے جاتے۔ جی چاہتا سو جائیں مگر کہاں۔ دو تین جھنجوڑیاں دے کر کھڑے کر دیئے جاتے۔ چلئے قاعدہ سنبھال کر راستے میں ذرا پانی پینے رکے تو چند بند ہیں۔ "اب چلو کیا پیتے جاؤ گی"، کبھو بھئی تجھے کیا۔ تو تو جا۔ مگر وہ ہے کہ ڈٹا کھڑا ہے آپ خواہ نو گلاس پی جایئے۔ مگر وہ ساتھ لے جا کر چھوڑے گا۔

جھوم جھوم کر سبق شروع ہوا۔ آنکھ اونگھ اینکھ۔ تانکھ تونکھ تینکھ۔ چلا چل پھر وہی اختلاج شروع ہوا۔ قاعدہ کا صفحہ زیادہ غیر دلچسپ ہونا شروع ہوا پیلے پیلے کاغذ پر سیاہ بد وضع حروف منہ چڑانے لگے۔ ادھر ادھر دیکھنے کو جی چاہا۔ ہر چیز ہماری توجہ کی محتاج نظر آنے لگی۔ چنو کی گیند جو کس مپرسی کی حالت میں موری کے پاس لڑھک رہی تھی۔ آپا کا الگنی پر پڑا ہوا دوپٹہ درخت کے پتے۔ مولوی صاحب کی ٹوپی کا پھندنا۔ شمیم کا اٹھا ہوا سرخ کان سبق سے

زیادہ دلچسپ اور حسین معلوم دینے لگے۔

گھر میں آپا کی وہی حیثیت تھی جو آجکل ہٹلر اور مسولینی کی ہے۔ احکامات اعلیٰ وقتاً فوقتاً ہماری اصلاح کے لئے محکمہ جات تدریس میں صادر ہوتے رہا کرتے تھے۔ ایک سپارہ ختم کرتے ہی عسنہ کو "عورت ذات" کی فلاح و بہبود کی فکر ہوئی اور کہلا بھیجا کہ قرأت سکھائی جائے تاکہ دین دنیا دونوں روشن ہو جائیں کھل گئی ہوتی جنت کی کھڑکی۔ مگر اس گنہگار سے قرأت قابو میں نہ آنا تھی نہ آئی، یا تو یکمشت چھ چھ تانیں نکل پڑتیں، یا گلے میں صرف ایک عدد پھندا پڑ کر اُبکائی آجاتی۔ جو چٹکی کے ایک شیریں جھکولے سے مجروح ہو کر نیم جان قاف پر دم توڑ دیتی۔ اتنی دیر میں مسائلِ تصوف حل کرتی۔ چھو کلکھنوں پر ہاتھ پھیرتا جاتا اور میری حالتِ زار پر مسکراتا جاتا۔ شمیم خود ایک ناقدانہ مسکراہٹ کے ساتھ غور سے میری ہر حرکت کو نوٹ کرتا جاتا۔ تاکہ بعد کو میری نقلیں سب کے سامنے کر کے مجھے خون کے آنسو رُلائے۔

اسی اثناء میں اگر برات یا اسی قسم کی کوئی وجدانی کیفیات پیدا کر دینے والی چیز آجاتی اور ہم چونک کر "مولی صاحب برات" کہتے تو بس پھڑوں کے ناٹے، چیتوں کے چٹاخے اور چٹکیوں کی سسکیاں شروع ہو جاتیں۔ بظاہر مولوی صاحب صرف میرا بازو پکڑ کر ہلا دیتے۔ لیکن نہایت ہوشیاری سے انگوٹھے اور کلمہ کی اُنگلی ملا کر چکا چوند کرنے والی چٹکی لے لیتے، جو آستین ہی میں جذب ہو کر رہ جاتی۔

ہم "کافروں" سے وہ بارہا کہہ چکے تھے کہ باجہ کی آواز پر لاحول بھیجا کریں اور اس کا قطعاً کان نہ دھریں۔ کیونکہ قیامت کے روز دجّال باجہ بجاتا آنے والا ہے اور باجے کے شوقین لوگ اُس کی آواز پر دوڑیں گے اور دوزخ میں جائیں گے۔

ہم لوگ چُپ ہو کر توشہ عقبیٰ سمیٹنے میں لگ جاتے۔

وہاں سے چھوٹ کر آتے۔ آپا کچھ تل رہی ہوتیں۔ کیا مجال جو مجھے یا چھو کو ایک مکھی برابر آنا دے دیں۔ کچھ بھی کڑھائی میں ڈال لینے دیں۔ چھو تو خیر گھی کا لڈو ٹیڑھا بھی بھلا ہے "عورت ذات" تو پانچوں انگلیاں پانچوں چراغ ہونا چاہیئے۔ ورنہ نہ معلوم کس کے گھر جا کر آگ لگاؤں۔ مگر اس وقت میرے سگھڑاپے کا سوال بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ وہ تو جس وقت کھیلنے

میں میرا داؤں آئے گا فور اًمیرے سگھڑ اپے کا خیال بھی آئے گا اور کمر بند سینے یا اور کوئی ردّی سی بدشکنی شے میں بھیجا مارنے کا حکم نہ ملے گا اس وقت تو حکم ملتا ہے بس چلو یہاں سے، کفگیر دوں گی جواب کے آئی۔ کرڑکرڑاتا تیل ہاتھ پہ رکھ دوں گی جو تونے لگنی کو ہاتھ بھی لگایا۔ اب کے آٹا مانگا تو جلتا جلتا انگارہ ہتھیلی پہ رکھ دوں گی۔ دیکھو بھئی اماں یہ نہیں مانتی" وہاں سے حکم ملتا ہے "مارو،" لیجئے!۔

اب کھیلنے کہاں جائیں "پلنگوں پہ مت کھیلو، جھولا ہو جائیں گے،" "تختوں پر مت کودو، دھڑ دھڑ سے کان اڑے جاتے ہیں" چبوترے پر تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ انگنائی میں میری شوقین آپا کی کیاریاں مت کھوندو ورنہ ٹانگیں توڑ دیں گی۔ کبھی سِل سے ٹھوکر لگتی ہے تو کبھی لوٹا اوندھا ہو جاتا ہے کبھی سینی میں پیر پڑتا ہے تو کبھی بچے کے پالنے میں اُلجھے جاتے ہیں۔ کچھ نہیں تو کونے میں کھڑا ہوا بانس ہی ذرا سے بہانے سے دھڑام سے سر پہ آن پڑا۔ ساتھ ساتھ صابن دانی موری میں لڑک گئی اور جا کر سوئے ہوئے گتّے پر گرے۔ کیا آفت ہے۔ الٰہی یا تو ان بچوں کو اٹھا لے یا میری مٹی عزیز کر دے ایسے بچے بھی کہیں دنیا جہان میں ہوا کرتے ہیں۔ ہوں تو کوئی کاہے کو جیے۔ مختلف وزن اور لے کی ڈانٹوں کے بعد بٹھا دیئے جاتے کہ خبردار جو ذرا بھی ہلے۔ ہڈیاں توڑ دوں گی۔

رات کو بستروں کے سپرد کر دیئے گئے کہ "لو مرو" خیر مرنے سے پہلے ہنسی ہے کہ قابو ہی میں نہیں آتی۔ چلے آتے ہیں کھوں کھوں۔ کھی کھی۔ کھک لگ کھوں۔ حکم ملا کہ اب کے اگر سانس بھی لی تو گلا گھونٹ دیا جائے گا۔ اب سوئے تو خاک خواب شیریں کی توقع رکھ سکتے ہیں، سوائے اس کے کہ پڑے بھاگ رہے ہیں کتے۔ بندر، اُلّو۔ بیل پیچھے دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ بانی ہی پانی جس میں بھلے برابر مینڈک جو ہیاں ہی جو ہیاں گاڑی چڑھی چلی آتی ہے۔ اکنیاں ہی اکنیاں پڑی ہیں۔ خوشی خوشی جمع کر لیں۔ کس کے مٹھیوں میں پکڑ لیں۔ آنکھ جو کھلی تو مٹھیاں تو ویسی ہی گھٹی ہوئی ہیں اور اکنیاں غائب۔ جو روئیں تو آواز آئی۔ اے ہے رات کو بھی چین نہیں۔ چپ۔ نہیں تو دے دوں گی کتے کو اٹھا کر" صبح کو پھر وہی منجن اور وہی، تم۔ اب۔ اولاب۔ . . . . . معاذ اللہ۔ گویا سوراج ملا ہوا ہے۔ اپنی لا جدھانی ہے۔ ستر میں

لیٹے لیٹے چائے پی۔ اُٹھ کر ناشتہ کیا۔ سج سجا کر دفتر گئے۔ کھانا وقت سے ذرا دیر میں ملا اور نوکر پٹا۔ بوٹی خوب اور گلی ہوئی ملتی ہے انڈے کھاتے ہیں جب تک چاہو غل مچاؤ اور ہنسو۔ بالکل شور نہیں ہوتا۔ پلنگوں پر چاہے جتنا کودو جھولا نہیں ہوتے اور جو ہوتے ہیں تو حامد پٹتا ہے تخت پر کتنا ہی کودو کسی کے کان نہیں اڑتے۔ چاہے سارے آٹے کو لے کر کڑھائی میں ڈال دیں کوئی کفگیر نہیں مارتا۔ آپا منجن ضرور تیار کرواتی ہیں اور گھستے بھی لگتے ہیں مگر مکھن اور مینو کے۔ ہمیں نو نرم برش اور خوشبودار کریم کافی ہے۔ کسی قسم کے ماسٹروں کے آنے کا قطعی حکم نہیں۔ صرف میوزک ماسٹر آسکتا ہے وہ بھی بعض وقت محض سستی کی بنا پر بھگا دیا جاتا ہے بات یہ ہے کہ ہم اب بچے تھوڑی ہیں جب کہ کوئی فکر نہ تھی۔ آزاد زندگی بھولپن از مانہ پیاری پیاری باتیں، سکھ کی نیند۔ کاش بچپن پھر ایک دفعہ . . . خیر۔

تاریکی

چاند کی آخری تاریخوں میں ——— جب چاند غائب ہو جاتا ہے اور چمگادڑیں ٹھٹے لگاتی ہوئی سیاہ فضا میں غوطے لگاتی ہیں ——— مجھ پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

"آموں والے باغ کے پیچھے!"

اُس دن میرے کانوں میں کوئی گنگنا رہا تھا۔۔۔ لیکن پھر وہی۔ کہیں یہ بھی اسی کی طرح نہ چڑکہ؟ ——— پھر۔

۔۔۔ میں نے یوسف سے کہا "یار میری آواز بنا کر حاضری بول دینا اور سیدھا اسٹیشن کی طرف اُڑا۔ ابھی گیارہ بجنے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ میرے ہاتھ نہ جانے کیوں کانپ رہے تھے۔ میں نے چڑ کر دو پیگ اور پی لئے اور دیر تک ویٹنگ روم کے سامنے ٹہلتا رہا۔

"ٹھناں ——— ٹھن" گیارہ کا گھنٹہ ایک گھن کی طرح میرے کلیجہ پر پڑا۔ دو دفعہ پیر پیڈل پر سے پھسل کر واپس پیڑھی سے ٹکرایا۔ تیسری کوشش میں دوسری طرف گرتے گرتے بچا۔ آج سائیکل بھی زور دکھا رہی تھی۔ جیسے اُسے میری کمزوری کا پتہ چل گیا ہو۔ ہوا ایک بپھری ہوئی ناگن کی طرح میری سائیکل کے پہیوں سے زور آزمائی کر رہی تھی۔ آگے کا پہیہ مست شرابی کی طرح جھوم رہا تھا۔ بس سائیکل سے چمٹ جانا چاہتا تھا۔ "ڈگی" والی سڑک سے ہوتا ہوا اپنے ہاتھ والی "کچی" سڑک پہ مڑ گیا۔ دھول اور گڑھے، شام کو گذرنے والے مویشیوں کی غلاظت، ان سے بچتا ہوا دودھ پور کی سڑک پر نکل گیا۔ "آ گئے بابوجی!" اس نے پلیے

نیچے رینگ کر کہا۔" اوں۔ کب سے ٹھاڑ ہیں"، وہ روٹھنے کے انداز سے بولی۔

میں نے سائیکل کو پیڑ سے لگا کر ڈال دیا اور ایک راجے کی طرح پلیا پہ بیٹھ گیا وہ میرے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھ کر اندھیرے میں میری آنکھیں ڈھونڈنے لگی۔ مگر رات اندھیری تھی۔" ارے تجھے ٹھنڈ نہیں لگتی"، میں نے اندھیرے ہی میں اُسے ٹٹولا۔ وہ گرم پانی کی بوتل کی طرح گرم اور پسیجی ہوئی تھی اس نے صرف ایک گہری سانس لی اور ہنس دی۔

" اہنوں!" میں نے پسینے، باسی کھانے اور خاک دھول میں بسے بھبکے سے بولا کر کہا۔" چڑیل!"

" کا کرے ہیں۔" ہی ہی ہی۔ وہ پھر ہنسی اور اپنے سر کو کھجانے کی کوشش کرنے لگی۔ بالوں کا جال۔ سڑے ہوئے تیل، خاک اور میل میں گندھے ہوئے سر پہ ایک ٹوپی کی طرح منڈھا ہوا تھا مگر پلیا کے نیچے سڑنے والے پتوں کی گہنگ آم کے تازہ تازہ بور کی خوشبو۔ خود اس کے جسم کی بساند مل جل کر مجھے بدحواس کرنے لگی اس کا بات بات پر کھلکھلانا۔ کانسی کے کڑوں کی جھنکار۔ میں۔ سب کچھ بھول گیا —— دور فضا میں چمگادڑ نے قہقہہ مارا۔ میری پیٹھ پر کنکھجورے سے رینگنے لگے۔ ہوا دق کے مریض کی طرح لمبی لمبی سانسیں کھینچ رہی تھی۔ رات کی کالونچ اور گہری ہو گئی۔

جب میں لوٹا تو صفیہ کے کمرے میں ابھی تک لالٹین جل رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ زینے پہ چڑھنے لگا۔ لیکن شاید وہ جاگ گئی۔ کیونکہ روشنی غائب ہو گئی۔ میرا سر جھک گیا۔

" صفو!" میں نے صبح اسے پیار سے کہا۔

" ہاں بھیا"، وہ دوپٹہ اوڑھتی ہوئی کمرے سے نکلی۔ اس کی آنکھوں سے رات کو جاگنے کے آثار صاف ظاہر تھے، ہلکی سی زردی کی جھلک اور آنکھیں جھکی ہوئی۔ میرا جی چاہا کہ دوڑ کر اس کے پیر پکڑ لوں۔ میری ننھی سی بہن جو بیک وقت میرے لئے ماں، بہن اور خادمہ کی خدمت انجام دیتی تھی، اُف۔ کس قدر پاجی ہوں میں بھی —— میں سر جھکائے چائے پیتا رہا اور وہ میرا سویٹر بنتی رہی۔

میں نے زینے پر چڑھتے میں ایک دھاری دار قمیص سے ڈھکا ہوا کندھا دیوار کے بالکل قریب دیکھا۔ جو فوراً غائب ہو گیا۔ "ہیں!" میں اچھل پڑا۔ "یہ کمینہ جھانکا کرتا ہے" میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے صفیہ سے کچھ نہ کہا۔ وہ باورچی خانہ میں انگیٹھی پر جھکی ہوئی کچھ تل رہی تھی۔ میں پلنگ پر بیٹھ کر بوٹ کے تسمے کھولنے لگا۔

نہ جانے کیوں میں جس وقت بھی گھر میں گھستا میری آنکھیں بے اختیار اس دیوار کی طرف اٹھ جاتیں جو ہمارے پڑوسیوں اور ہمارے درمیان کھنچی ہوئی تھی اور جس نے ایک گھر کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر کے دو خاندانوں کے رہنے کا انتظام کر دیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی ادھر سے جھانک کر ہمیں دیکھا کرتا ہے۔ میرا شبہ یقین کو پہنچ گیا۔ جب کہ میں نے دھاری دار قمیص والا کندھا دیکھنے کے بعد ایک روز موٹی موٹی بھووں والی پیشانی کا کچھ حصہ اور گچھے دار مردانہ بالوں کی جھلک دیکھی اور پھر ایک روز چار مضبوط بھوری انگلیاں دیوار پر تھوڑی دیر جمی رہنے کے بعد غائب ہو گئیں ——— کوئی تیزی سے دیوار کے پاس سے ہٹا ——— میرا سر گھومنے لگا۔ اور فوراً میری نگاہیں صفیہ پر گئیں۔ وہ بالکل بے خبر دھوپ میں پھیلی ہوئی ساڑھی کو الگنی پر سے گھسیٹ کر اتار رہی تھی۔ شکر ہے کہ اس نے بدمعاش کو جھانکتے نہ دیکھا۔ ورنہ اس کے دل کو سخت رنج پہنچتا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ آج ان لوگوں کو ٹھیک کروں گا۔ لفنگے کہیں کے۔ بدمعاش!

ارے یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ آموں والے باغ میں بور جھڑا آم لگے اور پک گئے ——— امتحان ایک طوفان کی طرح ٹوٹ پڑے۔ کہاں کا آموں کا باغ اور کہاں کی اندھیری راتیں۔ جدھر دیکھو دو چار سر کتابوں پر جھکے ہوئے رہتے ہیں۔ پھٹی ہوئی بے رونق آنکھیں۔ کھلی ہوئی جمائیاں۔ دبی ہوئی انگڑائیاں گاڑھی چائے کی بھی بس کی نہ تھیں۔ طالب علم کی زندگی میں سال میں دو ہی تو کٹھن وقت ہوتے ہیں ——— ایک امتحان سے کچھ پہلے۔ شب بیداری اور دوسرا نتیجے کے وقت ——— خدا کی پناہ! سب سنسار کو بھول کر میں بھی اسی طوفان میں بہ گیا۔

نیا سیشن، نئی صورتیں اور نئی دلچسپیاں لے کر آیا اور پھر وہی ہم ——— وہی پروفیسروں کی غیر دلچسپ آواز۔ وہی جیسا چودہ برس سے ہم دیکھتے آئے تھے۔ وہی سامنے کالا کالا بورڈ۔ میز کرسی اور پروفیسر

جب میرس روڈ کے چکر لگاتے لگاتے ٹانگیں شل ہو گئیں۔ گرلز کالج کی ہر ہوا خوری کی دل دادہ اُستانی کو ہر ممکن زاویہ سے دیکھ کر ان پر ہر قسم اور لے کے شعر پڑھ چکے تو اسٹیشن ہی سکون اور دلچسپی کی جگہ رہ گئی۔ لہٰذا حسبِ معمول وہاں کا رُخ کرنا پڑا۔ وہاں سے کم پی کر زیادہ ظاہر کرتے ہوئے جیسے ہی میں اور یوسف سیڑھیوں کے قریب پہنچے، پیچھے سے کسی نے کہا "بابو جی!"

اور یقین مانئے وہ مع اپنی گل بساندا ور بدبو کے موجود تھی۔

"ہای" اس نے گودڑ کی ایک پوٹلی کو کریدتے ہوتے اشارہ کیا۔ جیسے کسی نے مجھے پیچھے گھسیٹ لیا۔ "پھر ——— یں" ایک بہت حقیر انسانی کیڑے نے کلبلا کر سوکھی ہوئی مٹھیاں ہوا میں اُچھالیں ——— وہ فاتحانہ مسکراہٹ سے کبھی اس کینچوے کو اور کبھی مجھے دیکھتی رہی۔

"اہیں ——— یہ ٹھاٹ ہیں ———!" یوسف نے قہقہہ لگایا۔

"بابو جی!" اس نے مجھے پھر پکارا ——— مگر ہم پیدل مار کر نکلے چلے گئے میں نے مڑ کر دیکھا تو ——— وہ ایک تانگہ کے پیچھے چیختی چلاتی بھیک کے لئے دوڑ رہی تھی۔ گودڑ کی پوٹلی میں سے دو ٹانگیں ——— سرخ سوکھی ہوئی ٹانگیں لٹک رہی تھیں۔ موڑ پر موٹر سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ آگے سڑک سنسان اور تاریک تھی۔

جب میں پلنگ پر لیٹا تو ایسا معلوم ہوا کہ کمرے کی ہر چیز گھوم رہی ہے اور ——— وہ دو سرخ خونی ٹانگیں میرے سامنے بےکسی سے جھول رہی تھیں۔ صرف دو ٹانگیں۔ دہکتے ہوئے لوہے کی دو سلاخوں کی طرح میری آنکھوں میں گھسی جا رہی تھیں۔ میں نے بچنے کی کوشش نہ کی۔ گھس جاؤ کمبختو میرے دماغ میں ——— اُف کتنا اندھیرا تھا کمرے میں!

صبح ایک عجیب ذہنی دُکھن نے مجھے پست کر دیا تھا۔ میں اپنی کمزوری پر جھنجلا اُٹھا ——— "اونہہ! آخر میں ہی کیوں اس قدر حساس ہوں۔ ہونے دو ——— کیا ہوا پھر؟ ——— یہ سب

کمزوری ہے ۔۔۔۔۔ کمزوری ۔ یعنی اس میں ایسی بات ہی کیا ہے ؟ کون سا غضب ہو گیا ؟ اور کیا ایک میں ہی ہوں ؟" ۔۔۔۔۔ مگر میرا جی چاہا ۔۔۔۔۔ کوئی اس چبھن کو جو ایک پیسے کی گولی کی طرح میرے دماغ میں کانوں کے ذرا پیچھے اڑی ہوئی تھی ، نکال دے ۔ مجھے پھر غصہ آیا ۔۔ اپنی کمزوری پر ۔۔۔۔۔ میں کالج سے جلد ہی لوٹ آیا صفیہؔ اداس اور خاموش بیٹھی تھی مجھے دیکھ کر جیسے ڈر کر چونک پڑی ۔ میں بڑی دیر تک اس سے پیار کی باتیں کرتا رہا ۔

" تمہارا نام لکھوا دوں گا اسکول میں " ، میں نے کہا ۔

" وہاں میری کلاس میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ہوں گی مجھے شرم آئے گی ." وہ پریشان ہو کر بولی ۔ گو ہمیشہ سے وہ پڑھائی کی شوقین تھی ۔

" تو کیا ہوا ! " میں ہنسنے لگا ۔

" وہ چھیڑیں گی ، " اس نے گھبرا کر کہا ۔ نہ جانے اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد کیوں تھا ۔ کمزور اور نحیف ۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کسی طرح تو اسے بہلاؤں وہ کس قدر اداس اور خوف زدہ تھی ۔ میں نے دیوار کی طرف دیکھا ۔ شکر ہے کہ وہاں سے اب کوئی نہیں جھانکتا ۔ مکان دو مہینے سے خالی ہو چکا تھا ۔ میں اطمینان سے کالج چلا گیا ۔

زینے پر چڑھتے ہوئے مجھے کسی کی گھٹی ہوئی آہ سنائی دی ۔ میں خاموش کھڑا ہو گیا ۔ پھر وہی آہ ۔ جیسے کوئی چیز میرے پیروں کے نیچے دبی تھی اور میرے چلنے سے کچلی چلاتی تھی ۔ ایک اور آہ ۔ اور میں تیزی سے اوپر پہنچ گیا ۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر برآمدے میں کھڑا رہا " آہ " صفیہ کے کمرے میں سے ! میں جلدی سے چلا ۔۔۔۔۔ " صفیہ ۔۔۔۔۔ صفو ! " میں نے پکارا ۔ وہ پلنگ پر لیٹی کیا آڑی پڑی تھی ۔۔۔۔۔ مجھے آتا دیکھ کر اس نے جلدی سے رضائی اوڑھ لی اور گٹھری بن کر پڑ رہی تکلیف اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی ۔۔۔۔۔ دکھ سے اس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں ۔ اور اس نے اس طرح مجھے ڈر کر دیکھا گویا کوئی جن یا دیو ہوں میں کہ اسے کھا جاؤں گا ۔ میں اس کے پلنگ پر بیٹھ گیا ۔

" کیا ہوا صفیہ ! کہاں ہے درد ؟ کیا بخار ہے ؟ میں نے اس کی پیشانی پر سے بال سمیٹے ۔ وہ تکلیف کی وجہ سے کچھ نہ بول سکی ۔ مگر اس نے گہری گہری سانسیں لینا شروع کیں اور

بل کھا کر تکلیف کو چھپاتی رہی۔

" اوںہہ۔ یہ رضائی کو اتارو۔ کس قدر گرمی ہو رہی ہے ——— افوہ! ——"

اور وہ رضائی کو زور سے پکڑ کر اوندھی ہو گئی۔ اُس نے گھٹی ہوئی آہ کو دبا دیا —— میں بڑی طرح گھبرا گیا —— یا اللہ! وہ ذبح کی ہوئی مرغی کی طرح اکڑ اکڑ کر تڑپ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے سائیکل اُٹھائی اور کالج کی طرف اڑا —— ڈاکٹر ڈیوٹی پر تھے۔ نفیس کہیں باہر گئے ہوئے تھے ——— اوہ میرے پیر کانپنے لگے ..... صفیہ کی معصوم شکل آنکھوں میں پھرنے لگی —— میں نے دیکھا بھی نہیں۔ کتنے دن سے وہ سست اور بیمار نظر آتی تھی۔ حد ہوتی ہے لاپروائی کی بھی۔ میں ملازمتیں کرتا زنّاٹے سے چلا —— ریذیڈنٹ بھی موجود نہ تھے بس نیوز لیڈی ڈاکٹر۔ میں تیزی سے گھسا چلا گیا۔ کمبخت سینما جا رہی تھی میں نے کچھ ایسا بولا کہ فوراً تیار ہو گئی۔ میں نے پتہ بتایا اور چلا موٹر کے پیچھے۔ میرا دل چاہتا تھا پیروں میں انجن لگ جائے اور کسی طرح موٹر سے آگے نکل جاؤں —— معلوم ہوتا تھا۔ پیچھے کھسک جاؤں گا، خیر!

وہ اندر گئی اور مجھے باہر روک دیا۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں، سامنے لالٹین سسکیاں لے رہی تھی۔

"اوہ —— آپ لوگ —— کتنا بے وقوف —— جلدی کیجئے —— فوراً جایئے، ڈِسی کو بولئے بڑا بکس لے کر آئے"، اُس نے واپس آکر کہا۔

"مس صاحب ——" میں نے کہا۔

"بس —— چلئے چلئے جلدی کریئے۔ جب کیس بگڑ جاتا ہے تو ہمارے پاس ہوتا ہے۔ آپ —— اور کوئی سامان بھی نہیں آپ کا پاس کیسا جنگلی ہوتا۔ ہندوستانی لوگ ——"

مجھے کھڑے دیکھ کر وہ پھر دھاڑی۔ "آپ کا بیگم صاحب کا جان ڈینجر میں ہے —— اور آپ ——"

" میری بہن —— مس صاحب ——" میں نے جھینپ کر کہا۔ بے ہودہ کہیں کی! جی چاہا تھپڑ دوں۔

" وہ کوئی بھی ہے — بچہ مر چکا ہے اور لڑکی بیہوش ہے — آپ — جلدی۔"

....

سنن سنن۔ جیسے گولیاں چلیں۔ دور چمگادڑ نے ایک کریہہ قہقہہ لگایا — اور غوطہ مار کر میرے اوپر سے نکل گئی — دروازے کی چوکھٹ اچھل کر میرے ماتھے پر لگی — اور پھر — تاریکی!

بنّے

زمانہ : موسم سرما ۳۷ء۔

وقت : صبح جس وقت کالج شروع ہوتے ہیں اور گھر کی مالکہ نوکروں سے سر مار کر چین سے سینے پرونے میں مشغول ہو جاتی ہے۔

افرادِ ڈرامہ

بنّے : ایک تندرست، خوش وضع، خودسر، خود رائے اور منہ پھٹ، پھوہڑ اور لڑاکا، بلا کا ذہین اور پڑھنے کا شوقین، بزرگوں کی باتوں میں پٹاپٹ بولنے والا مگر الّہ بی کی نظروں میں "گھی کا لڈو"

زہرہ : دبلی پتلی ڈرپوک سی لڑکی۔ چڑ کر جلدی سے بسور دینے کی عادی اور الّہ بی کے رعب کی قائل۔ بنّے سے ایک منٹ نہیں بنتی۔ الّہ بی کے بتائے ہوئے فیشن کے مطابق سادگی پسند، سلیقہ مند، سگھڑ۔ بنّے کی خالہ زاد بہن۔

الّہ بی : ۵۰ سالہ کنواری خاتون۔ عمر سے زیادہ معمّر بننے کا شوق۔ بھانجے اور بھانجی کی پرورش اپنا پیدائشی حق سمجھتی ہیں۔ زہرہ کو ہر وقت "دابتی" رہتی ہیں اور بنّے کو سر چڑھا رکھا ہے۔

ڈپٹی صاحب : "خوشحال" وضع کے ۴۵ سالہ مرد۔ بہت تندرست۔ سر کے بال اڑے، توند بڑھی ہوئی۔ سرخ رنگ۔ بڑی بڑی آنسو بھری آنکھیں۔ پھولی ہوئی مونچھیں۔ ٹھنگنا قد۔ بیوی اور دو بچے موجود ہیں۔ لیکن زہرہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔

الّو : بڑی بڑی آنکھوں والا معصوم نوکر۔ تمام رشتہ دار۔ جو خوب پٹتا بھی ہے، سینما اور

گلی ڈنڈے کا عاشق۔

بچے: مختلف ناپ اور تول کے سب پڑوسیوں کے۔

اسٹیج: ایک دروازہ پشت پر اور دو دائیں بائیں۔

لباس: معمولی۔ مگر نہ ایسے کہ اسٹیج سونی معلوم ہو۔

پہلا سین

(درمیانی درجہ کا ہندوستانی وضع پہ آراستہ کمرہ۔ چاندنی اور قالین کے علاوہ دو تین آرام کرسیاں، ایک آدھ چوکی اور اسٹول، ایک دروازہ پشت پر، دو دونوں اطراف میں، بیچوں بیچ فرش پر الہ بی سینے پرونے کا سامان رکھے کچھ سینے میں مشغول ہیں۔ زہرہ داہنے دروازے سے ایک سویٹر بُنتی ہوئی داخل ہوتی ہے۔ اگرچہ کچھ بدمزگی سے آرام کرسی پہ بیٹھ جاتی ہے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے)

زہرہ: الہ بی آپ اس کی . . . بنے کی حرکتیں دیکھتی ہیں اس نے تو میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ جب دیکھو جب کوئی نہ کوئی آفت مچائے رکھتا ہے۔ میرے کمرے میں جاتا ہے تو ساری چیزیں اُلٹ پلٹ کر دیتا ہے کبھی میری چیزوں سے اُسے کیا واسطہ۔ مگر نہیں وہ تو میرا ہی البم بیٹھ کر دیکھے گا۔ میری ہی کاپیوں میں سے ورق پھاڑ پھاڑ کر پرچے لکھے جائیں گے۔ میرے ہی صابن سے تھوتھنی دھوئی جائے گی میری ہی صراحی سے پانی پئے گا۔

الہ بی: اوئی! ذرا تمہاری صراحی میں سے پانی پی لیتا ہے تو بس مر گئیں۔

زہرہ: (تنک کر) مر گئیں! اور جو میری کاپیوں کا ستیاناس لگائے تو؟ میری چپل میں اپنا پھاوڑے جیسا پیر ڈال ڈال کر توڑ ڈالے تو؟ میری کیاریوں میں جان کر پیر رکھ دے تو؟ اور میری دری پر مٹی بھرے جوتے رکھے تو؟ ایک بات ہو تو کہوں۔ الہ اماں تم تو اس کی ہی طرفداری کرتی ہو۔ تم سے کچھ کہتا تو اُلٹی ڈانٹ سُننا ہے۔

الہ بی: ہاں بیٹی وہ ذرا لاپرواہ ہے۔ کیا ہوا وہ ذرا تجھے چھیڑتا ہے۔ تم ہو کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتیں۔ بات بات پر ناچی جاتی ہو۔

زہرہ : وہ لاپروا ہے تو میں کیا کروں۔ وہ "ذرا" چھیڑتا ہے کہ مجھے کھائے لیتا ہے میرا تو بات کرنا دوبھر ہے۔

الہ بی : تُو بھی اُسے ایسی باتیں سُناتی ہے کہ بس توبہ ہی بھلی۔

زہرہ : اور پھوہڑ اتنا کہ بس سارے کمرے میں جوتے ٹوپیاں پھیلی پڑی رہتی ہیں قمیصیں ہیں تو وہ چارپائی کے نیچے۔ اچکنیں ہیں تو وہ چارپائی کے نیچے۔ کتابیں ہیں تو فرش پہ ماری پھِکتی ہیں اور میز پر خدا جانے کہاں کا کباڑ لدا رہتا ہے۔ مجھ سے تو صاف نہیں ہوتا اس کا کمرہ۔

(قریب کے کمرے سے پیروں کی چاپ اور سیٹی کی آواز سنائی دیتی ہے زہرہ غور سے کان لگا کر سنتی ہے، چھن سے کسی برتن کے ٹوٹنے کی آواز آتی ہے۔ زہرہ چونک کر ہزاروں شکنیں چہرے پر ڈال لیتی ہے۔

دروازے میں ننّے ایک ٹوٹے ہوتے گلدان کے ٹکڑے لئے ہوئے آتا ہے۔ چہرے پر مصنوعی خوف اور دبی ہوئی ہنسی کے جذبات۔ آنکھیں چڑھا کر کندھوں کو جنبش دیتا ہے اور گلدان کے ٹکڑے آہستہ سے زہرہ کی کرسی کے پاس رکھ دیتا ہے اور ہاتھ پُشت پر رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ گویا کوئی بڑا اچھا کام کر کے لایا ہے اور وہ داد کا طالب ہے)

زہرہ : اب دیکھ لو الہ بی۔ اب بھی مجھ کو الزام دو گی۔ ننّے! یہ میرا گلدان کیسے ٹوٹا؟

ننّے : (قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے) عجب جاہلانہ سوال ہے۔ کیسے ٹوٹا۔ ہونہہ! ارے کیسے ٹوٹتا ہے۔ ارے میں ذرا ادھر ہٹا اور یہ آپ ہی آپ آن پڑا۔

زہرہ : آپ ہی آپ آن پڑا اب گلدان کے بھی پیر ہو گئے۔ آخر تم میرے کمرے میں گئے ہی کیوں تھے؟

ننّے : ہم تمہارے کمرے میں یونہی گئے تھے . . . . ذرا تمہارا قلم لینا تھا۔

زہرہ : میرا قلم! تمہیں میرا قلم لینے کا کیا حق!

ننّے : (نہایت سکون سے کرسی پہ پھیلتے ہوئے) حق وق تو ہم جانتے نہیں۔ ہمیں ضرورت

ہنسی تو ہم تمہاری ہی چیزیں لیں گے۔ ہمارا قلم کھو جو گیا۔

زہرہ: تمہارا قلم کھو گیا تو کیا میں نے کھو دیا؟

بنّے: پھر وہی کوڑھ مغزی۔ ارے تم نے کھویا یا میں نے کھویا یا کُتّے بلیّوں نے کھویا قلم تو کھو گیا۔

زہرہ: یہ خوب زبردستی ہے۔

بنّے: کیا کیا جائے مجبوری ہے۔

زہرہ: (بھنّا کر) اب آپ بی چپکی بیٹھی ہو۔ ہاں کہہ دو کہ میرا ہی قصور ہے (رونی صورت بنا کر سویٹر بننے لگتی ہے)

آپ بی: نہیں مانے گا بنّے۔ سچ تو ہے تو بہت دق کرتا ہے۔

بنّے: ارے آپ بی آپ اسے نہیں جانتیں۔ یہ کیا کم مجھے دق کرتی ہے۔ گھُنّی ہے گھُنّی ورنہ یہ تو دھامن ہے۔ جس کے کاٹے کا منتر ہی نہیں۔

آپ بی: بس ذرا سی بات میں رو دیتی ہے۔

زہرہ: (واقعی رو کر) لو دیکھ لو۔ آپ بی تو مجھے ہی الزام دیں گی (سویٹر اور سلائیاں پٹخ دیتی ہے اور ساری کے آنچل سے آنکھیں ملنے لگتی ہے۔ بنّے چپکے سے سویٹر میں سے سلائیاں گھسیٹنے لگتا ہے اور آہستہ آہستہ اُدھیڑتا ہے)

بنّے: (پیار سے) اے زہرہ دیکھو تو تم نے کیسا خراب بُنا ہے سارا اُدھڑا جا رہا ہے۔

زہرہ: (سویٹر چھین کر) ہائے اللہ ارے کمبخت یہ آخر سلائیاں کیوں نکال دیں۔ اتنی مشکل سے تو بُنا۔ اور . . . .

بنّے: کیا۔ آ۔ اتنی مشکل سے تو بتلاؤ اس سے اچھا تو میں بُن دوں۔ شمیم ایسا اچھا بُنتی ہے۔ کہ تم تو مر کے بھی نہ بُن سکو۔

زہرہ: بی اماں میری تو زندگی اس گھر میں ہو چکی۔ یا تو بنّے بنّے ہے اور یا میں ہی رہوں

بنّے: (مُنہ چڑا کر) بنّے ہی رہیں یا میں۔ ارے ہمیں خود ہر وقت فکر رہتی ہے کہ کسی طرح تمہارا مُنہ کالا کر دیں۔ مگر کوئی آنکھ کا اندھا قبولے جب تو۔ ایسی پھوہڑ، لڑاکو لڑکی

سے کون بیاہ کرے گا۔ موتی ہاتھ بھر کی زبان (الہ بی کی آواز کی نقل کر کے) جس گھر میں جائے گی آگ لگا دے گی۔ ذرا ذرا سی بات پر تِن تِن تِن تِن۔

(زہرہ بڑبڑاتی جھلاتی، جلدی سے اُٹھ کر چلی جاتی ہے اور دھڑ سے دروازہ بند کر لیتی ہے)

بنّے: توڑ ڈالو بٹو۔ اب دروازے کی چولیں بھی اُتار ڈالو۔

الہ بی: (محبّت کی خفگی سے) اے بنّے کیوں اسے کھائے لیتا ہے۔

دوُسرا سین

(بنّے کا کمرہ، کاہلی اور پھوہڑ پنے کا بہترین نمونہ۔ کمرہ کیا ہے عجائب خانہ ہے۔ ایک پلنگ، دو تین کرسیاں۔ دو تین میزیں بے ترتیبی سے اڑی ہوئی ہیں۔ پلنگ پر معلوم ہوتا ہے کتے لوٹ کر گئے ہیں۔ علاوہ اُلٹے سیدھے تکیوں کے اور بہت سی غیر ضروری چیزیں از قسم ہتوڑی، کیلیں، میلا موزہ، اچکن، کاغذ، چاء کی پیالی، گلاس، دیا سلائی حتّٰی کہ پالش کی ڈبیہ اور دانتوں کا برش بے ترتیبی سے بکھرے ہوتے ہیں۔ کتابیں میز پر اس طرح ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں کہ گویا ابھی ان میں جان تھی اور بر سرِ پیکار تھیں بہت سی کاپیاں اور کتابیں آدھی کھُلی پڑی ہیں۔ سارے فرش پر جوتوں اور چپلوں کا انبار پڑا ہے۔ ایک کونے میں انگیٹھی اور چائے بنانے کا سامان رکھا ہے۔ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ شب کے آخری حصّہ میں چائے بنا کر پی گئی ہے کچھ جلے ہوئے کاغذ کمرے میں پریشان ہیں۔ آدھا جلا ہوا کاغذ انگیٹھی میں اب تک ٹھُسا ہوا ہے۔ پاس ہی ایک مگ میں کانٹا چھُری کھڑے ہیں زہرہ کمرے میں ذرا ہچکچاتی داخل ہوتی ہے۔ حقارت اور پریشانی کے جذبات چہرہ سے ظاہر ہیں۔ سب چیزوں پر ایک پریشان نظر ڈالتی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ کدھر سے کمرہ صاف کرنا شروع کرے کرسی پر لحاف اس طرح رکھا ہوا ہے جیسے کوئی سردی سے بچنے کے لئے اس کا گھونسلا سا بنا کر بیٹھا تھا اور ابھی اُٹھ

کہ گیا ہے اُسے اُٹھاتی ہے مگر پھر کچھ نہ سمجھ کر رکھ دیتی ہے)

زہرہ: اُونہہ (پریشانی اور تھکی ہوئی نظروں سے پلنگ کو دیکھتی ہے) بھلا کوئی کیسے صفائی کرے جب انسان کی روح ہی گندی ہو۔

(کتابوں کی میز پر سے دو ایک چیزیں اُٹھاتی ہے۔ پھر رکھ دیتی ہے۔ پلنگ پر سے بھاری چسٹر اُٹھاتی ہے۔ اُس میں لپٹی ہوئی چادر کھنچی چلی آتی ہے اور بہت سی پنسلیں، ڈبیاں، دیا سلائیاں جھڑنے لگتی ہیں ایک چھپکلی پھدک کر دیوار پر جا بیٹھتی ہے۔ زہرہ ڈر کے ہل کے مارے، کر کے پیچھے ہٹتی ہے بنّے آتا ہے)

بنّے: (چنگھاڑتا ہے) اچھا.... آ..... پکڑی گئیں نہ آج! ارے جبھی میں کہوں یہ میری چیزیں کون اُڑا لے جاتا ہے۔ کل میری ساری شکر کوئی کھا گیا۔ میں سمجھا چوہے ہیں۔ اور آج پتہ چلا کہ جناب ہیں.... دو ٹانگوں کی چوہیا۔

زہرہ: ہوش میں رہنا۔ ایک تو میں کمرہ صاف کرنے آئی اور.....

بنّے: یہ ایک دو تو مجھ سے نہ چلے گی اونہک۔ سیدھی طرح میری چیزیں لائیے۔

زہرہ: بھاڑ میں جائیں تمہاری چیزیں۔ میں کیا جانوں۔

بنّے: بھاڑ میں جاؤ تم خود۔ لو صاحب ایک تو چیزیں غائب۔ اوپر سے غرّانا۔ مگر یہ تو بتاؤ جب میں نے تمہیں منع کر دیا ہے کہ خبردار میرے کمرے میں قدم نہ رکھنا ورنہ ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ تو...

زہرہ: چُپ بدتمیز بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ آئے کہیں سے ٹانگیں توڑنے والے۔ میں کیوں آتی۔ اماں بی نے بھیجا کہ ذرا کمرہ صاف کر لو مہمان آ رہے ہیں۔ کمرہ تمہارا بھوڑوں[1] سے بدتر۔ تمہاری چیزوں کی جیسے میں بڑی بھوکی ہونا۔ ہیں بھی بڑی بہت سی چیزیں۔

بنّے: اب تمہاری بلا سے ہمارا کمرہ جیسا بھی ہے اور چیزوں کا کیا کہوں، لوگوں نے کمرہ

---

[1] ایک خانہ بدوش قوم جو چور بھی ہوتی ہے۔ علی گڑھ میں بہت آباد ہیں۔

صاف کرنے کے بہانے سے جھاڑو ہی پھیر دی۔

زہرہ: مجھے غرض پڑی ہے جو میں صاف کروں (جانے لگتی ہے)

بنّے: چلیں کہاں .... جناب عالی پہلے میری چیزیں .... اور یہ کمرے کی جو ریڑ لگائی ہے وہ تو پہلے ٹھیک کیجیے۔ ورنہ.....

زہرہ: ورنہ؟ ورنہ؟ تم کیا کرلوگے۔ بیہودہ کہیں کے۔

بنّے: جانتی ہو میرا غصّہ بڑا ہے۔

زہرہ: (ہنس کر) بڑا جناب کا غصّہ۔ ہوش میں ذرا۔

بنّے: اچھا اب دانت مت نکالو۔ جھاڑو سنبھالو اور کام شروع کرو چو ہیا۔

زہرہ: بدتمیز (تھپڑ اٹھاتی ہے) بنّے ڈر کر پیچھے ہٹتا ہے میز پر سے گلاس لڑھک کر ٹوٹ جاتا ہے)

بنّے: توڑ ڈالا نا!

زہرہ: میں نے توڑا ہے۔

بنّے: نہیں بیگم صاحبہ تم نے کاہے کو توڑا۔ آخر تم میرے کمرے میں آئی ہی کیوں۔

زہرہ: تو میں دام دے دوں گی کتنے کا تھا۔

بنّے: کتنے کا تھا بڑی دام دیں گی لے کے ایک۔ تو سارے کمرے کو کھوند کر ڈال دیا اور اوپر سے ساری چیزیں توڑ ڈالیں۔

زہرہ: میں نے بگاڑا ہے تمہارا کمرہ!

بنّے: اور نہیں تو کیا ایسا تھا؟ ایسا؟ (کمرے کی چیزوں کو اشارہ کر کے) ایسے سامان پھیلا تھا؟ بھلا کوئی آدمی ایسے کمرے میں رہ سکتا ہے۔

زہرہ: (ہنس کر) تم آدمی ہو کب۔ جانوروں سے بدتر ہو۔

بنّے: اچھا کمرہ تو صاف کرو۔

زہرہ: نہیں کرتے۔

بنّے: (بڑی نرمی سے) پھر مہمان جو آئیں گے تو اللہ بی کیا کہیں گی۔

زہرہ: کہنے دو۔ میں کہہ دوں گی تم لڑتے ہو۔

بنّے: اچھا۔ اب نہیں لڑیں گے۔ بس وہ پلنگ صاف کر دو۔ باقی میں کر لوں گا۔

زہرہ: اور پھر چوریاں لگانا۔

بنّے: نہیں۔ بس وہ پلنگ اور یہ میز۔ اب کچھ نہیں کہیں گے۔

زہرہ: پلنگ میں نہیں چھوؤں گی اس میں چھپکلی ہے۔

بنّے: کیا چھپکلی تمہیں نگل جائے گی۔ یہ تم سب چھپکلی سے کیوں ڈرتی ہو۔

زہرہ: (میز پر سے کتابیں اٹھاتے ہوئے) ہمیں گندی لگتی ہے۔

بنّے: گندی لگتی ہے تم سے تو صاف ہی ہے۔ سب لڑکیوں کو گندی لگتی ہے۔

زہرہ: ہمیں ڈر بھی لگتا ہے۔

بنّے: آئے ہائے رے ڈر۔ کچھ فیشن ہی ہے۔ ساری لڑکیاں چھپکلی سے ڈرنا فرض سمجھتی ہیں۔ بر جیس بھی ڈرتی ہیں سلطانہ کا بھی چھپکلی سے دم نکلتا ہے رضیہ بھی مری جاتی ہے۔

زہرہ: واہ واہ فیشن کیوں ہوتا۔ وہ ہوتی ہی گندی ہے۔

بنّے: (ایک کالا کاغذ کا ٹکڑا زہرہ پر ڈال کر) سے۔

زہرہ: (ڈر کر پیچھے ہٹتی ہے) واہ کیا میں ڈرتی ہوں۔

(دونوں خاموشی سے کمرہ صاف کرتے ہیں۔ بنّے صرف چیزیں الٹ پلٹ کرتا ہے۔ کبھی کتاب کھول کر پڑھنے لگتا ہے۔ کوڑا اس طرح جھاڑتا ہے کہ سب زہرہ پر پڑے۔ پھر مسکرا کر "ارے معاف کرنا" کہہ دیتا ہے۔ زہرہ کچھ نہیں سمجھتی۔ بوجھل بوجھل کوٹ اور لحاف تہہ کر رہی ہے)

بنّے: یہ مہمان کون آرہے ہیں زہرہ؟

زہرہ: معلوم نہیں کوئی میرٹھ سے آرہا ہے۔

بنّے: (تھوڑی دیر سوچتا ہے) کیا عورتیں بھی ہیں؟ (جھٹ پھٹ کر کے کتابیں زہرہ کی طرف جھاڑتا ہے)

زہرہ: اونہوں۔۔۔ بھئی۔۔۔ ہاں عورتیں بھی ہیں۔

بنّے: ارے یہ کون لوگ آ رہے ہیں۔

(زہرہ خاموش چھلکے سے گندے موزے اُٹھا کر ٹوکری میں ڈالتی ہے)

بنّے: کیا مرد بھی ہیں؟

زہرہ: ہاں بھئی۔ دماغ چاٹ گئے۔

بنّے: (خاموش کچھ سوچتا ہے) اچھا..... آ..... آ..... اب سمجھے جناب کے بر دکھوے کو آرہے ہیں۔ ارے جبھی دوڑ دوڑ کر کمرے صاف ہو رہے ہیں۔

زہرہ: بھئی میں چلی جاؤں گی اگر تم نے بدتمیزی کی تو۔

بنّے: بلا سے چلی جاؤ۔ کوئی میری سسرال سے آدمی تھوڑی آرہے ہیں جو اِترا اِترا کر اپنا سگھڑاپا دکھاؤں۔

زہرہ: اونہہ۔ خاک پڑے مجھے کیا پڑی ہے جو..... (کتابیں پٹخ کر چل دیتی ہے)

بنّے: ہوں۔ تو یہ کہو مہمان آرہے ہیں..... (تھوڑی دیر کمرے کے چاروں طرف نظر ڈالتا ہے) سچ کہتی ہے زہرہ۔ ہمّوڑ سے ہی ایسے کمرے میں رہتے ہیں۔ اچھا (جلدی جلدی صاف کرنے کی کوشش کرتا ہے اور دروازے میں سے چھوٹے بڑے آٹھ دس بچّوں کا گروہ دکھائی دیتا ہے)

بچّے: بنّے بھیّا۔ آ..... ہا.....

(بنّے زور سے ہنستا ہے)

(بچّے اندر آ کر اس سے لپٹ کر گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب کو تکیہ سے بے طرح دُھنتا ہے۔ بچّے خوش خوش ہنستے رہتے ہیں)

تیسرا سین

(زہرہ کا کمرہ۔ نہایت سلیقے سے صاف ستھرا۔ آراستہ۔ کمرے میں زمین کے فرش کے علاوہ میز کرسیاں وغیرہ سلیقے سے رکھی ہیں۔ ایک جھولے دار کرسی پر زہرہ آگے پیچھے جھول رہی ہے۔ اخبار کو بے توجہی سے چھوتی جاتی ہے۔ دروازہ میں بنّے لباس شب خوابی پہ چھوٹا سا اوٹنگا سا کوٹ پہنے مع بچّوں

کی فوج کے جھانک رہا ہے۔ بنّے ہونٹ پر انگلی رکھے خاموشی کا اشارہ کرکے آہستہ آہستہ جھانکتا ہے۔ بچّے ہنسی روکنے کے لئے دونوں ہاتھوں سے ناک اور منہ بند کئے ہوئے ہیں۔ دو تین بچے کھوں کھوں ہنستے ہیں۔ زہرہ مڑ کر دیکھتی ہے تو سب بھاگ جاتے ہیں صرف بنّے چھت کو اس انداز سے دیکھنے لگتا ہے گویا خاص طور پر چھت دیکھنے کے لئے آیا ہے۔ زہرہ ایک دفعہ بڑے وقار سے چھت کی طرف دیکھتی ہے اور پھر اخبار پڑھنے لگتی ہے بچّے واپس آجاتے ہیں۔ بنّے ایک بچّے کو آگے جانے کا اشارہ کرتا ہے وہ دونوں ہاتھ ہلا کر انکار کرتا ہے بنّے ہاتھ جھٹک کر اُسے بزدل بتاتا ہے ایک پتلی سی لمبی سی لڑکی اونچی اونچی فراک پہنے اپنی خدمات پیش کرتی ہے۔ بنّے شاباشی دے کر آگے بھیجتا ہے۔ لڑکی ڈری ڈری دو قدم بڑھتی ہے پھر لوٹ جاتی ہے)

لڑکی: (چپکے سے) ماریں گی۔

بنّے: (اشارہ سے) نہیں، ہم جو ہیں۔

لڑکی: (دلیری سے آگے آکر) پیٹو خاں کی دلہن سلام (تیزی سے بھاگ کر دوسرے بچوں سے ٹکرا جاتی ہے)

(زہرہ اپنی جگہ تلملا کر رہ جاتی ہے ذرا کرسی کو تیز جنبش ہوتی ہے۔ وقار قائم ہے۔ سب بچّے اور بنّے اندر داخل ہوتے ہیں اور ایک بے تکی قطار میں کھڑے ہو کر)

سب بچّے: پیٹو خاں کی دلہن سلام!

زہرہ: نکل جاؤ میرے کمرے سے۔

(ذرا سی ہنسی آتی ہے جسے وہ دبانے کی کوشش کرتی ہے۔ سب بچّے ایک گھیرا بنا کر اس کے چاروں طرف گھومتے ہیں۔ بچے چیں چیں کرکے چلاتے ہیں۔ صرف "پیٹو خاں۔۔۔ اور۔۔۔ دلہن" سنائی دیتا ہے)

زہرہ: (نہایت جمے ہوئے قدم سے آگے بڑھتی ہے۔ ساری بھیڑ چھٹ جاتی ہے۔ بنّے

ایک کونے میں بن کہ سہم کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ زہرہ دیوار پر سے ریکٹ اُتارتی ہے اور اُسے ذرا مضبوطی سے تولتی ہے) ہوں۔ اب کہیئے کیا کہہ رہے تھے تم لوگ۔

(بنّے بن کہ اور کونے میں دبک جاتا ہے اور ڈری ہوئی نظروں سے بچوں کو اور کبھی زہرہ کو اور بلّے کو دیکھتا ہے۔ بچوں کے مُنہ خشک)

زہرہ: زور سے بولو کیا کہہ رہے تھے۔

بچے: (منمنی سہمی ہوئی آوازیں) ہم تو...... ہم تو کچھ بھی نہیں،... رہے تھے۔ بنّے بھیّا ہمیں لائے ہیں اور.....

زہرہ: اور وور کچھ نہیں۔ یہ تم کیا کہہ رہے تھے (کھٹا کھٹ بلّے بچوں کے سر اور پیٹھ پر جماتی ہے سب خوشامد کرتے ہیں) نہیں اور کہو (اور بلّے مارتی ہے)

بچے: (ایک کونے میں گھر جاتے ہیں) توبہ۔ اب کبھی نہیں۔

زہرہ: کہو سب کہو۔ بنّے بھیّا اُلّو۔ گدھے۔ پاجی!

بچے: (ڈر کر کبھی بنّے کو، کبھی بلّے کو دیکھتے ہیں) بنّے بھیّا...... ام...... ام...... ام... آں...... وہ.....

زہرہ: (پھر بلّے ٹکاتی ہے) کہو،

بچے: پاجی۔

بنّے: بیچاری کو پاجی کہہ رہے ہیں۔

زہرہ: (پھر بلّے ٹکاتی ہے) کہو۔ بنّے بھیّا..... اُلّو... گدھے... پاجی۔

بچے: (ڈرتے ڈرتے) بنّے بھیّا..... اُلّو... گدھے..... ام.... پاجی!

زہرہ: چلو نکلو (بچے بھاگتے ہیں) نکلو۔ بنّے تم بھی نکلو۔ ورنہ خدا کی قسم بڑے زور سے ماردوں گی۔

بنّے: ارے باپ رے۔ مگر سُنو تو.....

زہرہ: کچھ سنو ونو نہیں۔ بس چل دیجئے ورنہ لگا بلّا۔

(بنّے سکتہ ڈالتا دیتا فوفو آواز مُنہ سے نکالتا باہر چلا جاتا ہے مگر دروازہ کے

پاس کھڑا رہتا ہے۔ ایک سگریٹ نکال کر سلگاتا ہے۔ دبے پاؤں پیچھے سے آکر زہرہ کے منہ پر دھواں چھوڑتا ہے)

زہرہ: (کھانستی ہے) اونہوں۔ پھر۔ نکلو۔ بھئی بنّے نکلو میرے کمرے سے اونہوں سارا کمرہ بدبو سے سڑ گیا۔

بنّے: اُفوہ رے دماغ اور وہ جو دگال پھلا کر بڑی سی توند ہاتھ پھیلا کر اشارہ کرتا ہے) وہ جو دن بھر اِی۔ آئی۔ آر کا انجن بنے رہتے ہیں (اسٹول کھینچ کر زہرہ کے پاس بیٹھ جاتا ہے) سچ کہتا ہوں زہرہ ایسا بدوضع انسان تیرے پلّے پڑنے والا ہے کہ حد نہیں۔ یہ توند، سپاٹ چندیا، بھبھیلی بھبھیلی مونچھیں جیسے کسی نے بوتل دھونے کا برش دانتوں میں دبا لیا ہو۔ یہ کلّا اور گردن تو بالکل ہاتھی کی سی ہے اور پیر یہ بڑے بڑے (کہنی تک لمبان بنا کر) بس یہ سمجھ لو کلّو پہلوان بیٹھا ہوا ہے۔

(زہرہ بھویں سکیڑ کر ہنستی ہے)

بنّے: سچ کہتا ہوں اور ایک بیوی دو بچوں کا پہلے ہی سے مالک ہے اچھا ہے بچے تو خوب مٹھو نکنے کو ملیں گے۔ مگر روپیہ بہت ہے۔ گھرے رہیں گے تمہارے تو۔

(زہرہ کچھ جواب نہیں دیتی)

بنّے: اُس کی موجودہ بیوی جاہل ہے تعلیم یافتہ چاہتے ہیں۔ سب بات تو خیر ہو گئی یہ بچے تو بس تھکا دیں گے۔۔۔۔ میں کہتا ہوں کہ یہ آخر الہ بی خود اس سے بیاہ کیوں نہیں کر لیتیں۔

زہرہ: ہیں ہیں بنّے ہوش میں ذرا دماغ خراب ہوا ہے۔

بنّے: ارے تم تو خود اس پیٹو سے شادی کرنے پر تُلی ہوئی ہو۔

زہرہ: میں کیوں ہوں۔

بنّے: اور پھر کون ہے؟

زہرہ: میں کروں گی ہی کب۔

بنّے: الہ اماں جو۔۔۔۔

زہرہ: کہنے دو اللہ اماں کو مگر ......

بنّے: اگر مگر تمہاری کیا چلے گی۔ تم بزدل لڑکیوں کو اور آتا ہی کیا ہے یا تو سنکھیا کھا کر چوہے کی طرح مرگئیں یا اب نئی روشنی کی دلدادہ بے تعلیم یافتہ چھوکریوں کی طرح اِدھر اُدھر نکل کھڑی ہوئیں۔ بات تو جب ہے کہ لڑ پڑو اور کہہ دو کہ اللہ بی اس بڈھے سے تو آپ ہی کیجئے۔

زہرہ: چُپ رہو بنّے کیا غضب ہے۔ جُوتے کھانے کی دل میں ہے۔

اللہ بی: (دروازے سے) ہائے یہ کب سے کھانے کے لئے بُلا رہی ہوں بنّے باہر جاؤ۔ ڈپٹی صاحب کے ساتھ کھانا کھا لینا۔ میں نے قادری صاحب کے یہاں سے کھانے کا سیٹ منگوایا ہے اور تمہاری میز وہاں چھوا دی ہے۔ ذرا سلیقے سے کھانا۔

بنّے: بھلا قادری صاحب کے یہاں سے برتن منگوانے کی کون سی مار تھی۔ اپنے یہاں جو غریبانہ برتن تھے کافی نہ تھے۔

اللہ بی: وہ بڑے فیشن ایبل ہیں۔ اپنے یہاں سڑے ہوئے جاپانی سیٹ ہیں!

بنّے: تو کیا ہوا۔ ہمارے تو سیٹ جاپانی ہیں اور وہ خود جاپانی دولہا ہیں۔ سوچنے کا مقام ہے کہ نہیں۔ چالیس برس کی ڈھونگ بیوی موجود، بچے موجود۔ صاحب دوسری شادی کر رہے ہیں۔

اللہ بی: وہ بوڑھے تو نہیں۔ لوگ کہتے ہیں تیس سے زیادہ کے نہیں لگتے۔ دوسری شادی اس لئے کر رہے ہیں کہ بیوی جاہل ہے۔

بنّے: خوب۔ تو پھر پہلے اس بدنصیب سے کی ہی کیوں تھی۔

اللہ بی: اسے ہے وہ کب کرتے تھے۔ ابّا نے زبردستی کر دی۔ عین شادی کے وقت بلا کر نکاح کرنے کو کہا۔ انہوں نے انکار کیا تو بولے۔ عاق کر دوں گا۔ بیچارے چُپ ہو رہے سُنا ہے بیوی عمر میں ان سے بڑی ہیں۔

بنّے: یہ سب جعل ہے اور وہ جو زہرہ کے باپ سے بھی بڑا ہے تو آج کہتا ہے باپ نے زبردستی شادی کر دی تھی۔ اس لئے دوسری کر رہا ہوں۔ کل کو کہے گا اماں نے زبردستی شادی کی تو زہرہ کے اوپر سوت لا رہا ہوں۔

الہ بی: واہ۔ ہم حق طلاق اور پچھتّر ہزار مہر جو لکھوالیں گے۔ میاں کو خبر پڑ جائے گی۔

بنّے: خبر کیا پڑ جائے گی۔ نادری صاحب کی لڑکیوں کے یہاں بھی تو یہی ڈھونگ رچا تھا پھر ٹل نہ گیا اُنہیں مہر اور طلاق! لاکھ دعوے کرو اور سارے میں مشہور ہو گئے۔

الہ بی: نہ جانے کیا بک رہا ہے۔ اچھا خاصا لڑکا مل گیا ہے۔ بھئی ہم لوگ ایسے تو رئیس ہیں نہیں جو کوئی آسانی سے ہماری لڑکی سے شادی کر لے۔ کوئی ڈھنگ کا پیغام نہیں آتا روپیہ نہیں تو شہر بھر میں کسی کو پتہ بھی نہیں کہ ہماری لڑکی بھی شادی کے قابل ہے ابھی جو امیر ہوتے تو اچھے سے اچھا لڑکا مکھیوں کی طرح آن گرتا۔ روپیہ ہوگا تو پھر سب کچھ ملے گا۔

بنّے: کچھ بھی ہو۔ میں ذرا آج ڈپٹی صاحب سے دو دو باتیں کروں گا انہیں یہ شرائط بھی معلوم ہیں۔

الہ بی: اے سب معلوم ہیں۔ سب کچھ طے ہو گیا تھا۔ تاریخ ٹھہرانے آئے ہیں ان کی بہن سب انتظام کر رہی ہیں۔ پہلی بیوی سوتیلی ماں کی بہن ہیں۔ انہوں نے زبردستی کر دی تھی۔

بنّے: ہٹا کٹا پہلوان اور زبردستی شادی کروالی۔ سب مکّاری ہے۔

الہ بی: ہو گی۔ تم دیوانے ہو۔ اٹھو جاؤ کھانے کے لئے۔ میں ابھی بھیجتی ہوں۔

بنّے: (اُٹھتا ہے) ذرا نہا ڈالوں (جاتا ہے)

چوتھا سین

(صاف ستھرا لمبا کمرہ۔ بیچوں بیچ میں ایک میز لگی ہے جس پر بہت لمبا سا میز پوش پڑا ہے۔ جس نے میز کے کھرچے ہوئے پایوں پر پردہ ڈال رکھا ہے آمنے سامنے دو دفتر کی کرسیاں رکھی ہیں۔ بیچ میں ایک شیشے کا پچرنگا گلدان رکھا ہے ایک اونچا اونچا پاجامہ اور نیچا سا کرتہ پہنے نوکر سینے پر ہاتھ لپیٹے لاپروائی سے ایک پیر پر زور ڈالے کھڑا ہے۔ ایک اسٹول پر صراحی اور گلاس رکھے ہیں۔ بنّے اور اس کے پیچھے ڈپٹی صاحب تولیہ سے ہاتھ پونچھتے داخل ہوتے ہیں۔ بنّے نوکر کی اس ٹانگ پر جس پر وہ زور ڈالے ہے ایک چپراس لگاتا ہے نوکر ہاتھ پھیلا کر توازن قائم کرتا ہے اور "ارے" کہہ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ ڈپٹی صاحب مسکراتے ہیں۔ دونوں بیٹھ جاتے ہیں۔

کھانا شروع ہوتا ہے)

بنے: بات یہ ہے ڈپٹی صاحب یہ انو ہمارا نوکر نہیں بلکہ رشتہ دار ہے ذرا پھوہڑ واقع ہوا ہے بدتمیز۔

ڈپٹی صاحب: (ہونے والے رشتہ دار کو غور سے دیکھ کر) ہوں۔

بنے: جاؤ انو ذرا چار اس رکابی میں لے آؤ۔ سنبھال کر۔ ٹوٹے نہیں۔ قادری صاحب کے برتن ہیں۔ مہمانوں کی وجہ سے منگائے ہیں۔ ورنہ ہمارے یہاں تو سڑے ہوئے جاپانی برتن ہیں۔

(انو سر کھجاتا ہوا رکابی لے جاتا ہے)

ڈپٹی صاحب: (غریبی کے ثبوت کو نظر انداز کرتے ہوئے) یہ مکان جناب کا ذاتی ہے؟

بنے: ذاتی کہاں۔ ہماری خالہ کا ہے انہی کے نام ہے۔

ڈپٹی صاحب: ہوں۔

بنے: آپ یہ چاہتے ہیں کہ شادی جلد ہی انجام پا جائے۔ پھر آپ کو رخصت ذرا مشکل سے ملے گی۔

ڈپٹی صاحب: جی ہاں قطعی آپ کا خیال درست ہے، میں تو بہت جلد چاہتا ہوں۔

بنے: (ایک دم سے) کیوں؟

ڈپٹی صاحب: (ذرا چونک کر) ار... یوں کہ پھر مجھے چھٹیاں نہ ملیں گی۔

بنے: نہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کی تو بیوی موجود ہیں۔ پھر دوسری شادی کیوں کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

ڈپٹی صاحب: (ذرا اٹپٹا کر) بات یہ ہے کہ وہ ذرا میرے مذاق کے مطابق نہیں۔ جاہل ہیں۔ بالکل ان پڑھ۔ میری ہم خیال نہیں۔

بنے: مگر آپ کو یہ کیسے معلوم کہ میری بہن آپ کی ہم خیال ہو گی؟

ڈپٹی صاحب: وہ ـــــ وہ تعلیم یافتہ ہیں، سمجھ دار ہیں۔

بنے: مگر وہ آپ سے تقریباً پچیس سال چھوٹی ہے۔ بالکل بچہ۔ بھلا وہ آپ کی ہم خیال کیا ہو گی۔

ڈپٹی صاحب: (گھبرا کر) میرا مطلب ہے وہ عالمہ ہیں، سمجھ دار ہیں، میری بیوی بالکل جاہل ہے اس کے ساتھ میری گزر ناممکن ہے۔

بنّے: میری بہن بہت بدمزاج اور لڑاکا ہے۔ اُسے ذرا سی بات کی برداشت نہیں ہوتی۔ آپ سے اب کیوں چھپایا جائے ذرا ذرا سی بات پر رو دیتی ہے ——

ڈپٹی صاحب: مجھے ان کے خلاف کبھی کچھ کہنے کی ضرورت نہ ہوگی، دوسرے اگر وہ دو باتیں بیجا کہیں گی تو میں برداشت کر لوں گا۔

بنّے: معاف کیجئے گا ڈپٹی صاحب آپ اس وقت ذرا رومینٹک سے ہو رہے ہیں ذرا غور کیجئے اپنی اچھی خاصی زندگی میں کیوں کانٹے بو رہے ہیں۔ گھر کا سکون عنقا ہو جائے گا چھوڑیئے اس بیہودہ خیال کو۔ آپ کو شرائط بھی معلوم ہیں۔ حق طلاق اور پچھتر ہزار مہر۔

ڈپٹی صاحب: جی مجھے سب منظور ہے۔

بنّے: کیا آپ کو کبھی یہ بھی خیال آیا ہے کہ کہاں سے آپ اتنا مہر لائیں گے۔ اور جب طلاق ہی دینا ہے تو شادی ہی کیوں کر رہے ہیں۔

ڈپٹی صاحب: (نوالہ سے کھیلتے ہوئے) میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

بنّے: یوں سمجھئے۔ اب فرض کیجئے۔ شادی کے چوتھے روز زہرہ آپ کو طلاق دے دے اور مہر کا دعویٰ کر دے تو؟

ڈپٹی صاحب: (سٹپٹا کر) جی آخر بے وجہ۔ یہ کیوں؟

بنّے: بے وجہ کیوں۔ اس کی شادی اس کی مرضی سے نہیں کی جائے گی لہٰذا وہ یہی وجہ بتا سکتی ہے کہ چونکہ بزرگوں نے زبردستی کی تھی لہٰذا اب میں دوسری کرنا چاہتی ہوں۔

ڈپٹی صاحب: لاحول ولاقوۃ۔ یہ کہیں شریف گھرانوں میں ہوا کرتا ہے۔

بنّے: اس میں کیا برائی ہے آجکل بہتیرے ایسے واقعات سُننے میں آتے ہیں زہرہ کو رہنے دیجئے۔ اچھا اگر میں زہرہ کو زبردستی آپ کے ہاں جانے سے روک لوں اور طلاق دلوا دوں۔

ڈپٹی صاحب: زبردستی۔ یہ کیسے؟

بنّے: یہ ایسے ہی جیسے کہ ہم اب کر رہے ہیں کہ زبردستی اُس کی شادی آپ سے کر رہے ہیں۔

ڈپٹی صاحب: مجھے آپ لوگوں پر قطعی بھروسہ ہے اور کبھی کسی برے برتاؤ کی اُمید نہیں۔

بنّے: معاف کیجیے گا ڈپٹی صاحب آپ بڑے بھولے ہیں ہم لوگ اتنے بے وقوف نہیں جتنا آپ سمجھتے ہیں۔ دیکھئے نا یہ سیٹ ہم نے آپ کے اوپر رعب ڈالنے کے لئے قادری صاحب سے منگوایا ہے اور یہ میز میرے پڑھنے کی ہے ہم لوگ تو عموماً تخت یا چارپائی پر بیٹھ کر کھا لیتے ہیں۔ چڑیا پھانسنے کے لئے چھٹکی لگانی پڑتی ہے ارے آپ تو بیٹھے ہوئے ہیں۔ ارے صاحب کھایئے نا۔

ڈپٹی صاحب: (جو حد درجہ کھسیانے اور پریشان ہو رہے ہیں) میں تو آپ لوگوں کو ایسا نہ سمجھتا تھا۔

بنّے: کھانا ہیں نے۔ آپ سیدھے سادے بھولے آدمی ہمارے ہتھکنڈے کیا سمجھیں۔ کھایئے نا۔

ڈپٹی صاحب: (نیچی نظروں سے) میں چار بجے کی گاڑی سے چلا جاؤں گا۔

بنّے: ارے آپ تو باتوں ہی باتوں میں بگڑ بیٹھے۔ اجی حضرت کل اتوار ہے۔ ہرن کے شکار کو چلیئے گا۔ قادری صاحب سے بندوق مانگ لیں گے۔

(قہقہہ لگاتا ہے)

ڈپٹی صاحب: (کھسیانی ہنسی سے) جی نہیں۔ ہاں...... وہ ذرا مجھے بھی کام ہے۔

پانچواں سین

(دو سال بعد بنّے کا کمرہ ویسا ہی گندا اور اُجڑا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ذرا قیمتی اور بہتر سامان بے ترتیبی سے بکھرا ہوا ہے اور چائے کا سامان نہیں۔ نہ ہی کتابیں نظر آتی ہیں۔ بنّے سفید پینٹ اور سُرخ کوٹ پہنے ٹینس کا بلّا ہاتھ میں لئے ٹہل رہا ہے)

بنّے: پی۔ سی۔ ایس (زور دے کر الفاظ دُہراتا ہے) ان الفاظ میں بھی کیسا جادو ہے ایک بندر کو بھی یہ تین ننھے منّے الفاظ انسان بنا دیتے ہیں ابھی کل کی بات ہے۔ بنّے خاں کو لوگ کھلنڈرا اور پھکّڑ سمجھتے تھے۔ مگر آج تو گویا جو ملے بنّے خاں کہے ہیں۔ وہ راجہ کے نہیں (کمرے کی بے ترتیبی پر نظر ڈال کر) سچ کہتی ہے زہرہ۔ واقعی میں بھوڑوں کی طرح رہتا ہوں۔ مگر واہ...... کیا پروا ہے ایک پی۔ سی۔ ایس گندہ رہ سکتا ہے۔ کون اسے روک سکتا ہے خواہ وہ اس سے بھی گندہ رہے رشتے دار کہتا ہے میرے گھر سے ہیں۔

الہ بی: (دروازہ سے داخل ہو کر) بنّے کیا کر رہے ہو۔ اوئی ذرا کمرے کی صورت تو دیکھو۔ خیر سے اب بڑے آدمی ہو گئے ہو۔ بیر ارکھو۔

بنّے: الہ بی ہم تو اس گندے کمرے میں ہی مگن ہیں آپ کا جی چاہے جیسے رکھئے۔

الہ بی: (سنجیدگی سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے) اب گھر والی خود ہی جیسے چاہے گی رکھے گی۔ ہاں بنّے وہ تم نے اس بات کا جواب نہیں دیا۔ میں جج صاحب سے کیا کہوں۔

بنّے: کون جج صاحب۔

الہ بی: وہی، کیا نھے بنے جاتے ہو، اسے وہی انہوں نے اپنی لڑکی کے لئے کہلوایا تھا۔ انہیں ایک اچھے لڑکے کی عرصے سے تلاش ہے۔

بنّے: نیا نیا کام مجھے اتنی فرصت کہاں ہے کہ جج صاحب کے لئے لڑکا ڈھونڈتا پھروں۔

الہ بی: اے کچھ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔ دیوانے وہ تو تمہاری طرف اشارہ ہے۔

بنّے: (سینے پر انگلی رکھ کر) خاکسار کی طرف (مصنوعی ہنسی ہنس کر) ہیں ہیں ہیں او ہو بڑی عنایت، . . . . مگر مجھ سے تو وہ بارہا ملے۔ کبھی ذکر تک نہ کیا۔

الہ بی: اے تو کیا خود آن کر تم سے کہتے کہ میری لڑکی قبول لو۔

بنّے: تو اس میں کیا برائی ہے۔ ہمارے ڈپٹی صاحب ہی کو لو۔ زہرہ کے لئے سب کچھ طے کر کے بر دکھاوے کو آئے تھے۔

الہ بی: اے تو وہ اور بات تھی لڑکی کا پیغام لے کر کوئی نہیں دوڑتا۔

بنّے: کیوں نہیں۔ اپنے لئے تو اور بات ہوا ہی کرتی ہے۔ لڑکی کے لئے پیغام لے کر جاتے لاج نہیں آتی ہے۔ بڑھاپے میں خود اپنے لئے دُلہن ڈھونڈتے نہیں شرماتے۔

الہ بی: تم تو جھکی ہو۔

بنّے: جھکی سہی۔ انہیں غرض پڑی ہو آئیں اور پیغام دیں۔

الہ بی: اور تم انکار کر دو۔

بنّے: اس میں کیا برائی ہے۔ بیچارے ڈپٹی صاحب کیا اپنا سا منہ لے کر گئے تھے۔

الہ بی: اے چل بیٹھ۔ ان کی جوتی کو بھی غرض نہیں پڑی ہے جو . . . .

بنّے: جی ہاں کیوں پڑنے لگی تھی۔ کوئی اپنا نکاح تھوڑی ہے کہ دوڑ دوڑ کر سسرال جائیں
اور جوتیاں چاٹیں۔

الہ بی: بنّے نہ جانے تو کیسی باتیں کرتا ہے۔ اچھا نسیم صاحب کی لڑکی وہ تو تعلیم یافتہ ہے
خود نسیمؔ صاحب نے مجھ سے کہلوایا۔

بنّے: کیسی لڑکی ہے؟

الہ بی: اسے اچھی ہے۔ روپیہ بہت ہے ایک لڑکی ہے۔

بنّے: صورت شکل؟

الہ بی: آدمی کا بچہ ہے۔

بنّے: یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ بلی کا بچہ نہیں۔ پھر بھی۔

الہ بی: صورت تو ذرا ویسی ہے مگر بڑی سلیقہ مند ہے۔ دولت بہت ہے۔

بنّے: یہ "ذرا ویسی" سے کیا مطلب۔ صاف کہئے۔ بدصورت ہے۔ دوسرے میں اُس سے
ملنا چاہتا ہوں۔ اُس کے مزاج سے واقف ہونا چاہتا ہوں۔

الہ بی: اسے مزاج سے تو تم کیا واقف ہوگے۔ تمہارے مزاج کی تو دنیا میں نوج کوئی لڑکی ہو،
مل کر کیا کروگے۔

بنّے: اگر میرے مزاج کی لڑکی ملنا دشوار ہے تو پھر ضرورت ہی کیا ہے کہ شادی کروں
ہی کیوں۔

الہ بی: تم جانو بھیا۔ میں تو زہرہ کو لے کر دہلی جا رہی ہوں۔ کرو بیاہ اور چلاؤ گھر!

بنّے: "کرو بیاہ اور چلاؤ گھر" گویا بیوی کوئی ڈنڈا ہے جس سے گھر ہانکا جائے گا۔ خوب تنگ
کر مارا۔ اِدھر نوکر ہوتے اُدھر لوگوں نے ہماری شادی کی فکر میں گھلنا شروع کیا جسے دیکھو
چلا آتا ہے کہ کرو شادی گویا ان لوگوں کو ہماری بڑی ہی فکر ہے اور بھی تو ہیں خدا کے
بندے۔ جن کو صرف اس لئے شادی کرنے کی اجازت نہیں کہ وہ نوکر نہیں۔

الہ بی: تم جانو (اٹھ کر جانے لگتی ہے)

بنّے: (ٹہلتے ہوئے) لوگوں نے "شادی کرو" میری چڑ مقرر کر لی ہے۔ دراصل میری تھوڑی

میری نوکری کی شادی کی فکر ہے۔

الہ بی: اونہہ (جاتی ہے)

بنّے: (کچھ بے تُکے انداز سے گنگناتا ہے اور کھونٹی پر سے مفلر اُتار کر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر لپیٹتا ہے۔ زہرہ پشت کے دروازے میں نظر آتی ہے (واپس جانا چاہتی ہے لیکن بنّے روکتا ہے) ٹھہرو زہرہ ذرا ٹھہرو (آگے بڑھتا ہے) اندر آ جاؤ تم تو میرے کمرے میں آتی ڈرتی ہو۔ گویا میں کاٹ ہی کھاؤں گا۔

زہرہ: (اندر آ کر) کون آئے، چوریاں جو لگ جاتی ہیں۔

بنّے: (زور سے ہنستا ہے) اب تھوڑی جرأت کی ہو۔ اب تو توبہ کر لی۔ لو کرسی پر بیٹھو۔ کیا خاطر کریں تمہاری؟

زہرہ: (آرام کرسی پر بیٹھ کر) بس شکریہ۔

بنّے: زہرہ تم ڈپٹن کیوں نہ بن گئیں؟

زہرہ: (مسکرا کر) پھر سٹھیائے۔

بنّے: (مفلر لپیٹتے ہوئے) مذاق سے نہیں سچ کہتا ہوں۔ زہرہ جب سے نوکر ہوا ہوں لوگوں نے جان کھا لی کہ بیاہ کر۔ ارے میری چڑ مقرر کر لی ہے۔ گویا میں بوڑھا ہوا جا رہا ہوں (عاجز ہو کر ہاتھ جھٹکتا ہے)

زہرہ: تو پھر کر کیوں نہیں لیتے!

بنّے: لو وہ بھی چلیں نصیحت کرنے۔ زہرہ تمہیں تو سچ مچ ٹھونک دوں گا۔

زہرہ: (ہنس کر) لو اس میں چلنے کی کون سی بات ہے۔ سارے وقت لڑکیوں کے ساتھ گھومتے پھرتے ہو کر کیوں نہیں لیتے۔

بنّے: (کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے) کس سے کر لوں۔ کوئی ہو بھی؟

زہرہ: کیوں حمیدہ میں کیا بُرائی ہے؟

بنّے: بڑے آدمی کی لڑکی ہے۔ بڑی دماغ دار ہے۔

زہرہ: آئے ہے بس!

بنّے: ارے وہ کلوٹی۔ توبہ کرو۔ تم نہ کرلو اُس کے بھائی سے۔

زہرہ: دیکھو بدتمیزی کی نہیں ہے ورنہ میں جاتی ہوں۔

بنّے: اچھّا اچھّا، اب نہیں، اور بتاؤ۔

زہرہ: (کچھ رُک کر) گلشن!

بنّے: کیا تھکی ہوئی۔ تمہاری پسند ہے لاحول ولاقوۃ۔

زہرہ: مس منیر!

بنّے: ہٹو وہ تو بالکل چپٹی ہے۔

زہرہ: (بگڑ کر) کوئی نہیں خاصی ہے تم تو دیوانے ہو۔ کیا آسمان سے حور لاؤ گے!

بنّے: ہاں زہرہ۔ چاہتا تو یہی ہوں (ذرا غور سے زہرہ کو دیکھ کر رُکتے ہوئے) بس تو یہی چاہتا ہوں کہ بڑی اچھی ہو (چھت کی طرف دیکھتے ہوئے) کیسے بتاؤں — ..... بس بہت ہی اچھی ہو۔ بڑی سلیقے والی۔ میرے کمرے کو صاف کر دے اور ہنستی رہے (زہرہ کو اور غور سے دیکھ کر) تم..... تم..... تم اچھی نہیں (مسکرا کر) پھوہڑ ہو..... لڑاکا اور پھوہڑ اور اوپر سے چور بھی۔

زہرہ: (بگڑ کر) چُپ بدتمیز۔ میرا نام نہ لینا۔

(بگڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے)

بنّے: (نرم آواز میں) میں تمہارا نام کب لیتا ہوں..... میں تو..... کہتا ہوں کہ تم اچھی نہیں۔ (جلدی سے) بالکل اچھی نہیں۔ لڑتی ہو بات بات پر کاٹنے کو دوڑتی ہو۔

(زہرہ بڑبڑاتی ہوئی جلدی جلدی لمبے لمبے قدم رکھتی چلی جاتی ہے)

بنّے: (زور سے ایک آزردہ ہنسی ہنستا ہے) بس بنّے خاں..... اب تو دیکھ لیا مگر یہ بھی کوئی بات ہے (غصے سے) میں آج اماں بی سے کہہ دوں گا کہ اب کے جو انہوں نے میری شادی کا ذکر کیا تو سچ مچ لڑ پڑوں گا۔ یہ نہیں دیکھتیں کہ میرا کیا قصور ہے (سر کھجاتا ہے) زہرہ شاید کمرہ صاف کرنے آئی تھی (چھت کی طرف دیکھ کر) پھوہڑ لڑاکا..... (ہنستا ہے)

چھٹا سین

(زہرہ کا کمرہ۔ حسبِ معمول صاف۔ چوکی پہ پیر لٹکائے بیٹھی ہے نہ معلوم کیا سوچ رہی ہے۔ اُٹھ کر میز کے پاس جاتی ہے پھر لوٹ آتی ہے۔ بیٹھ جاتی ہے)

زہرہ: (پکارتی ہے) اَنّو۔ اَنّو!

اَنّو: کیا ہے؟ (دروازہ میں آتا ہے)

زہرہ: (کچھ سوچ کر) کچھ نہیں۔ ٹھہر۔ یہاں آ...... تجھے معلوم ہے ننّے میاں کہاں گئے ہیں؟

اَنّو: کلب (جانے لگتا ہے)

زہرہ: ٹھہر۔ سوَر سنتا نہیں بھاگا جاتا ہے۔

اَنّو: تو کہئے نا کیا ہے؟

زہرہ: تو جانتا ہے کلب؟

اَنّو: ہاں۔ آں۔

زہرہ: تو جا اور چُپکے سے اُن کے کان میں کہہ کہ اللہ بی.... نہیں نہیں میری طبیعت خراب ہے جلدی چلیئے۔

اَنّو: اچھا۔

زہرہ: کہہ کے بھاگ آنا اور جو سوَر تو نے کہا کہ میں نے بھیجا تھا تو بہت ہی پیٹوں گی۔

اَنّو: اے لیجئے صاحب۔ بھیّا میں نہیں بُلاتا۔ وہ ویسے ہی مارتے رہتے ہیں۔ (جانے لگتا ہے)

زہرہ: ٹھہر میں کہہ رہی ہوں نہیں ماریں گے تو جا۔ پھر سینما کے پیسے دوں گی۔

اَنّو: اہا "جنگل کا جوان" آرہا ہے۔ مگر بھیّا جوتے جو پڑیں گے۔

زہرہ: میرا نام مت لیجو۔

اَنّو: نہیں (جاتا ہے)

زہرہ: (تھوڑی دیر پریشان بیٹھی رہتی ہے) اسے ناحق بھیجا.... نہ جانے ننّے کیا سوچے

گا۔ میں نے ناحق ہی بھیجا .... جنے کیا سوچے گا .... اوتہ .... (ذرا فکرمند ہوکر بیٹھ جاتی ہے)

الہ بی: (قینچی اور ایک کپڑا لئے آتی ہیں) اے زہرہ دیکھنا اس میں چوکور گلا ٹھیک رہے گا۔

زہرہ: (بے توجہی سے) ہوں۔

الہ بی: اے بی کیا اونگھ رہی ہو۔ ہوں کردیا (غور سے کپڑے کو دیکھ کر) لو بھلا۔ دیکھئے اس میں چوکور گلا کیا خاک ٹھیک ہوگا۔

زہرہ: ہوں۔ دیکھوں۔

الہ بی: ہٹو کیا خاک دیکھو گی (کرسی پہ بیٹھ کر کپڑا بیونتنے لگتی ہیں)

(تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے)

زہرہ: اے الہ بی! بنّے کو دیکھتی ہو کیسے اُڑے اُڑے پھرتے ہیں گھر میں بیٹھنا تو قسم ہے جب دیکھو جب پارٹیاں۔

الہ بی: اور کیا گھر میں بیٹھا رہے۔ تیری تو اس سے گھڑی بھر کو نہیں بنتی۔ آج کیا دو تین روز سے نہ جانے کیا بات ہے جو چُپ ہے۔

زہرہ: میں لڑتی ہوں۔

الہ بی: تُو تو نہیں لڑتی پر تج تج تو ہوا کرتی ہے۔

زہرہ: میں نہ بولوں تب بھی وہ لڑتے ہیں۔ خیر پہلے بھی تو لڑتے تھے۔ یہ بات نہ تھی۔ اب تو دراصل دوستوں میں گھوما کرتے ہیں۔ گھر میں آنے کی فرصت کہاں۔

الہ بی: گھر میں رہے تو بُرائی، باہر جاتے تو بُرائی۔ تجھے کسی کل چین نہیں۔ میں کہتی ہوں۔ تجھے کیا فکر پڑ گئی۔

زہرہ: (جل کر) مجھے کیا فکر ہوتی (تھوڑی دیر بعد) الہ بی اب آخر دہلی کب چلو گی؟

الہ بی: اے بنّے کا گھر اکیلا ہو جائے گا۔ اسی مارے نہیں جاتی۔ ذرا اس کا گھر بس جائے تو چلوں گی۔ تمہارا دل آج کیوں گھبرانے لگا۔

زہرہ: (چڑ کر) آپ بسایئے گھر، میں اکیلی چلی جاؤں گی۔ بنّے کی شادی کے لئے مجھے کیوں ٹھہرنا لازمی ہو۔ میں انّو کو لے کر چلی جاؤں گی۔

الہ بی: اے یہ بنّے کی شادی سے تیرے کیوں مرچیں لگ گئیں؟

زہرہ: (بگڑ کر) میرے کیوں مرچیں لگیں۔ خاک پڑے مجھے کیا۔

الہ بی: خاک تیرے منہ میں لڑکی خواہ مخواہ جلی مرتی ہے۔

زہرہ: (اوار جل کر روتی آواز میں) بھئی اوہنہ مجھے دہلی بھیج دیجئے۔

الہ بی: اے تم تو پاگل ہو گئی ہو۔

(اُٹھ کر چلی جاتی ہے)

آواز: (بنّے کی) زہرہ۔ زہرا۔ آ۔ کہاں ہو۔ (ذرا پریشان انداز سے آتا ہے) ارے کیا سچ مچ رو رہی ہو۔ ارے! یا صرف دھوکا.....

زہرہ: (روتے ہوتے) الہ بی خواہ مخواہ ہی ڈانٹے دیتی ہیں۔

بنّے: تو ہوا کیا.... کچھ بولو بھی۔ بابا ناک پونچھ پونچھ کر توڑ ڈالو گی۔

زہرہ: اوہنہ۔ جاؤ یہاں سے۔

بنّے: چہ خوش آپ ہی نے تو بلایا تھا اور آپ فرماتی ہیں۔ جاؤ۔ خوب!

زہرہ: میں نے یہ سؤر انّو نے کہا ہوگا۔ میں نے.....

بنّے: ہاں، ہاں۔ تم نے منع تو کیا تھا۔ مگر میں نے جو چپت لگایا تو کہہ دیا کہ.....

زہرہ: جھوٹا ہے۔

بنّے: ہوگا۔ مگر کیا تمہاری طبیعت خراب ہے؟

زہرہ: ہونے دو تمہیں کیا۔ ایک پھوہڑ اور بدتمیز لڑکی مر بھی جائے تو.....

بنّے: کون۔ تم پھوہڑ اور بدتمیز؟ کون بے وقوف کہتا ہے؟

زہرہ: تم!

بنّے: (زور سے ہنستا ہے) بے وقوف۔ وہ تو صرف چڑانے کو کہتا ہوں، مذاق میں!

زہرہ: اور وہ جو روز الہ بی سے میری شکایتیں ہوتی ہیں تو؟

بنّے: ارے عقلمند مذاق ہیں۔ تمہیں رُلانے کے لئے مذاق ہیں (سنجیدہ ہو کر) مگر نہ معلوم زہرہ تمہیں کیوں مجھ سے ہمیشہ سے نفرت ہے۔

زہرہ: نفرت! مجھے تو نفرت نہیں۔ تم ہی مجھ سے جلتے ہو۔

بنّے: تو پھر کیا یہ میرا وہم تھا؟

زہرہ: ہاں۔

بنّے: اور میں تم سے جلوں گا۔ زہرہ مجھے کبھی یہ کہنے کا موقع نہ ملا کہ صرف تم ہی ایسی لڑکی ہو جو میری زندگی سدھار سکتی ہے۔ تم سے زیادہ مجھے کوئی نہیں سمجھتا زہرہ مجھے کبھی بھی اُمید نہ تھی کہ تم میری بات بھی سن سکو گی مجھے کبھی تم سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ تم سے لڑنا اور تمہیں برا کہنا آسان تھا لیکن اگر بس تم سے کچھ اور کہتا تو یقیناً تم میرے منہ پر چپل رسید کرتیں اور اللہ بی سے الگ جوتیاں لگواتیں۔ اب مجھے کوئی نہ چھیڑے گا کہ "شادی"، آؤ زہرہ اب ہم کبھی نہیں لڑیں گے۔

(زہرہ مسکراتی ہے)

بنّے: مگر زہرہ میں کمرے میں جوتے موزے پھیلایا کروں گا تو؟

زہرہ: وہ میں سمیٹ دوں گی۔ لیکن اگر تم نے کمرے میں سگریٹ پیا تو کان پکڑ کر نکال دیئے جاؤ گے!

بنّے: (مٹھی پر ہتھیلی مار کر) منظور۔

(اللہ بی پُشت سے دروازے کے کمرے سے جھپاک سے بھاگتی ہیں چہرے پر ایک مسکراہٹ ہے۔ شاید چھپی ہوئی دیر سے کھڑی تھیں)

کافر

"ہٹ، تیرے مہادیو جی جیسے ہوّے کی شکل کے رات کو دیکھ لو تو بخار چڑھ آئے" میں نے پشکر کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور تیرے۔ تیرے وہ مستان شاہ جی اور مسٹنڈے پیر جو ہر جمعرات کو تجھے آشیرباد دینے آتے ہیں جیسے ڈاکو چلا آتا ہے۔ میری تو انہیں دیکھ کر ہی گھگی بندھ جاتی ہے" پشکر نے اُنگلیاں نچا کر کہا۔

"تو تو کافر ہے پشکر" میں نے مولویانہ انداز سے کہا۔ "تو جہنم میں جائے گا۔ فرشتے تیرا بدن لوہے کی سلاخوں سے داغیں گے اور آگ کے کوڑے ماریں گے خون اور پیپ کھانے کو ملے گا۔"

"ہے گندی۔ کیسی جی متلانے کی باتیں کرتی ہے۔ میں وہ تیرے فرشتے کے مُنہ پر اُلٹا دوں گا۔ میں کافر ہوں تو تو کافرنی ہے۔ تو نے اس دن بابو جی سے کہا تھا کہ مجھ سے شادی کرے گی۔ تیرے بھی جہنم میں کچھ کم جوتیاں نہیں پڑیں گی۔"

"ہٹ۔ میں تو مسلمان ہوں اور تو ہندو ہے۔ جناب عالی سارے مسلمان تو جنت میں چلے جائیں گے۔ ہم بھی مزے سے جنت میں جائیں گے تو ہی رہ جائے گا۔ دیکھ لیجیو۔"

"بہت رہ گیا۔ میں تجھ سے بھی اچھی جگہ جاؤں گا۔ تو تو مسلمنٹی ہے تو نرک میں پڑی جلا کرے گی۔"

"سؤر کہیں کا۔ تو مجھے مسلمنٹی کہتا ہے۔ تُو ہی ہے بھنگی۔ کافر۔ اُلّو!"

"تو تو بھنگن اور کافرنی ہے۔"

میں نے اس کے ایک زور کا طمانچہ مارا۔ وہ کیوں چُوکتا۔ دو دھموکے رکھ دیئے اور ہاتھ

الگ مروڑ دیا۔ میں نے بھی اس کی کلائی میں ناخن ایسے گڑو دیئے کہ چربی نکل آتی ۔ چاچی جوتی پیزار کی آواز سن کر دوڑی اور بیچ بچاؤ کر دیا۔

"پشکر کے بچے آ بنے دے بابوجی کو۔ کیسی گت بنواتی ہوں،" چاچی نے پشکر کو گھونسہ دکھا کر کہا۔ جو دیوار کا گھوڑا بنائے بیٹھا میرا منہ چڑا رہا تھا۔

"چاچی اب اس سوئر سے میں شادی نہیں کروں گی،" میں نے رو کر کہا۔

"اور میں تجھ کلوٹی سے کب کروں گا۔" "ماں یہ مجھے بیپ خون کھلاتی ہے، اوق!" پشکر نے اُبکائی کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

"ہے رام۔ ملچھ کہیں کا۔ چپ۔"

"سچی ماں یہ کہتی ہے سب ہندو نرک میں جائیں گے اور یہ بڑی آئی واں سے جنت میں جائے گی۔"

"نہیں چاچی نہیں جائے گی اور بھیّا اور بابوجی بھی نہیں جائیں گے۔ پر یہ اُلّو تو ضرور جائے گا،" میں نے وثوق سے کہا۔

"میں گیا تو تیری بھی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لے جاؤں گا۔"

"بہت رے گید وہ زور سے کاٹوں گی کہ مرہی تو جائے گا۔"

چاچی ہنستے ہنستے لال ہو گئیں۔ "ارے یہ نرک میں بھی جوتا چلے گا۔ منّی جب پشکر کو مار ڈالے گی تو پھر یہ نرک سے جائے گا۔"

"اور تب بھی نرک میں جائے گا۔ دیکھ لینا چاچی۔ یہ بڑا کمینہ ہے۔"

"دیکھو ماں پھر میں اس کے ڈھیلا کھینچ کر ماروں گا۔"

"کیا ہو رہا ہے،" بابوجی نے اپنی چھتری کو بند کرتے ہوئے کہا۔

"ہندو مسلم فساد،" چاچی نے ہنس کر کہا۔

ڈرپوک پشکر بھاگ بھی گیا۔ چاچی مجھے پیار کرتی لے گئی اور مزے دار دال موٹھ کھلائی۔ چاچی تو مسلمان ہے یہ پشکر ہی کافر ہے۔

دیوالی آئی۔ پشکر کا گھر دیوں سے جگمگ کرنے لگا۔ میں نے اُس سے فوراً ملاپ کر

لیا اور دن بھر چراغوں کے لئے بتیاں بٹیں اور کھیلیں اور شکر کے کھلونے کھاتی رہی۔ چاچی بہت چلائی۔ منی کی بچی ساری روئی مسل مسل کر گٹھلیاں ڈال رہی ہے مگر میں بھلا کب مانتی تھی۔ شام کو پشکر سج کر نکلا۔ سفید جھاگ سی دھوتی۔ سرخ ململ کا کرتہ۔ خوب مانگ پٹی کئے لال لال ٹیکہ لگائے چاچی بھی بنارسی ساڑھی پہنے۔ جھانجن جھنکارتی، دیولے سنبھالتی پھر رہی تھی۔ پشکر گھر کی ہر ایک چیز کا محافظ بنا ہوا تھا۔ آج وہ کٹر ہندو تھا اور مجھ سے چھوت کر رہا تھا۔ وہی ندیدہ پشکر جو کتنی ہی دفعہ میرے جھوٹے بیر کھا چکا تھا آج مجھے کھجوری دور سے پکڑا رہا تھا۔ میرا دل کڑھ رہا تھا۔

"پشکر! ہمارے بھی چندن لگا دو۔" میں نے اُسے پرانے احسانات یاد دلا کر کہا۔

"نہیں" اس نے غرور سے سر ہلا کر کہا "تم ہندو تھوڑی ہو"

"نہیں پشکر اب تو میں ہندو ہوں۔ اماں سے نہ کہنا۔ اچھا۔"

اُسے شاید رحم آگیا اور اس نے بڑے اہتمام سے چندن لگایا۔

عید پر میں نے بھی ساری کسر نکال لی۔ پشکر کو کافر کہہ کر اس سے فوراً لڑائی کر لی۔ مگر جب مہندی سے میرے ہاتھ پیر لال ہو گئے تو میں بے چینی سے اس کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ آیا تو میں بے توجہی سے اپنے ہاتھوں کو گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔

"اہا۔ منی کے ہاتھ بڑے لال کتنے ہو گئے۔ دیکھیں منی"

میں نے اس کے ہاتھ جھٹک کر کہا "ہٹو بھئی ہماری تو عید ہے۔ کوئی تمہاری تھوڑی ہے۔ جناب آپ کوئی روزے تھوڑی رکھتے ہیں مسلمان جو روزے رکھتے ہیں تب ہی اُن کی عید آتی ہے۔

"تو کب روزے رکھتی ہے"

"واہ۔ میں ایک ڈاڑھ کا رکھتی ہوں۔"

"اونہہ بڑی رکھنے والی آئی۔ دن بھر تو بکر بکر کھاتی ہے ایسے ایک ڈاڑھ کا میں بھی رکھ لوں گا۔"

"واہ تم ہندو ہو" میں نے آخری تڑپ لگاتے ہوئے کہا۔

وہ کھسیانا ہوگیا "تو اس سے کیا ہوتا ہے"

"ہم کل نئے نئے کپڑے پہنیں گے" میں نے اترا کر کہا۔

"میں بھی اپنا نیا کوٹ پہنوں گا۔"

"واہ تم ہندو ہو، تم کیوں پہنو گے۔ ہم تمہیں اپنی سویاں بھی نہیں کھلائیں گے۔"

"اور ہماری دیوالی پر ڈھیر سی کھیلیں ٹھونس آئیں۔ ہم سے چندن بھی لگوا لیا۔ بابوجی سے کھلونے بھی ٹھگ لئے اور اب ایسی باتیں کرتی ہے۔ بے ایمان کہیں کی۔"

میں نے فوراً شنکر سے لڑ کر اُسے بھاگ جانے پر مجبور کیا۔ لیکن کپڑے بدلتے ہی مجھے اس پر رُعب گانٹھنے جانا پڑا۔

میں گوٹہ ٹھپے کے کپڑے پہن کر غبارہ بنی ہوتی جب شنکر کے پاس پہنچی تو اُس کا سارا غصہ رفو چکر ہو گیا اور اُلٹی میری خوشامدیں کرنے لگا۔ مگر میں نے اُسے بار بار سمجھایا کہ وہ ہندو ہے اور اُسے ہماری عید پر خوش ہونے کا کوئی حق نہیں۔

وہ مایوس ہو کر کہنے لگا "اچھا ہم بھی مسلمان ہوئے جاتے ہیں۔ کہنا مت کسی سے۔"

مگر بے ایمان کہیں کا ہولی پر پھر کافر ہو گیا اس کی بن آئی اور میرے پیچھے لگے رہنے اور خوشامدیں کرنے کے باوجود اُس نے مجھے رنگ کھیلنے سے صاف انکار کر دیا۔

"تو مسلمنٹی ہے"، اُس نے کہا۔

"اچھا شنکر عید پر آنا کیسا بٹوں گی کہ یاد کرے گا"، میں نے سر ہلا کر کہا۔

"تو پھر تو ہندو ہو جانا"، پنڈت جی نے سر کو بے رُخی سے موڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو مجھے ابرق ملا ہوا گال تو دو۔"

"تو تو اُس دن کہتی تھی کہ بدن کے جوں جوں حصے پر رنگ پڑتا ہے وہ دوزخ میں جاتا ہے۔ اب رنگ کیوں مانگتی ہے۔"

"اب میں ہندو ہو گئی۔"، میں نے قائل ہو کر کہا۔

"ہے بے ایمان ہر دفعہ ہندو ہوتی ہے اور پھر مسلمان ہو جاتی ہے۔ پہلے وعدہ کر کہ اب کے سے مسلمان نہیں ہو گی۔"

"اچھا۔"

"اور مجھ سے شادی کرے گی۔ کیوں ہےنا؟"

میں نے یہ آخری شرط بھی مان لی اور عید تو عید میں محرم پر ہی مشرف باسلام ہو گئی اور پشکر کو یزید کا بچہ کہا، کیونکہ وہ کافر اور دوزخی تھا۔

یہ پنڈت بھی کیا بھولی ذات ہے اور کشمیری پنڈت خصوصیت سے بس فرشتہ ہوتا ہے اِدھر میں پشکر کو مارتی اُدھر وہ ملاپ کر لیتا۔ بزدل اتنا کہ ذرا سے جو بکرے کٹے تو انہیں تڑپتا دیکھ کر رو دیا۔

"ارے تیرے ابا اتنے بکرے کیوں مار ڈالتے ہیں" اس نے بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے پھاڑ کر کہا۔

"ارے بے وقوف! یہ تو ثواب ہے" میں نے عالمانہ لہجہ میں کہا اور اس کے رونے کا مذاق اُڑایا۔

"ثواب ہے! ــــ بکرے کا کاٹنا ثواب ہے؟"

"ہاں اور کیا۔ جب ہم جنت میں جائیں گے تو ان بکروں پر سوار ہو کر پُل صراط سے گزریں گے۔ پشکر ہم تو فٹا فٹ چلے جائیں گے اور تم رہ جاؤ گے۔"

"میں اپنی سائیکل پر چلا جاؤں گا۔"

میں جل گئی "واہ جناب پُل صراط بال سے بھی باریک اور تلوار سے بھی تیز ہے۔ تو دھڑام سے دوزخ میں گر پڑے گا اور ہم بکروں پر ٹک ٹک کرتے چلے جائیں گے"

"میں تیرے بکرے پر بیٹھ کر جاؤں گا۔"

"واہ ہٹ میں تجھے دھکیل دوں گی۔"

"میں خود تجھے گرا دوں گا۔"

"کیسے گرائے گا تو" میں نے اُسے تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

ایک چشم زدن میں وہ گرا کر دو چلتیں لگا چلتا بنا۔

چوڑیاں ٹوٹ جانے سے میرا کلیجہ پھٹ گیا اور ایسی دہاڑی کہ بابو جی اُسی وقت بازار سے چوڑیاں پہنوا کر لائے۔

نہ معلوم کتنی عیدیں اور ہولیاں گذر گئیں ۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ خیالات بھی
ل گئے۔ ہم دونوں تو گویا مذہب کی فلاسفی ہی کو سمجھ بیٹھے تھے۔ ہولی پر پشکر آتا اور
ھے رنگ میں شرابور کر دیتا اور ڈھیروں گلال مل دیتا۔

جنم اشٹمی پر اس نے مجھے کرشن کا ایک مرمریں اسٹیچو دیا جس کے پیروں کے قریب
یک چھوٹے سے فریم میں پشکر کی تصویر تھی۔ تصویر اور مجسمہ دونوں میری میز پہ رکھے
ہتے اور اکثر میری توجہ کا مرکز بن کر رہ جاتے۔

پشکر بنارس چلا گیا اور میں علی گڑھ۔ ہمارے اسکولوں کی چھٹیاں بھی مختلف زمانوں
یں ہوتیں اور اب عید اور ہولی پر بھی ہم دونوں نہ ملتے۔ خدا دسمبر کا بھلا کرے۔ سب
ے لئے برابر سامانِ لطف لے آتا ہے۔ میں برآمدے میں لیٹی کچھ پڑھ رہی تھی کہ "مسلمنٹی"
ی صدا نے مجھے پشکر کے آنے کی خبر دی۔ میں نے "کافر" کہہ کر اس کا استقبال کیا۔ اس
ے میرے منہ پہ گلال مل دیا۔

"ارے یہ دسمبر پہ ہولی!" میں نے اسے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ گلال میں نے تیرے لئے ہولی پہ بچا کر رکھ لیا تھا۔ کیا تو مجھے سوّیاں نہیں
ھلائے گی؟"

"نہیں، تو تو کافر ہے!"

"اور تو کافرنی۔ تجھے اپنا ہولی والا بچپن یاد ہے۔"

"کون سا؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"اب اترائی۔ تو نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ مجھ سے شادی کرے گی۔"

"ہٹ بدتمیز!"

"کیوں بنتی ہے"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔

"سنا ہے مسولینی تم لوگوں پر بڑا ظلم توڑ رہا ہے"

"پشکر میری سانولی (کالی سی) رنگت پہ ہمیشہ ہی چھینٹا کسا کرتا ہے۔

"ولایتی چوہے تو اپنی خیر ہے۔ سنا ہے فی چوہا ایک آنہ چونگی سے انعام ملتا ہے" میں نے اس کی گوری رنگت پر حملہ کیا۔

ہندو مسلم فساد کے کچھ ذکر پر میں نے اس سے کہا۔

"بھاگ یہاں سے بھئی تو ہندو ہے۔ کہیں چاقو وا قو نہ مار دے۔"

"تو ہی قصیبٹی ہے میں تو بے چارا بزدل۔ تو ہی سینکڑوں بکرے ہضم کر گئی۔"

"مگر پشکر تم بکرے نہیں، تم تو بیل ہو"

اس نے میرے بازو میں وہ زور سے کاٹا کہ میں تڑپ ہی تو گئی۔

"اگر تو اتنی کلوٹی اُلٹا توا نہ ہوتی تو میں ضرور تجھ سے شادی کر لیتا۔"

"خیر پشکر میں اُلٹا توا تو نہیں ہوں۔"

"تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ سے شادی کر لوں" اس نے آنکھیں چمکا کر کہا۔

"چپ کافر!"

"جانتی ہو شعرا نے کافر کس کو کہا ہے؟"

"وہ کافر اور ہوتا ہے تو تو گدھا ہندو ہے۔"

"کیا ہندو اور مسلمان گدھے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور یہودی گدھے کیسے ہوتے ہیں؟"

ہم مختلف مذاہب کی مناسبت سے گدھوں کی اقسام پر بحث کر کے ہنسنے لگے۔

زمانہ گزرتا گیا۔ پشکر ڈپٹی کلکٹر ہو کر ہمارے قریب کے ضلع میں تعینات ہو گیا۔ اس کی موٹر اتوار کے دن گھس ڈالی جاتی تھی۔ اس نے کئی بار مجھے اپنا ہولی کا بچپن یاد دلایا۔ لیکن میں نے بے تکی بات کہہ کر زبان سے نکالنے کو بھی منع کیا۔

"آخر کیا تو مجھے یوں ہی ڈراتی رہے گی! میں آج ماں سے ذکر کروں گا۔ چاہے پھر غدر ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ڈرپوک کہیں کی۔"

"پشکر بڑے جوتے پڑیں گے۔ یاد رکھو ابا پیٹ پھاڑ ڈالیں گے۔"

"اجی ان باتوں سے نہیں ڈرتا۔ لیکن یہ تو سوچو کہ آخر کب تک یہی سوچتے رہیں کہ آسمان سے ہماری مدد کو کوئی آئے۔"

"پشکمہ یہ تو سوچو کہ ہم اور تم کس قدر معیوب بات کہہ رہے ہیں۔ ہمارے درمیان ایک خلیج حائل ہے۔ مذہب!"

"اجی گولی مارو اس مذہب کو۔ مذہب ہمارے فائدے کے لئے ہے نہ کہ ہم اس کی قربانی کے لئے۔"

"تم ابا جان اور چاچا کی دیرینہ محبت کو دیکھو۔ ان کی جو بات شہر میں ہے۔ اس پر غور کرو۔ ہماری شادی سے ان کی کیسی ذلت ہو گی۔ اخبار جنہیں کوئی ڈھنگ کا موضوع میسر نہیں ہماری تصویریں، ہماری عشق بازی اور موجودہ تعلیم کی وہ درگت بنائیں گے کہ جینا دشوار ہو جائے گا۔ غیر مذہب میں شادی کرنا جرم ہی نہیں بلکہ ایک آفت ہے۔ ہماری قوم کے لڑکوں کو یہ اجازت ہے کہ وہ ہندو عیسائی جس سے چاہیں شادی کر لیں۔ لیکن لڑکیوں کو نہیں اور آج تک فخر سے کہا جاتا ہے کہ مسلمان لڑکی کو کبھی عیسائی سے شادی نہیں کرنی چاہیئے نہ معلوم کہاں تک یہ فخر بجا ہے۔"

"لیکن میں مسلمان ہونے کو تیار ہوں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے دوسرے مجھے تمہاری یہ شرط منظور نہیں۔"

"چونکہ میرے لئے تمہارے مسلمان ہو جانے سے کوئی فرق نہ ہو گا۔ تم جب بھی اتنے ہی پاجی رہو گے۔ پسند سے اور مذہب سے دور کا بھی لگاؤ نہیں"

"تو پھر تو ہندو ہو جا۔"

"ذرا سوچ سمجھ کر بات کرو۔ ابھی جو میں کہہ دوں کہ مجھے مرتد بنا رہا ہے تو محلہ کے سارے قصائی تیری بوٹیاں کر ڈالیں۔ دوسرے اگر میں ہندو ہو جاؤں تو ڈیڈ کی ناک بھی تو سلامت رہے۔"

"ہم غلام ہیں۔ پشکمہ ہماری کوئی چیز ہماری کہلائی جانے کی مستحق نہیں۔ ہم سوسائٹی کی ملکیت ہیں، وہ جو کچھ چاہے ہمارے ساتھ کر سکتی ہے۔ ہم اگر چاہیں تب بھی کچھ نہیں کر سکتے۔"

"یہ سب واہیات ہے میں کچھ نہیں جانتا۔ تمہارے بھائی جو ایک بیوی کی موجودگی

ہیں میم لے آئے۔ وہ عیسائی ہے۔ برابر میں نے اُسے گرجا جاتے دیکھا اور تمہارے بھائی صاحب کو بھی۔

"پشکمہ وہ میم ہے اور تو پنڈت۔ اور میں بقول تیرے مسلمنٹی۔ بس لگالے حساب!"

پشکمہ بے چینی سے ٹہلنے لگا "میں اس سوسائٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ سُنتی ہو۔ ہم آج ہی سول میرج کر لیں گے"

"خواہ مخواہ بھڑنے سے کیا حاصل۔ تم جانتے ہو آپا کو کس قدر صدمہ ہوگا اور تمہاری برادری تمہارا حقہ پانی بند کر دے گی۔"

"پھر کیا کریں۔ سچ بتا تو کہیں اس باجی حمید سے تو شادی نہیں کر رہی ہے اور مجھے چکمے دے رہی ہے۔ یاد رکھ اس قدر پٹواؤں گا خان صاحب کو کہ بھول جائیں گے اور علاقہ الگ کورٹ کرالوں گا۔ دیکھ اگر ہم یوں ڈرتے رہے تو بس ہو چکی زندگی۔"

"تو تو سچ مچ پاگل ہی ہے۔ سوچنے تو دے۔ شاید خدا کوئی راہ بتا دے"

"اب بتا چکا خدا راستہ، بس جو بتا رہا ہوں۔ کوتوالی کے قریب سے ہوتے ہوئے داہنے ہاتھ کو نکل چلو۔ وہاں سے بس سیدھی سڑک مل جاتی ہے۔"

"اور وہاں سے واپس آکر ابا کا جوتا"

"واپسی کیوں۔ وہاں سے سیدھے دورے پر چلیں گے۔"

"تو یہ مشہور ہو جائے گا کہ میں بھاگ گئی"

"نہیں، بلکہ میں تیرے ساتھ بھاگ گیا۔ اُٹھ جلدی ہاں۔ تجھے کچھ مہر وہر کیا ہوتا ہے وہ چاہیئے۔ بس رجسٹری کرا دوں گا۔"

"مہر میں خود تجھے دوں گی۔ میری تنخواہ تجھ سے ذرا سی ہی تو کم ہے"

"اچھا اُٹھ تو مہر دے"

"مگر جب جی چاہے گا طلاق دے دیں گے۔"

"یہ بھول ہے تو تو ہر وقت لڑتی رہتی ہے۔ گھڑی میں سات طلاقیں دے گی۔ چل جلدی۔ ساڑھی بدل لے۔"

"اور ربڑ کی ناک!"

"ٹھیک ہے۔ بڑی ستواں سی لادیں گے یہ تو ویسے بھی بالکل چپٹی ہے۔"

"تو میں نہیں چلتی۔" میں نے دروازے کو پکڑ کر کہا۔

"اپنے بس نہیں چلے گی۔" اس نے گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"تھوڑی دیر بعد ہم کوتوالی کی سڑک پر سیدھے ہاتھ کو بڑی سیدھی سڑک پر جا رہے تھے۔

"اب بھی لوٹ چلو۔" میں نے پشکنہ کے کان میں کہا۔

"سچ مچ!" اُس نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

میں نے سر ہلا دیا۔ خدا جانے نفی میں یا اثبات میں اور پشکنہ نے گردن پکڑ کر مجھے جھکول ڈالا۔

"کافر!" میں نے اس کی کلائی میں ناخن گڑو کر کہا۔

"شاعروں والا۔"

میں نے سر ہلایا۔ لیکن اس دفعہ اثبات میں۔

نیرا

پھٹے پرانے گودڑ کے لحافوں اور گدّوں کے انبار میں نہ جانے کتنی ہستیاں غافل پڑی تھیں۔

"دھائیں۔ دھائیں۔" جیسے گولیاں چلنے لگیں۔ چوکھی رام کی کھانسی ہوا میں گونجی۔

گودڑ کے ڈھیر کے ایک کنارے کو جنبش ہوئی اور ایک مرجھایا ہوا چہرہ جس کے گرد کھچڑی بال سیہ کے کانٹوں کی شکل میں لٹک رہے تھے۔ اپنی چچماتی ہوئی آنکھوں سمیت جھانکا۔

"دھائیں، دھائیں۔ دھا... دھائیں۔ اوہ۔ ہا۔ دھائیں... دھک حاق... تھو"

اور قریب کی دیوار پہ کیچڑ کا سا پٹاخہ سنائی دیا اور پھر دھائیں دھائیں شروع ہو گئی۔

"پھر... پھر... رمو کی ماں... اونہہ" اور پھر وہی گولیاں سی چھٹنے لگیں۔

رمو کی ماں یعنی وہی جھرٹک چہرے اور کھچڑی بالوں والی رمو کی ماں نے گودڑ میں ایک کھلی ہوئی جگہ ڈھونڈھ کر سر اٹھایا اور ساتھ ہی ساتھ ایک قحط زدہ جسم باہر نکلا۔ کمر کچھ یوں ہی سی جھکی ہوئی اور سینہ اندر کو بیٹھا ہوا تھا۔

"لیٹ جاؤ" اس نے چوکھی کے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کندھے آہستہ سے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"او... ہ۔" اور وہ پیچھے لڑھک گیا۔ رمو کی ماں کا دل کڑھ گیا اس کا یہ مطلب تھوڑی تھا کہ وہ گر جائے۔ وہ اسے پیار سے سہارا دے کر اٹھانے لگی۔

"تھوڑا پانی دیوں۔ کھانسی رکے گی۔" پانی کی گڑوی منہ سے لگا دی گئی اور "دھائیں دھائیں" کے جھٹکوں اور "کھوں کھوں" کے کھچاکوں کے درمیان چند گھونٹ پانی کے چوکھی کے حلق میں پھسلا دیئے گئے۔

"دی..... ای..... بھی۔ او ہو۔ ہو۔ کون ہے جینے۔ رموں کی ماں..... ٹھ۔" بوڑھے کے گلے سے ایک بات ڈھنگ سے نہ نکل سکتی تھی۔ پھر وہی بھیانک کھانسی کے گھونسے لگنے لگے جیسے تازے دھان نیئے موسل سے کوٹے جا رہے ہوں۔

"رمّو،" ماں آٹھ دس برس کے میلے کچیلے چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے رمّو کو دیکھنے لگی۔ ایک امید بندھی اور پھر ٹوٹ گئی۔

اگر آج بھی وہی دودھ ہاٹ نہ گیا تو کیا ہوگا۔ مٹھا تو گھر میں موجود تھا پر دانے کے نام لکڑی بھی نہ تھی۔ رمّو کی ماں جائے تو چوکھی کی دیکھا بھالی کون کرے۔ نہ جانے کب درد بڑھ جائے۔

"نیرا چلی جیئے،" چوکھی کا سینہ ملتے ہوئے بولی۔

"تو جگا..... ہا،" اور پھر دھان کٹنے شروع ہو گئے۔ کھانسی ہٹی کٹی جوان جاٹنی کی طرح چوکھی رام پر سوار تھی۔ رمّو کی ماں نے چوکھی کو خوب کمبل سے ڈھک دیا۔ کمبل بھی تو جی چھوڑ چکا تھا۔ نہ جانے کتنے سالوں سے وہ چوکھی کے مفلس قبر کی طرح دھنسے ہوئے سینہ پر پڑا پڑا اُکتا چڑا یا کرتا تھا۔ سوئیوں، چھیتڑوں پر اُنے اونی بنیائنوں کے جوڑوں اور پیوندوں نے اسے صورت سے بے صورت بنا دیا تھا۔ آدمی مر جاتا ہے تو دفن کر دیتے ہیں یا پھونک دیتے ہیں کمبل بے چارے کو تو چھٹکارا ہی نہ تھا۔

"نیرا..... او نیرا۔" ماں نے گودڑ میں سے اُس کا کندھا ڈھونڈھ کر ہلایا۔

"اوں،" نیرا نے نیند میں روٹھ کر کروٹ بدل لی۔

"اُٹھ بیٹا بابوجی کا جی اچھا نہیں۔ ہاٹ چلی جا۔ اُٹھ نا!"

"نیرا۔ لی بھی نہیں۔ ماں نے اب کڑا اپکڑا۔

"اُٹھتی ہے رانڈ کہ لگاؤں اب،" اور گودڑ کے لچھے اس کے جسم پر سے کھسوٹ لئے۔

نیرا کھیٹر کھیٹر سر کھجاتی اور بدن توڑتی اُٹھی۔ ماں منتظر رہی۔ سر کھجاتے کھجاتے ہاتھ پیچھے کو ڈھلک آئے اور کمر پہ پہنچ کر آرام سے لیٹ گئے۔ نیرا بیٹھی بیٹھی سو گئی۔ اب ماں سے صبر نہ ہو سکا۔ گڑوی اُٹھا کر چلّو بھر پانی چھپاک مُنہ پہ ہا۔ ا۔

"سوں سوں۔ہاں۔" نیرا میلے میلے پانی کو چہرے پہ ملنے لگی۔ اب رمو کی باری آئی۔

"رمو، باؤلا۔ سڑی۔ دن بھر گاؤں کے چھورے اسے چھیڑتے۔ جس کا جی چاہتا بیگار پہ لگا دیتا۔ گھر کا کام کرتے تو اس کی مٹی پلید ہو جاتی تھی۔ اِدھر اُدھر سے دو چار گیت سیکھ لئے تھے اور کولے پر ہاتھ رکھ کر ٹھمکنا بھی آتا تھا اور دوپہر کی چلچلاتی دھوپ سے جی چھوڑ کر سب کے سب پیپل کے نیچے بیٹھ جاتے اور ذرا سی دیر میں محفل رقص و سرود جم جاتی۔ بنو اپنی بھرائی ہوئی آواز میں "چرا کر لے گیا جالم مری جنجیر سونے کی" گاتا۔ سیتل اپنے جھلسے ہوئے سینے اور موٹے موٹے ہونٹوں کی مدد سے "بھم بھم پٹاک" طبلے کی گت شروع کر دیتا اور رمو کی کمر پہ ہاتھ رکھ کر منہ سے "چھپک چھپک چھئی" کی تال دے کر مٹکنا شروع کر دیتا۔

رمو زنانہ تھا۔ سیتل بھی کہتا تھا کہ وہ بیچ کھیت زنانہ ہے اور بنو کی بھی یہی رائے تھی۔ دیکھ لینا چاہے۔ پر اس وقت تو رات کے تین بجے وہی نیرا کا محافظ بن کر ہاٹ جا رہا تھا۔ تین چار موثر جھٹکوں اور پھسلتے ہوئے طمانچوں کی مدد سے اسے کھڑا کیا گیا۔ بوریئے کو نفاست سے طے کر کے "گھوگھی" تیار کی گئی اور رمو چلنے کے لئے تیار جمائیاں لینے لگے۔

دودھ ہی کی بڑی ملیاں، ایک گھی کی مٹکی، دو چھوٹی چھوٹی بلٹوئیاں پنیری، دو سیر اور چھوٹے چھوٹے باٹ، دو دھڑے کے پتھر، ترازو اور مکھن کی پنڈیاں ماں نے پتوں میں لپیٹ کر دیسے ہی کونے میں رکھ دیں۔ اوڑھنی کے کونے کی انڈی بنا کر نیرا کے سر پہ جمائی اور ماں نے سہارا دے کر آدھ من کا بوجھ سر پہ ستوار دیا۔ ایک دو دفعہ اس کا پتلا دبلا جسم نیم کی کچی لکڑی کی طرح لچکا اور پھر وہ جم کر کڑی ہو گئی۔

چھوٹے تال سے گزر کر پلیا پر سے ہوتے ہوئے دونوں ننھے منّے بیوپاری شہر کی سڑک پر چلنے لگے۔ یہ کمبخت جاڑا تو اب کے ایسا دانت پیس کر پیچھے پڑا تھا کہ نرم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ گرمی تو جیسے تیسے کٹ جاتی۔ جا ہو جتنا نہاؤ۔ پیاؤ پر سے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی جا ہو جتنا پی لو۔ نہ کپڑوں کی ضرورت نہ کچھ۔ رمو کو تو دھوتی کا بھی مرہونِ منت نہ ہونا پڑتا تھا۔ سیاہ سوت کا ڈورا جو اس کے کچری جیسے پیٹ پر سے پھسل کر کولھے کی ہڈیوں پہ مزے سے ٹک جاتا تھا۔ ضرورت سے زیادہ تھا۔ مزے سے تلیا میں ڈبکی لگائی۔ نہ تولیے کی ضرورت

نہ بیدنگ گاؤں کی حاجت۔ کنارے پر اکڑوں بیٹھ گئے اور لو کے جھپاکوں سے سوکھ گئے۔ مگر اب تو جانے کتنے دن ہو گئے تھے۔ پانی چلّو میں لیتا تھا پر چھپکا مارنے کی ہمّت نہ ہوتی تھی۔ اور پھر بیری سے لے کہ زمین پر جھڑک دیتا۔ ہاں دانت خوب اُنگلیوں سے رگڑتا۔ یہاں تک کہ چوں چوں بولنے لگتے۔

اور یہ جوئیں! ہر وقت نیرا کے سر میں گھوڑ دوڑ مچاتے رکھتیں۔ سر نے جوگیوں کو راتیں میں نیند بھی تو نہیں آتی۔ کھرنڈ بندھتے اور پھر اُکھڑ جاتے۔ سرسوں کا تیل آٹھویں دن ہی کھٹّی کھٹّی بو دینے لگتا۔ کہاں تک کوئی سر دھوئے۔

نیرا کو پھر نیند آنے لگی۔ "اونہہ" اس نے گردن کی رگوں کو تان کر جیسے نیند کو مار ہی تو بھگایا۔ رمّو کے ٹھوکر لگی اور وہ سڑک کے گستاخ روڑوں کو مغلظات سُنانے لگا۔

پَو پھٹنے میں ابھی دیر تھی اور اس کی بھینی بھینی خوشبو سڑک کے دونوں طرف سے آ رہی تھی۔ دُور کہیں سے رہٹ کی سُریلی روں روں اور مویشیوں کی اژدہوں جیسی پھنکار ہوا کی سنسناہٹ میں مل جُل کر عجیب طلسم پیدا کر رہی تھیں۔

"کھٹاکھٹ"، کوئی کٹّی کاٹ رہا تھا۔

"ٹوپ ٹوپ۔ چھنن چھنن"، دور کوئی اِکّہ جا رہا تھا۔

ہاٹ ابھی بہت دور تھی۔ نیرا کی آنکھیں پھر جھپکنے لگیں۔ باوجود دانت بھینچنے کے ایک جمائی ہونٹوں میں سے نکل ہی گئی۔

"آ۔۔۔ وَ۔ رمّو"، نیرا نے وقت کاٹنے کے لئے بولنا شروع کیا۔

"آں۔۔۔"، رمّو مرکھلّی آواز میں بولا۔

"کوئی کتّی دُور آ گئے ہوں گے"

"بہت دور"، رمّو رونی آواز میں منمنایا۔

"اور اب ہاٹ کتّی اِک دور ہو گی؟ ایں؟"

"بہت دُور"، رمّو نے بہت کو کھینچ کر کہا۔

موڑ پر راستہ کاٹنے کے لئے گدگدے گدگدے میلے کے ڈھیر پر سے نیرا آہستہ آہستہ

گھورنے لگی۔ کہ سامنے ٹاپ ٹاپ چھنن چھنن یکہ سر پہ آ گیا۔ نیرا بچنے کے لئے کبھی سڑک کے اِدھر گئی کبھی اُدھر۔ مگر وہ کدھر بھی نہ جا سکی اور اگر وہ ذرا پرے نہ گرتی تو اِکے کا پہیہ اس کے سوکھے ہوئے سینے کو چرچر کرتا گزر جاتا۔ یکہ والے نے ایک بہن کی گالی نا معلوم شے کو اور دو ایک اپنے گھوڑے اور چابک کو دیں اور نکلا چلا گیا۔

نیرا کا کلیجہ پھٹ گیا اور رمّو زنانہ تو رو ہی دیا۔ زمین پر بکھرے ہوئے دہی کے لوتھڑے، چاندی کے ڈلوں کی طرح شب کی تاریکی میں جگمگا رہے تھے زمین دودھ کو مفت کے مال کی طرح چوسنے لگی۔ اور نیرا آنکھوں میں سے کنکروں کی بجری پھڑانے لگی۔ اس کڑکڑاتی سردی میں آنسو ساون بھادوں کی جھڑی کی طرح بہنے لگے۔

"نیرا بھی پٹی اور رمّو بھی، مگر گرا ہوا مال واپس نہ ملا۔

چوکھی کی کھانسی میں کمی نہ ہوئی۔ پھیپھڑے دن رات کی دھونس نہ سہہ سکے اور جاڑوں کے رخصت ہونے سے قبل ہی چوکھی چل بسے۔ رمّو کی ماں نے ماتھا پھوڑ لیا اور نیرا روتے روتے نیلی پڑ گئی۔ رمّو کو پتہ بھی نہ تھا کہ ہنڈیا بھر راکھ وہ کس لئے لے جا رہا تھا اور جب بھوکے شعلوں نے چوکھی کے تپچی جیسے جسم کو بھوننا شروع کیا تو وہ اپنی آنکھیں دونوں ہاتھوں سے ڈھک کر چلانے لگا۔

اندھیری سنسان راتیں جیسے تیسے کٹنے لگیں۔ بجھڑ کی روٹیاں اور لوٹا بھر مٹھا حاصل کرنے کے لئے سارے گھر کو دن بھر تیرے میرے کھیت میں جتے گزر جاتی۔ نیرا گھاس چھیل لاتی۔ بھینسوں کو بھی دن لگے اور دودھ چرانا شروع کر دیا۔ کون دیکھتا بھالتا۔ کانجی ہاؤس میں ہی ایک تو ضبط ہو گئی۔ دوسری بیانے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ بھینس جب بوڑھی ہو جاتی ہے تو پتہ نہیں چلتا۔ نہ اُس کی کمر جھکے، نہ بال کھچڑی ہوں۔ دن بھر کی محنت مشقت نے نیرا کو اور بھی جلدی جوان کرنا شروع کیا۔ جوانی غربت کو نہیں دیکھتی۔ بن بلائے لوٹ پڑتی ہے۔ اور پیسے کے سنے بیل دیتی ہے۔ بھر پیٹ روٹی نہ ملی تو کیا، سہاؤنے خواب تو کوئی روک نہ سکا۔ جمپر اور شلوکے نہ رُکے تو کیا جسم تے پیر روک لئے وہ تو بڑھتا ہی گیا۔ پندرہ برس کی نیرا ایک خیالی دنیا میں جھکولے کھانے لگی۔ نہ جانے کس نے اس کے کان میں چپکے سے کہہ

کہہ دیا کہ وہ موتی۔ سیتل اور سُندر جیسے نوجوان چھوکروں کو دیکھے تو ایک دفعہ اپنے چکیٹ آنچل کو پھسل جانے دے اور کمر کو خواہ مخواہ ہلکا سا جھٹکا دے کر سنبھل جائے۔ جب وہ تھک ہار کے گدڑی میں سُکڑ کر بیٹھتی تو اس کی متعفن فضا میں شریک ہونے، نہ جانے کون کون آپہنچتا۔ بھاری بھاری ہاتھ مسکراتے ہوئے گرم گرم اُس کے قریب سرکتے ہوئے چلے آتے۔ اور کئی دفعہ وہ رونی سی ہنسی ہنس دیتی۔ جس پہ ماں گھُرکی بناتی۔ جوانی کو خیرباد کہہ کہ آئے دن کی روگی بُڑھیا طوفان بھرے زمانہ کے سب دُکھ درد فراموش کر چکی تھی۔

پڑھنے لکھنے والے لڑکوں کو گاؤں میں کوئی جاذبیت ہی نظر نہیں آتی۔ سیٹھ کے لاڈلے سُندر کو بھی گاؤں میں آکر دن بھر گھر میں پڑے رہنے کے سوا کچھ چین نہ آتا۔ جدھر وہ نکل جاتا خود اس کے ہم عمر اس کی جوتیوں کی خاک چاٹنے لگتے۔ اُس کا معیار بڑا اونچا تھا۔ گھسیارنوں اور گوالنوں کو چھیڑ کر وہ اپنی قسمت گرانا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے سیٹھ بھی بڑا اکڑ تھا۔ گاؤں والوں سے بگاڑنا نہ چاہتا تھا۔ بھولے بھالے کسانوں کو پیار پچکار سے قابو میں رکھنے والا بڑا دریا لو ہوتا ہے۔ تو سُندر بڑا سیدھا تھا مگر کچھ تو چاہیئے زندگی بھی ہوئی نا۔

ایک دن اس نے نیرا کو بڑی سی گٹھڑی سے نبٹتے دیکھا تو یوں ہی شرافت سے مجبور ہو کر ذرا سا سہارا لگا دیا اور ایک گیانی سادھو کی طرح دور چلا گیا لیکن دوسرے روز عین اسی وقت وہ نہ جانے کہاں سے پھوٹ نکلا جب کہ نیرا اپنے بوجھ کو سر پہ رکھنے کی کوشش کر رہی تھی تو اس نے پھر امداد بہم پہنچائی۔

اُس نے گٹھڑی اُٹھوا دی اور یونہی بھولے سے اُس کا ہاتھ پھسل گیا۔ نیرا کا لو را جسم کانپ اُٹھا۔ اور وہ بمشکل لچکتی ہوئی چل دی۔ جب وہ گھر پہنچی تو اُسے اتنا پسینہ آیا کہ اُس نے فوراً شلوکہ اُتار کر دیوار پہ پھیلا دیا اور خود دھوتی لپیٹ کر کونے میں بیٹھ گئی اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے سارے جسم پہ گھاس کے تنکے رینگ رہے ہیں خود اپنے ہاتھ کے مس سے شرم آنے لگی۔ رگ رگ میں گدگدی ہو رہی تھی۔ اس نے جلدی سے ساری کو اور بھی لپیٹ لیا۔ رات کو دیر تک اسے نیند نہ آئی نہ جانے کس کے ہاتھ اُس کے جسم پہ سرسرا رہے تھے۔ بار بار وہ بالوں دار سخت سخت انگلیوں کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑا

بیتی۔ اُسے رونا آنے لگا۔ بار بار کروٹ بدلنے پر ماں نے ڈانٹا۔ "یہ بھینسیا کی طرح اینڈ کیوں رہی ہے؟"

پھر وہ سو گئی۔

سُندر ایسا بودا تو نہ تھا۔ وہ نہ جانے کس سے ڈرتا تھا۔ چھٹیاں ختم ہونے کو آئی تھیں اور وہ گٹھڑی اُٹھواتے اُٹھواتے تھک گیا تھا۔ اب وہ گٹھڑی وہیں کی وہیں خرید لیتا۔ اور دو چار باتیں کر کے نیرا چلی آتی۔ مگر یہ تو جھول تھا۔ اگر گاؤں والوں کے دنگے فساد اور باپ کے جوتے کا خوف نہ ہوتا تو وہ کبھی یوں بے وقوف نہ بنتا۔ پھر بھی کہاں تک بنتا۔ پر یہ چھپے چوری کب تک؟ پھر وہ کالج چلا جائے گا۔ اگر شہر میں بھی نیرا ہو تو کیا بُرا۔ شہر میں مکان بہت سستے ہیں۔ خیال بُرا نہ تھا۔

"نیرا تم تو میرے بِنا بالکل سُکھی رہو گی!" سُندر نے ایک دن کہہ دیا۔

"تمہارے بِنا؟" وہ اِس لفظ "بِنا" سے ڈر گئی۔

"ہاں چھٹیاں جو ختم ہو رہی ہیں۔"

اُس نے سر لٹکا دیا اور کچھ نہ بولی۔

"تو تم بھی چلو نا" سُندر نے ضدّی بچہ کی طرح کہا۔

"میں!" نیرا نے ہِدک کر کہا۔

"اور کیا" نیرا میں اب بھی سُندر کے لئے دلچسپیاں تھیں۔

"مگر" اُسے لچھمی کا خیال آیا۔ جو داروغہ جی کے ساتھ رہی تھی تو پھر گاؤں والوں نے اُس کی کیسی گت بنائی تھی۔

"کیسا ہوا نیرا تمہیں رہنے کو مکان ملے گا۔ کپڑا لتّا جو چاہو گی سب کچھ۔"

"پر...." نیرا بے وقوف نہ تھی۔ وہ کئی دفعہ اِس قسم کی باتیں شیاما، رمپیہ وغیرہ سے سُن چکی تھی کہ لوگ بھگا لے جاتے ہیں تو ویسی بات ہوتی ہے۔

"تو ہم بیاہ کر لیں گے" سُندر نے ایک نئے خیال کے زیرِ اثر کہا۔

"بیاہ!" نیرا اُلجھ گئی۔ "بابو جی...."

" باپوجی کو خبر ہی کیوں ہو۔"

" ماں.....؟"

" نہ ماں کو"

" تو یہ کیسا بیاہ؟" اُس نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

" یہی کہ ہم تم چپکے سے کر لیں اور بیاہ میں کیا جوکھوں لگتے ہیں"

" پر وہ پھیرے اور پنڈت؟"

" کیا پنڈت بغیر بیاہ نہیں ہوتا..... ہا ہا۔ بے وقوف نیرا تم ان پڑھ ہو جبھی نا۔ بیاہ تو ایشور کے سامنے قول دینے ہی سے ہو جاتا ہے۔" نیرا کو ہرانے کے لئے کافی تھا۔

" پھر لوگ کیوں کہتے ہیں؟" وہ پھر بولی۔

" لوگ بے وقوف ہیں، بے کار، فضول ہیں۔ بھلا پنڈت کے اڈم شڈم بک دینے سے ہی بیاہ ہوتا ہے۔ ویسے نہیں ہوتا اور نیری ہمارا تو بیاہ ہو بھی گیا" وہ شرارت سے مسکرایا۔

" ہٹ" وہ شرمانے لگی۔ سُندر کو ترس آگیا۔ نہ جانے نیرا کی معصومیت پر یا جہالت پر۔

" بیاہ پھر کیا ہوتا ہے؟"

اور ایسا ہی ہے تو لاؤ بھانوریں بھی ڈال لیں۔ آگ بھی سُلگتے کتنی دیر لگتی ہے۔

اور تم گھونگھٹ بھی مار لینا۔" وہ زور سے ہنسا۔

" ماں" اُس نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

" اُونہہ۔ پھر وہی۔ نہ ماں نہ باپوجی۔ خواہ مخواہ دنگا مچے گا وہ کوئی منع تھوڑی کرے گی۔ میں کسی کو بتانا نہیں چاہتا۔ یہی تو ساری بات ہے۔"

نیرا چُپ رہی۔ رمو۔ ماں اور بہت سی باتیں تھیں جو اُسے یاد آنے لگیں۔

" سوموار تک سوچ بچار کر لو۔ اگر تم نہیں جاؤ گی تو نیرا...... آگے اُس نے نیرا کے تخیل پر چھوڑ دیا۔

نیرا گھر پہنچی تو ماں نے گالیوں سے آؤ بھگت کی۔

"رانڈ سارے سارے دن نہ جانے کہاں مری رہت ہے۔ نہیں ہڈیاں توڑن کو رہی ہوں۔ بناگھر گئی رہے۔"

نیرا غرور سے سر اُٹھائے آگ سُلگانے چلی گئی۔ بڑھیا نے پیچھا نہ چھوڑا۔

"پہلے بول کہاں رہتی" اس نے دونوں ہاتھ کمر پہ رکھ کر داروغہ جی کی طرح پوچھا۔

نیرا نے سب تو کام کر لیا تھا پھر غزہ کیسا۔ وہ کہیں گئی تھی کسی کو کیا؟

"بڑی سیر سپاٹے کی پڑی ہے سارا سارا دن یوں ای گھمنا پھنا۔"

بڑھیا نے دانت کٹکٹائے۔

"سارا دن تو کام کیا۔ اب ...."

"اُوپر سے گرّاتی ہے چھنال۔"

"تو کون سا سکھ دیتی ہو جاؤ۔ نہیں کرتی کام دھام۔ ہاں نہیں تو" اس نے گردن گھمالی۔

بڑھیا نے دو ہاتھ پاس پڑے چیلے سے لگائے۔

"کرے گی کیسے نہیں کام۔ نہیں تو میں تیرے آگے تھالی پروسوں۔"

"نہیں کروں گی میں کام۔" نیرا نے چیلے سے بچتے ہوئے کہا۔

"تو جا کھا کہیں اپنے یاروں کے ہاں۔ یہاں تو کام ہی کرنا ہوگا۔"

"چلی ہی جاؤں گی۔" نیرا نے منہ پھلا کر کہا۔

"اور کیا بیٹھا ہے ناکوئی تیرا خصم" وہ جانتی تھی کہ نیرا بکواس کرتی ہے۔

نیرا کو بڑھیا کی بھول پر بڑی ہنسی آئی۔ پر وہ چپ رہی اور سوموار کی راہ تکنے لگی۔

آج اگر اماں اُسے نہ ڈانٹتی ——— تو شاید سوموار کو وہ کہیں نہ جاتی اور شاید پھر مجھے اس کی بابت کچھ بھی معلوم نہ ہوتا۔ مگر بڑھیا کیوں مانتی۔ سوموار آیا پتّوں کے ڈھیر کی آگ جلی اور ضدّی چھوکری نے پھیرے بھی کئے اور گھونگھٹ بھی کاڑھا۔ پر نہ جانے کیوں کلیجہ میں دھکڑ پکڑ ہو رہی تھی۔ کوئی ہنس ہنس کر کہہ رہا تھا۔ یہ بیاہ نہیں ہوا۔

یہ بیاہ نہیں ہوا۔

بدمعاش لڑکی اور وہ بھی کنگال۔ اگر بھاگ جائے تو نہ تو پولیس دوڑتی ہے۔ اور نہ اخباروں میں چھپتا ہے۔

سُندر طالب علمی ہی کے زمانہ میں گھر ستی کے مزے لینے لگا۔ صبح صبح جب گرم گرم پراٹھوں اور چار کا ناشتہ کر کے وہ کالج جانے لگتا تو نیرا سے وہ بالکل ایسے ہی پان لگانے کی فرمائش کرتا جیسے اس نے اپنے موٹے توند والے باپ کو کہتے دیکھا تھا۔ اور جب وہ اس کے منہ میں پان دیتی تو اس کی انگلی آہستہ سے دانتوں میں پکڑ لیتا۔ نیرا کو اس کی یہ شرارت بہت ہی بھاتی۔

تین مہینے گزر جانے کے بعد بھی سُندر کا جی نیرا سے نہ اکتایا۔ یہ بڑی نئی بات تھی۔ یہ اُس کے اصول کے قطعی خلاف تھا۔ وہ چند دن یا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں سے زیادہ کا جھول ہی نہیں پالتا تھا۔ نیرا کی حیثیت نوکرانی کی سی تھی۔ پر جب وہ کام کاج کر کے بن ٹھن کر سُندر کا سر اپنے زانو پر رکھ کر تیل ڈالتی تو وہ پوری گھر والی نظر آتی۔ نیرا تو ایک دریا تھی جس سے سُندر سیراب ہی نہ ہو سکتا تھا۔ ابھی کیا جلدی تھی۔ بیوی تو تھی نہیں کہ ایک دفعہ جو ڈھول کی طرح گردن میں لٹکی تو سدا جھولتی رہی۔ ہر سال بچہ دے تو کچھ نہیں۔ پھول پھال کر بورا ہو جائے تو بھی نبھاؤ۔ نیرا کو جب وہ چاہتا چھوڑ دیتا۔ پر ابھی کیا جلدی تھی۔ نئی موٹر خریدنے سے پہلے پرانی کو جتنا چلا لو اچھا ہے۔ سُندر کی شادی دُور تھی۔

تین چار دن سُندر گھر سے کھویا سا رہا۔ وجہ کچھ بھی نہ بتلائی۔ ذرا فکر مند بھی رہتا تھا۔ نیرا اگر وہ روٹھ جاتا منا لیتی۔ ہنستا تو روٹھ جاتی۔ پر روتے ہوئے سُندر کو قابو میں لانا اس نے نہ سیکھا تھا۔

"پتاجی آئے تھے اصل میں میں انہیں بتانا نہیں چاہتا تھا"، اس نے آخر کو بتا ہی دیا۔ نیرا کو کیا خبر کہ وہ سُندر کی سگائی پکی کر گئے۔

تو سُندر، باپ کو نیرا کے متعلق علم نہ دینا چاہتا تھا۔ اوہو۔ اس کی اس میں

ہتک تھی جیسے وہ اس کی بیوی نہ تھی۔ نیرا چپ رہی۔ آخر اس میں چھپانے کی کیا بات تھی۔ کیا لوگ بیاہ نہیں کرتے اور سُندر کیا ایسا شرمیلا تھا۔

"مجبوری ہے نیرا" آخر کب تک نہ کہتا کوئی۔ ایسا بودا تھا۔

"کیسی مجبوری۔ بابو جی؟ آپ تو کہتے تھے ....."

"ہاں کہتا تو تھا پر نیرا تم نہیں سمجھتیں، سیٹھ جمنالال کی بیٹی ہے۔ بابو جی کی رال ٹپک پڑی ہے۔

"اور تمہاری۔" پر نیرا نے کہا نہیں۔

"تم جانتی ہو اس سال روئی کے بیوپار میں گھاٹا بیٹھ گیا۔

"روئی کے بیوپار میں گھاٹا بیٹھ گیا ہے تو بیٹھ جائے۔ نیرا کی زندگی کا بیوپار کیوں بیٹھ جائے" کون پوچھتا ہے۔

بونہی کہتے ہو بابو جی ...."

"نہیں نیرا سچ بابو بڑا زور ڈال رہے ہیں۔ وہ کبھی ایسی سونے کی چڑیا ہاتھ سے نہ جانے دیں گے"

"اور تم!" نیرا نے پوچھ ہی لیا۔

"میں۔ میں ....." وہ چکرایا "میں کس گنتی میں ہوں۔"

"اور میرے ساتھ جو بیاہ ہوا تھا۔"

"نہیں ہوا" سُندر حادثتہً جھینپ گیا۔

نیرا کے کلیجہ پر جیسے کسی نے موگری مار دی۔

"اور وہ پھیرے ....."

"وہ سب دھوکا تھا۔ کون مانے گا۔"

"تم تو مانو گے۔ کہتے تھے کہ قول دینے ہی سے تو پرماتما کے آگے بیاہ ہو جاتا ہے۔"

"نہیں ہوتا۔ جب تک چار لوگ نہ ہوں۔ پھیروں سے کیا بیاہ ہوا جاتا ہے۔"

"تم نے کہا تھا کہ چار لوگ نہ ہوں تب بھی ...."

"وہ یونہی کہہ دیا ہوگا۔"

"اس یونہی کی بھی خوب رہی"

"تو میں تمہاری کوئی نہیں۔"

سندر کو بڑا دکھ ہو رہا تھا مگر وہ مجبور تھا۔ اس نے صرف سر ہلا دیا۔ نیرا نہ روئی نہ پیٹی اس نے خاموش ہو کر ایک طرف سر ڈال دیا۔

وہ اسے دیر تک چمکارتا رہا۔

"میں سال پر تمہیں روپیہ بھیج دیا کروں گا۔ تم بڑی سکھی رہو گی۔"

"سکھی، سکھی تو وہ کبھی رہی نہ رہے گی۔ ہاں یہ چند ماہ اس کی زندگی میں ہمیشہ ستاروں کی طرح جگمگاتے رہیں گے ایک بار سہی پر اس نے سکھ دکھ دیکھ تو لیا۔ اوروں کی رف دیکھو جنہیں یہ بھی نہیں ملتا۔

اسے لچھمی کا خیال آیا۔ دھتکاری کتیا کی طرح اپنے بچے کو لٹکائے کوتے کونے س منہ چھپاتی پھرتی ہے کہنے کو تو یہ گنوار بڑے غریب ہیں پر ایسی باتوں میں نہ جانے دھر سے شرم آنے لگتی ہے۔ کچھ نہیں تو "عزت عزت" ہی پکارنا شروع کر دیا۔ ہ گاؤں تو نہ جائے گی۔ پھر کہاں؟

روپا کی سرد ہوتی دکان چل نکلی اور نیرا اس کی ہوگئی۔ تندرست جسم اور چمکتے ہوئے گالوں سے اس نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ یہی ایک عورت کی دولت ہے چاہے وہ ڈی ہو چاہے رانی۔ جب تک بدن چست ہے اور گال چکنے ہیں سب کچھ ہے اور پھر ر تو کچھ بھی نہیں۔ نیرا کو یقین بھی نہ تھا کہ وہ سوائے گوبر تھاپنے اور گھاس چھیلنے کے اور مصرف کی بھی ہو سکتی ہے۔ اب یہاں تو اس کی یہ حالت تھی کہ کیا امیر اور کیا ب ہر ایک کے لئے اس کے آشرم کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ایک چھوڑ دس سندر

بیس سیتیل اور ان گنتی سیٹھ موجود تھے۔ جب شہر کے نوجوان اور تندرست لوگ اپنے اُجڑے ہوئے گھر، سڑی بُسی چمرخ بیویوں سے عاجز آجاتے تو سکونِ قلب کی تلاش میں اُسی کے در کی خاک چاٹتے۔

کبھی ایک آدھ تھکا مارا مرگھلا سا کلرک دو چار ٹوٹی ہوئی بیڑیاں جیب میں ڈالے اس کے دربارِ کرم سے بخشش چاہتا تو روپا بھیڑیے کی طرح اس پر غرا کر دوڑتی اور وہ جلی کٹی باتیں کہتی کہ وہ اپنا سا مُنہ لے کر چل دیتا تو نیرا کا جی بے چین ہو جاتا اگر وہ روپا سے نہ ڈرتی ہوتی تو ضرور اُس مُردہ دل دُکھی کو واپس لے آتی اور اُس کا تھکا ماندہ سر اپنے معطر سینہ سے لگا کر اُسے تسکین دیتی، وہ بھی تو کبھی دُکھی تھی۔

ایک سُندر نے اُسے بیوی نہ بنایا تو کیا ہوا۔ کیا مرغ نہیں ہوتا تو اذان نہیں ہوتی۔ اب وہ سارے جگ کی بیوی تھی ایک چھوڑ دس سُندر، بیس سیتل موجود تھے۔ پر جب کوئی نیا مہمان آتا تو وہ کسی سوچ میں پڑ جاتی۔ مقدس آگ کے گرد وہ بھانورے پڑتے دیکھتی اور اپنا سر ایک نئی دُلہن کی طرح جھکا لیتی اور وہی آگ ایک دم بھڑک اٹھتی اور پھر سُکھ ہی سُکھ اور پھر سُکھ کیا ہوتا ہے۔

سب ہی آتے تھے۔ پر اس کا سُندر، سب سے پہلا سُندر کبھی نہ آیا۔ نہ جانے وہ کہاں تھا۔ شاید کسی نئی نیرا کے سنگ۔ مگر نیرا کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ ماضی کے متعلق سوچ سکے حال اور مستقبل ہی اس کے لئے بہت تھے اور پھر اس کی نئی ساڑھی میں فیتہ بھی تو نہیں لگا تھا۔ نہ ہی درزی نے شلوکہ ابھی دیا تھا، سوموار کا وعدہ تھا۔ یہ "لپ اسٹک" تو بس مصیبت تھی۔ آج منگایئے اور کل آدھی لو۔ پرسوں ختم۔ روپا بٹنی بھی تو نہیں منگا دیتی۔ نہ جانے یہ جاپانی روغن معدے کے لئے مضر تو نہیں ہوتا۔

اُس کا دل نرم تھا۔

اُف یہ بچّے

میں نے سجے سجائے کمرے پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی اور ذرا پرے ہٹ کر ایک چوکی پر بیٹھ گئی جسے میں نے چادر منڈھ کر نہایت فیشن ایبل "دیوان" میں تبدیل کر دیا تھا۔ دو ایک کشن اِدھر اُدھر کئے اور پردوں کی چینٹ کو پھر سنوارا۔ آرام کرسیوں کو ذرا یورپی کھڑکی کی طرف سرکایا اور میز پوش کے کونے ذرا اور نیچے کھینچ دیئے۔ اب مس فلپ نہیں ان کے فرشتے بھی بے کہے سُنے آدھمکتے تو مجھے خوف نہ تھا۔ دوپٹہ اُتار کر کرسی کے ہتّے پہ ڈال دیا اور رسالوں کے انبار میں سے کرید کر ایک موٹا سا باتصویر رسالہ نکال لیا اور احتیاط سے پلنگ پہ لیٹ گئی۔ مادھوری کی دلکش آنکھیں . . . . . دیوکا رانی کا چھلّوں دار جوڑا۔ مسز سروجنی نائیڈو کا شاندار بازو ہر ہٹلر کی دلفریب مونچھیں۔ غنودگی کی وجہ سے ذرا دُھندلی دُھندلی نظر آنے لگیں۔ خاوند——میں نے جمائی کو روک کر ان پانچ تمام بچوں کے چوکھونٹے چہروں کو دیکھا جو ڈبیوں کی طرح ایک قطار میں آراستہ تھے۔

"پانچ!" میں نے چپٹی ناکوں کو چھنگلیا سے گنتے ہوتے سوچا "ایک دم" دوسرا خیال آیا۔ "شاباش ہے بچّی تیرے چھوڑے پر۔ تیرا ہی بوتا تھا۔ کوئی اور وال کی ہوتی تو سانس بھی نہ لیتی۔ پانچ پورے پانچ! معجزہ ہے۔"

قدرت سے بھول ہوگئی۔ کچھ ہاتھ بہک گیا۔ سنتے ہیں ایک بھینس کے کبوتر کے بچّے پیدا ہوتے! کیا خبر بہن سُنتے ہیں یہ آنکھوں کے نور، دل کے سرور کچھ اسی شان سے نزدل فرما رہے ہیں۔ بھئی۔ بچّوں کے دم سے ہی گھر کی رونق ہے۔ دروازے

میں بے تکی سی کھسر پھسر ہوئی اور مجھے چونکنا پڑا۔ جب سے چنو کی کتیا نے بچے دیئے تھے۔ ہمیں ذرا ہوشیار ہی رہنا پڑتا تھا۔ گھر کے ہر کونے میں موٹے موٹے پلے کوں کوں کرتے پھرتے تھے۔ ناک میں دم تھا۔ کبھی برتنوں کی ڈلیا میں سو رہے ہیں تو کبھی سل پر چھپکلیاں کھیلی جا رہی ہیں، تو کبھی میلے کپڑوں میں کشتی ہو رہی ہے تو کبھی کچھ! میں نے آہستہ سے دُلائی میں منہ چھپا لیا اور ہلکے ہلکے جھک کر جوتا اُٹھا لے گئی کہ بس آتے ہی دوں ایک کس کے۔ دروازہ کھلا۔ پردہ ہلا۔ میں نے جوتے کو ذرا زور سے دابا۔ ارے مِنّو! خیر ہو گئی ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔ جوتا چھوڑ کر میں واپس لیٹ گئی۔ مِنّو جسے میں نے صبح ہی بمشکل کمرے سے نکالا تھا پھر آ گئی۔ لیکن خیر کیا ہرج ہے۔ ہرج ہی کیا ہے۔ جاگ تو رہی ہوں۔ کچھ بگاڑے گی تو دیکھا جائے گا۔ وہ آگے بڑھ کر کرسی کی آڑ میں آ گئی۔ کمرے میں سکوت طاری تھا۔ نیند نے پھر آنا شروع کیا۔ ایک "بچے" کی موجودگی میں نیند آنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ بھلا کوئی کیسے سو سکتا ہے وہ بھی ہیں اللہ کی پیاری بندیاں جو کلیجے سے بچوں کو چمٹا کر غافل سو سکتی ہیں۔ نیند تو سولی پر بھی سنتے ہیں آ ہی جاتی ہے۔ خاموشی برابر طاری رہی۔ غنودگی بڑھ کر غفلت میں ڈوب گئی۔

عجیب طلسمی آہٹ سے میری آنکھ کھلی۔ "ارے!" یقین مانیئے میری گھگی بندھ گئی۔ ایک غیر فانی ہیولا جو کسی طرح بھی ایک بڑی لومڑی سے اونچا نہ ہوگا میرے سرہانے چاروں ہاتھ پاؤں کے بل ایک حیرت انگیز قلابازی کھانے کو تیار تھا۔ میرے تعجب سے اُچھلنے پر وہ شے ایک دم کچھ ایسے پلٹی کہ اس کی کیچڑ میں لتھڑی ہوئی ٹانگیں مع دو تر بتر جوتوں کے میرے منہ اور تکیہ پر پڑیں۔

"ای ہی ہی" وہ شے ہنسی۔

"لاحول ولا قوۃ مِنّو" میں بھی کس قدر ڈرپوک ہوں۔ میں نے سوچا۔

"اونہوں۔ اُترو نیچے" میں نے کیچڑ پانی اور صابن سے لتھڑی ہوئی بچی کو نیچے دھکیل کر اُتارا۔ ذرا حواس درست ہونے پر کچھ عجیب قسم کی پاؤڈر صابن منجن اور دیگر لوازمات

کی بو، کیچڑ کی سوندھی خوشبو میں مل کر کمرے کو معطر کرنے لگی۔

اور یہ واقعہ تھا کہ سنگار میز بانی بیتے، کا میدان بنی ہوئی تھی۔ کریم موزون! وہ حیرت انگیز کریم جسے اگر حبشی بھی استعمال کرے تو تین دن میں خاصا گورا ہو جائے، جو میں نے ڈھائی روپئے خرچ کر کے سپلائی کمپنی سے دو روز ہوئے منگوائی تھی جسے میں مارے کنجوسی کے صرف گالوں اور ناک پر چپڑ لیا کرتی تھی۔ نہایت دریا دلی سے آئینہ، میز اور خود بینو کی تھوتھنی پر لیپی ہوئی تھی۔ دانتوں کے چودہ آنے والے برش سے بوٹ پالش کی شیشی کی زیریں تہہ نکال کر کنگھے اور برش پر پوتی گئی تھی "کوٹی" کا بہترین رنگ والا پاوڈر میز کے اوپر چاروں طرف چھڑکا گیا تھا۔ کیوٹکس کی دونوں شیشیاں کھیتوں تک بینو پر روغن کرنے میں خالی کی جا چکی تھیں لیکن جس چیز نے میرا خون خشک کر دیا وہ میرا خوب صورت "ڈچر سٹ" تھا جسے میں نے لاہور کی نمائش میں ساڑھے پانچ روپے میں خریدا تھا اور آج ہی مس فلیپ کی عزت افزائی کے لئے بچھا دیا تھا۔ صابن اور ابٹنے میں تھڑا ہوا نہانے کی چوکی پر رکھا ہوا تھا۔

سمجھ میں نہ آیا کیا کروں۔ بینو میری نظریں بھانپ گئی اور چلی کتراتی ہوئی "ٹھہر تو موئی۔ چلی کہاں" میں نے ڈانٹا، بھینچ کر اُسے ہاتھ پکڑ کر گھما ڈالا۔ اور ایک میز پر بٹھا دیا جس کا میزپوش وہ پہلے ہی بالٹی میں بھگو آئی تھی۔

"آں ـــــ چھوڑ دیئے" وہ اِترا کر تتلائی۔

"ہوں!" میں نے میز پر سے یہ موٹا سا رول اٹھا کر اُسے دھمکایا۔ "بول اب۔"

"آں ـــــ ہم امّی سے کہہ دیں گے" وہ مچلنے لگی۔

"دیکھوں تو تیری امّی کو" میں نے اُسے گال پکڑ کر کھینچا۔

"ددامی ـــــ دیکھیئے۔ آں ہٹ" میں نے گھونسہ دیا۔

"ددامی۔ ی۔ ی۔ ی۔ دیکھو مار رہیں ہیں" وہ کچھ اور وصول لینے سے پہلے ہی بلبلائی۔

"بھئی کیا آفت ہے ـــــ کیوں کھائے لیتے ہو میری بچی کو" ددامی کہیں

سے چلائیں۔

اے ہے بس آگ ہی تو لگ گئی۔ اب کے جو وہ ڈکرائی تو ننگے پیر صرف پیٹی کوٹ پہنے وہ امی صاحبہ سوتے سے بھاگ آئیں۔

"سب ہی میری بچی کو مارتے ہیں، ہٹو بھی" وہ بھنبھنائیں۔

"ہوں اور یہ تمہاری منحوس بچی چاہے کسی کو قتل کر ڈالے کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔

"واہ میری بچی کیوں ہوتی۔ آخر بات بھی تو ہو کچھ۔"

"یہ ——— یہ کچھ بات ہی نہیں ——— بات ہی نہ ہوئی۔ ——— یہ دیکھو ——— یہ دیکھو۔" میں نے اشارے سے انہیں وہ دردناک منظر دکھایا۔

"اوئی" وہ مسرت کو دبا کر بولیں "اے ہے وقت کی نزاکت دیکھ کر وہ بے تحاشہ ہنسنے سے باز رہیں۔ جب کوئی کسی کا نقصان کر دے بڑے آپا پھسل کر گر پڑیں، کسی کے بھرے بس لپٹ جائیں یا اُن کا بچہ کچھ بگاڑ دے تو دوامی کو ہنسی کا دورہ پڑ جاتا ہے وہ اپنی ناک پہ آنچل رکھ کر لوٹ لوٹ جاتی ہیں۔ یہی ہوا کہ وہ کھلکھلائیں اور بیں ہنسنگی۔

میں آگے بڑھی۔

"اے ہے تو کیا اس ڈنڈے سے مارو گی" وہ سیاہ رول کو دیکھ کر کانپیں۔

"ہاں! اور جب یہ ٹوٹ جائے گا تو مسہری کا بانس لے لیں گے۔" میں نے اطلاع دی۔

"اے چلو بھی دیوانی ہوئی۔ لاؤ میری بچی کو۔ میں نہلاؤں سو وہ آگے بڑھ کر فرمانے لگیں۔

"اب ایک دم ہی آخری دفعہ نہلا لیجئے۔" میں نے رول ہلایا۔

"اس کے دشمن نہائیں آخری دفعہ۔ چلو چھوڑو" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچا۔

"جی نہیں آج اس پر ٹھیک طرح مار پڑے گی"

"بھلا مارنے سے کیا ہوگا۔" دوامی چہرے پر بھولپن لاکر بولیں۔

"ہمارا کلیجہ ٹھنڈا ہوگا"

"خاک پڑے تمہارے کلیجہ پر کہ بچی کو مارنے سے ٹھنڈا ہوگا" وہ بگڑیں۔

اور ہم دونوں مینو کو ہوا میں معلق کرکے اپنی اپنی طرف تاننے لگے۔ وہ بولی

"چلیں"

"اے چھوڑو میری لونڈیا کا ہاتھ اُتر جائے گا واہ" وہ غرائیں۔

"میری بلا سے ہاتھ ٹوٹ جائے۔ پھر تو یہ میرے کمرے میں نہ آئے گی۔" میں نے جھنجھوڑا۔

"اے بنو تم دام لے لینا کتنے کی تھیں تمہاری چیزیں؟"

"کتنے کی تھیں تمہاری چیزیں؟" میں نے جل کر منہ چڑایا کتنے کی بھی تھیں۔ ہم دام نہیں لیتے۔ ہم تو آج اسے جی بھر کے دھنیں گے۔ یہ آتی ہی کیوں ہے یہاں؟"

"اللہ اب چھوڑو گی بھی۔ چلو اب تمہارے کمرے میں تھوکے گی بھی نہیں اور بھی کہہ تو دیا دام لے لو اور کیا کروں" دلہن بھابھی لاچاری پر اُتر آئیں۔

"دام لے لو۔ تم یہ بکے جا رہی ہو۔ یہ نہیں دیکھتیں اس نے کیسا ستیاناس کیا ہے میرے کمرے کا" میں نے نرم ہو کر کہا۔

"اچھا بھئی اب نہیں کرے گی۔ اب کے آجائے تو جی چاہے جتنا مار لینا۔ بس!

"اچھا اب کے تو ملزمہ تمہاری ضمانت پر چھوڑی جاتی ہے اگر اس کا چال چلن..."

"ذرا ہوش میں۔ واہ بڑی آئیں میری بچی کے چال چلن کو کہنے والی۔ اوئی نوچا میری بچی کا گلا" انہوں نے اس کا گال میری گرفت سے گھسیٹ کر چھڑا لیا۔

"اب کبھی نہیں آئے گی وہ" انہوں نے جلتے ہوئے کہا۔

"ہم کبھی نہیں آئیں گے۔" بنّو بیتر ہو گئی۔

"ٹھہر تو جا" میں نے رول لے کر دھمکایا اور بھاگیں دونوں بے حیائی سے ہنستی ہوئی۔

اُف یہ بچے! بھلا کوئی کاہے کو سُگھڑاپا دکھائے اور کیسے؟ جس اُجڑے گھر میں کچھ نہیں تو ڈیڑھ درجن بچے موجود ہوں کیسے کچھ کرے، لوگ کہنے کو تو ہو جائیں گے کہ اوئی ذرا پڑھی لکھی لڑکیوں کی حالت تو دیکھو۔

کہو بھلا نصیبوں جلی پڑھی لکھی لڑکی کیا کرے۔ بچے سے بچے ہیں گھر میں۔ خدا جھوٹ نہ بلائے، ڈیڑھ درجن سے کیا کم ہوں گے۔ ہر قوم اور قبیلے کی شکل کے کالے پیلے، کتھی، دُبلے، پتلے، بھینگے اور چپٹے۔ ہر سال دو کا اضافہ۔ ایک سے ایک نت نئے فرموں میں ڈھل ڈھل کر آ رہا ہے۔ ابھی تو خیر سے دو بھائی کنوارے ہیں ورنہ والدِ بزرگوار کا نام وہ چلتا کہ کیا کہنے ——— ایک دم میری نظر ان پانچ قوامِ انسانی کیڑوں پر پڑی۔ اگر ایسی ہی ——— کچھ ایسی ملتی جلتی بھول قدرت سے یہاں ہو جائے، خود میرے خاندان میں۔ مجھے پیٹھ پر کھنکھجورے سے رینگتے معلوم ہوئے۔ ویسے ہی میں نے قلم تکیہ کے نیچے سے نکالا کہ لاؤ ان کے یونہی سیاہی سے ڈاڑھیاں لگا دوں ——— یوں ہی جل کر میں نے چاہا ارے! جیسے کسی نے دھم سے میرے کلیجہ پر موسل دے مارا۔ میرا قلم؟ سبز اور کاہی ابورشارپ اَن بریک ایبل۔ اس کا نب پیچھے کی جانب ایسے جُھکا ہوا تھا جیسے قلا لگانے سے پہلے نٹ اپنے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر ایڑیوں سے سر لگا دیتا ہے۔ جی چاہا۔ بس کیا کروں؟ گزشتہ زمانہ کی ایک ہی یادگار بھرے ہوئے خوابوں کی مٹتی ہوئی تعبیر۔ کسی کا اکلوتا تحفہ۔ پلنگ کی پٹی پر بے دردی سے ٹھونکا گیا تھا۔

"یا اللہ! کوئی راستہ نجات کا ہے؟" میں اندھوں کی طرح اس مظلوم کو ٹٹولتی رہی۔ پھر کیا ہے چر رہا ہے جو چیز دیکھو تباہ ہوئی جاتی ہے۔ جدھر دیکھو دو چار برتن لوٹ رہے ہیں۔ چار پلنگوں پر اُچھل رہے ہیں ——— دو کواڑوں میں جھول رہے ہیں ———

تین پنکھے میں لٹک رہے ہیں ـــ دو نے نل کھول کر نہانا شروع کر دیا۔ دو چار بانس کے گھوڑے بنائے بیٹروں کی طرح سارے صحن میں کھڑکھڑاتے پھر رہے ہیں۔ وہ گھڑا اُلٹا۔ یہ سینی پلٹی۔ وہ دوپٹہ الجھ کے چلا کیچڑ میں لتھڑتا ہوا۔ وہ تین بالکل آپ کی بیٹھ کے پیچھے گتھم گتھا ہو رہے ہیں اور موسل جیسی ٹانگیں گدا گد کمر اور سر پر پڑ رہی ہیں۔ یا اللہ! مجھے جیسے چکر سا آنے لگا۔ ایک دو ہوں تو بھگتے۔ کوئی اس خوگیر کی بھرتی کو کہاں تک نباہے۔ جو مارو تو فرمایا جاتا ہے "ارے ہے کیسی بے دردی سے مارتی ہے۔ ہائے اپنا خون! اپنا خون! خوب! دس بچوں کی ماں کی اولاد ہونے کی یہی سزا ہے گھر کیا ہے۔ محلّہ کا محلّہ ہے۔ مرض پھیلے وبا آئے۔ دنیا کے بچے پٹاپٹ مریں مگر کیا مجال جو یہاں ایک بھی لس سے مس ہو جائے۔ ہر سال ماشاءاللہ گھر ہسپتال بن جاتا ہے۔ پتیلیوں میں صابو دانہ پک رہا ہے بیسروں کو نین آ رہی ہے۔ پھوڑے پھنسی کے زمانے میں مرہم کا خرچ دال روٹی سے زیادہ۔ جس کونے میں دیکھو پڑے پھائے اور مرہم کی ڈبیاں چپچپا رہی ہیں، ٹانگیں سڑ رہی ہیں۔ بخار چڑھ رہے ہیں لینے کے دینے پڑے ہوتے ہیں اور یہ لیجئے بیماری گئی اور وہ چڑیوں کی طرح پھریری لے کر کھڑے ہو گئے۔ پھر ایسا پلیچ پلیچ کر کھایا کہ چار دن میں پھر ہمارے سینے پر کودوں دلنے کے لئے وہی کسی ہوئی توندیں اور مگدر جیسی ٹانگیں۔ سنتے ہیں دنیا میں بچے بھی مرا کرتے ہیں۔ مرتے ہوں گے۔ کیا خبر!

بس اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ دُنیا سے مُنہ موڑ کر الگ تھلگ پڑ رہوں۔ اور ہاں نہیں تو۔ آج ہی سے لو۔ ملّو تو خیر وعدہ ہی کر گئی ہے کہ اب کبھی نہ آئے گی۔ رہے مکھن تو انہیں بھی آج ہی دھتکار دیا جائے گا۔ بس ہو چکی دل لگی تجو بھی لڑکا دیئے جائیں گے اور چڑوا چڑ و مرڈی کو تو بس ڈھیل ہی نہیں دوں گی۔ نہ مُنہ لگاؤں گی۔ نہ یہ سر چڑھ کر ناچیں گے۔ آخر کوئی صبر کی بھی حد ہوتی ہے۔

"وہ دیکھو ـــ دیکھو ـــ اب میں کہتی ہوں چنی سے" پاس کے کمرہ سے آواز آئی۔

"دیکھا کہتی ہو چنی سے" میں نے پھر خیالات کے سلسلہ کو جوڑا۔ جب سروکار بھی

ہوا اُسے۔

"ہائیں چنی یہ کرتہ نہیں پہنتی۔ اسے آکے مار تو۔" پھر کسی نے کہا۔

"وہ آئی ـــــ دیکھ آگئی چنی ـــــ لے اسے مار۔ کرتہ پہنو پھر۔" وہی آواز بڑھی آگے۔

"بھاڑ میں جائے کرتہ اور چولہے میں جائے چنی۔ ہاں نہیں تو چنی نہ ہوگئی ان کی زر خرید لونڈی ہوگئی۔ کہ اس سے "بی شادی" اور "ہتوسے" کی خدمات بھی لی جانے لگیں۔ خدا کی شان۔" میں بڑبڑاتی رہی۔

"لو بس اب جاؤ۔ دکھا آؤ پھوپھی جان کو۔" پھر بولیں۔

پڑی تھی مجھے غرض۔ میں نے عہد بھی ٹھیک وقت پہ کیا۔۔۔ مگر ہمت تو دیکھو ابھی ابھی ماں بیٹیاں کان پکڑ کر نہ آنے کا وعدہ کر گئی ہیں اور دس منٹ بھی نہ گزرے اس بے تکلفی سے آنے کو تیار۔ خیر۔

میں بے رُخی سے پیٹھ موڑ کر آرام کرسی پر لیٹ گئی اور ان پانچ توام بچوں کے بے رونق مکار چہرے دیکھنے لگی۔

"پڑ پڑ" چھوٹے چھوٹے پیر کمرے کی طرف آتے سُنائی دیئے۔ پانچوں موٹے بنئے جیسے چہروں نے شرارت سے آنکھ ماری! اونہہ!

"دیکھیے پھوپھی جان۔" بنو نے اپنی چمکیلی آنکھوں کے وہ تمام برسا کر کہا جن کا جادو وہ خوب جانتی ہے۔

دوسرے لمحے وہ مع جوتوں کے میری گردن پر سوار تھی۔

"ہماری فراک!" اُس نے میری گردن میں گھٹنہ اڑا کر ناک پر رال ٹپکاتے ہوئے کہا "دیکھیے۔"

"اُف یہ بچے!!!"

میں نے چاکلیٹ کا تازہ بنڈل کھولتے ہوئے کہا۔

بڑی شرم کی بات

رات کے سناٹے میں فلیٹ کی گھنٹی زخمی بلاؤ کی طرح غرّا رہی تھی۔ لڑکیاں آخری شو دیکھ کر کبھی کی اپنے کمروں میں بند سو رہی تھیں۔ آیا چھٹی پر گئی ہوئی تھی اور گھنٹی پر کسی کی اُنگلی بے رحمی سے جمی ہوئی تھی۔ میں نے نشتم پشتم جاکر دروازہ کھولا۔

ڈھونڈی چھوکرے کا ہاتھ تھامے دوسرے ہاتھ سے چھوکری کو کلیجے سے لگائے جُھکی جُھکی گھُسی اور بھاگ کر نوکروں والے غسل خانے میں لُپت ہوگئی۔ دور سڑک پر غولِ بیابانی کا شور راے روڈ کی طرف لپکا چلا آرہا تھا۔ میں نے بالکنی سے دیکھا عورتیں بچے نشہ میں دُھت لو کر بے تحاشہ مختلف بولیوں میں نہ جانے کسے للکارتے چلے آرہے تھے۔

چوکیدار شاید اونگھ گیا تھا تبھی ڈھونڈی اُس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر گھس پڑی۔ وہ اُس کے پیچھے لپکنے کے بجائے پھاٹک میں تالے جڑنے دوڑا اور جب مجمع کمپاؤنڈ کی دیوار پر چڑھ کر پھاندنے لگا تو اُس نے لپک کر لوہے کا اندرونی دروازہ بند کرلیا اور سلاخوں میں سے حملہ آوروں کو ڈنڈے سے دھمکانے لگا۔

ادھر سے محفوظ پاکر میں نے جلدی جلدی بجلیاں جلائیں۔ غسل خانہ سے ملا ہوا جو کوڑے کباڑ کا چھوٹا سا حصّہ ہے اس میں ڈھونڈی میلے کپڑوں کی ٹوکری سے چپکی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اُس کی ٹھوڑی لہولہان تھی اور خون گردن سے بہہ کر شلوکہ اور دھوتی کو تر کر رہا تھا۔ میں نے اُس سے بہت پوچھا کہ کیا معاملہ ہے مگر اُس کی آنکھیں پھٹی تھیں اور جُھرجُھری سوار تھی۔ بچی چھٹی ہوئی چوٹی سے فائدہ اُٹھا رہی تھی اور بڑی تندہی سے اپنی ازلی بھوک مٹانے میں

مشغول تھی۔ چھوکرا حسب عادت ناک سُڑک رہا تھا اور پیشاب سے تر ٹانگیں کھجا رہا تھا۔

ڈھونڈی کو میں اس وقت سے جانتی ہوں جب اُس کا پتی راؤ جو تھے مالے کے سیٹھ کی ڈرائیوری کرتا تھا۔ نام سے تو لگتا ہے ڈھونڈی کوئی لحیم شحیم مرد مار قسم کی گھاٹن ہوگی مگر ڈھونڈی کا قد شکل سے چار فٹ ہوگا۔ جی بھر کے بدصورت، چیاں سی آنکھیں، آگے کو کھسکا ہوا نچلا جبڑا اور دھنسا ہوا ماتھا۔ چند ماہ پہلے ہی ایک عدد لونڈیا جنی تھی تو راؤ نے دارو پی کر اُس کی ہڈی پسلی نرم کردی تھی۔ ڈیڑھ ماہ کی سوکھی ماری بچی نہ جانے رات کو کب مر گئی۔ اور ڈھونڈی ڈاڑھیں مار مار کر روئی۔

بائی لوگ کا کہنا تھا کہ ڈھونڈی نے ٹوپا دے کے بچی کی چھٹی کر دی یعنی رات کو چپکے سے گلا دبا دیا۔ مگر ایسی بات ہوتی تو پھر اتنا ماتم کرنے کی کیا ضرورت تھی

ڈھونڈی کا مرد ایک دم موالی تھا بہت دارو پیتا تھا۔ مگر ڈھونڈی کہتی تھی رات کی ڈیوٹی کرتا ہے۔ سیٹھ ساری ساری رات چھوکریوں کے سنگ ٹھٹھا کرتا ہے وہ موٹر میں بیٹھے اوب جاتا ہے تو تو آ مار لیتا ہے۔ بمبئی کی شاید ہی کوئی بلڈنگ ہو جس کے احاطے کے کسی کونے میں اندھیری گیرج میں یا نوکروں کی کوٹھری میں حتیٰ کہ گندے سنڈاسوں میں دارو نہیں کشید کی جاتی۔ اور پھر ادھر ورلی کے سنسان علاقے میں ڈانڈا کی طرف جانے والی سڑک پہ جھونپڑ پٹی میں تو باقاعدہ ٹھرے کی بار بھی ہوئی ہیں۔ کھن میں تلی ہوئی کیا فرسٹ کلاس مچھی کھانا ہو تو ڈانڈا سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ وہاں مختصر ترین چولی اور لنگوٹی پہنے مچھیرنوں کا اکھے بمبئی میں جواب نہیں۔ ادھر جو نئے فلیٹ بن رہے ہیں اُن میں سیٹھ لوگ اپنی رکھیل رکھتے ہیں۔ سیٹھانیوں کی جاسوسی کارروائیوں سے محفوظ یہ سیٹھ لوگ جو فلم کا دھندا کرتے ہیں، یعنی ڈسٹری بیوٹر اور پروڈیوسر کے بیچ کے گنڈے جو فلم کے علاوہ چھوکری سے لے کر ہٹ فلموں تک کا لین دین پٹاتے ہیں۔

سیٹھ لوگ جب اوپر چلے جاتے ہیں تو نیچے اُترنے کا وقت مقرر نہیں ہوتا۔ نیچے ڈرائیور جوا اور شراب کا دور چلاتے ہیں۔ وہیں سے راؤ کو شراب کی عادت نے پکڑ لیا۔ پھر یہ عادت اتنی بڑھی کہ ڈھونڈی کی سوت بن بیٹھی۔

بچی کے مرنے کے چند مہینے بعد ڈھونڈی کا پیر پھر سے بھاری ہو گیا۔ اب کے راؤ نے الٹی میٹم دے دیا کہ اگر پھر چھوکری ڈالی تو وہ اس کا ٹیٹوا کاٹ کے دوسری بیاہ کے گا

ــ لیکن چھوکری پیدا ہونے سے پہلے ہی ایک دن راؤ نے بچوں کو اسکول سے لاتے سمے گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھادی۔ بچوں کے چوٹ تو نہیں لگی مگر ہائے توبہ اتنی مچائی کہ سیٹھ نے اُسے کھڑے کھڑے نکال دیا۔

راؤ اور ڈھونڈی کو گیرج خالی کر کے جانا پڑا جس پر اُسی دن نئے ڈرائیور نے قبضہ کر لیا۔

ایک دن کیا دیکھتی ہوں ڈھونڈی ایک چھپکلی کی شکل کی چھوکری چھاتی سے چپکائے فٹ پاتھ پر بیٹھنے والی ترکاری والی کے پاس جمی ہوئی ہیں۔ اُجاڑ صورت، گھسٹی ہوئی۔

"ارے ڈھونڈی کیسی ہے ری"۔ میں نے رسماً پوچھ لیا۔

"ٹھیک ہے بائی"۔ وہ اُٹھ کر میرے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔

"راؤ کیسا ہے؟"

"او تو گیا بی"

"کدھر گیا؟"

"سمندر پار دبئی کو"۔

"تو کم بخت بچی کی وجہ سے تجھے چھوڑ گیا"۔

"نئی بائی چھوکری تو بعد میں آئی۔ وہ تو پیسہ کمانے کو گیا"۔

"اُہو تب تو ٹھاٹھ ہونگے تیرے۔ بہت روپے بھیجتا ہوگا تجھے"۔

"نئیں بائی۔ اُسے اپنی آئی کو بھیجتا"۔

"اس کی ماں یعنی تیری ساس کو؟" مراٹھی میں ائی ماں کو کہتے ہیں۔

"نئیں، وہ بچی جو اُسے اُدھر بھجوایا"۔ تو ڈھونڈی صاحبہ طنز فرما رہی تھیں۔

"اُدھر ڈانڈا ہیں دونوں کا لفڑا چلتا تھا۔ جانے سے پہلے راؤ نے بیاہ کیا اُس سے اور ......"

"مگر دوسری شادی تجھے طلاق دیے بنا کیسے کر سکتا ہے۔ ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی سور کو"۔

"کون ڈالتا ہتھکڑی بائی"۔

"ارے دس بارہ سال ہوئے قانون پاس ہوا کہ ایک سے زیادہ بیوی کی اجازت

نہیں۔ طلاق بغیر دوسری شادی جرم ہے۔"

"کائے کو؟ اکھا گجراتی مراٹھی سندھی اور بھیا لوگ کتنا شادی بناتا۔"

"سب پر کیس چل سکتا ہے۔"

ڈھونڈی قطعی ماننے کو تیار نہ تھی اور نہ میرے پاس وقت نہ وسیلہ کہ اُسے قانون سمجھاتی پھروں۔ خود میرے جان پہچان کے معزز لوگوں کے پاس ایک بیوی کے علاوہ اور کئی عورتیں ہیں۔ سُنا ہے پنڈت سے پھیرے ڈلوالو، کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ جی کو تسلی بھی ہوجاتی ہے کہ معاملہ حلال ہوگیا۔

"بائی میرے کو کام دیو۔" ڈھونڈی پیچھے پڑگئی۔ میری پرانی جھاڑو کٹکا کرنے والی بائی ڈھونڈی کو میرے ساتھ دیکھتے ہی دولتیاں جھاڑنے لگی۔ اور دونوں میں نہایت فراٹے کی مراٹھی میں جنگ شروع ہوگئی۔ میں اتنے سال سے بمبئی میں رہتی ہوں، کوئی رسان رسان بولے تو مراٹھی گجراتی سندھی بنگالی خاصی پلّے پڑجاتی ہے مگر جب انھیں باتوں میں تو تو میں میں شروع ہوجاتی ہے تو میرے خاک سمجھ میں نہیں آتی۔ انتہائی روح فرسا پتھریلی چیخوں میں تو ہر لفظ گالی بن کر کان کے پردے پھاڑنے لگتا ہے۔ جیسے بنا ٹائر کی گاڑی کھڑنجے پر دوڑ رہی ہو۔

میں نے دونوں کو ڈانٹ کر الگ کیا۔ بالشت بھر کی ڈھونڈی چھوکری کو سیڑھی پر ٹکا کر لانگ کس رہی تھی۔ اور ڈھائی من کی دھوبن کُسما بائی چاولوں کی بوری دیوار سے ٹکا کر خم ٹھوکا چاہتی تھی۔ بڑی مشکل سے دونوں کو ٹھنڈا کیا اور ڈھونڈی کو سمجھایا کہ کُسما بائی کی شان میں کچھ بھی کہا تو اچھا نہ ہوگا۔ وہ تین برس سے میرے ہاں لگی ہے۔

برسات شروع ہوتے ہی بمبئی میں بائی لوگ کا بھاؤ گرنے لگتا ہے۔ سہانے جاڑوں اور گرمی میں آنکھیں لگانے کو بائی نہیں ملتی۔ تب نہ بنا لائیسنس کی جھاڑی لگائی جاسکتی ہے نہ کیچڑ پانی میں لتھڑے ہوئے باغ بغیچے سنسان کونے کھترے، سمندر کے کنارے اونچے نیچے چٹان کسی بھی سہانے دھندے کے لیے کام نہیں آسکتے۔ فلیٹوں کی اگاسیوں میں مستقل والے نوکر جمے ہوتے ہیں۔ ہاں ان دنوں باورچی لوگ کے عیش ہوتے ہیں۔ اور جب مالک مکان سو جاتے ہیں تو باورچی کچن میں راجہ اندر بنے مزے اُڑاتے ہیں۔ بچا کھچا کھانا بڑی دریا دلی سے اپنی پریمکاؤں کو نگلا دیتے ہیں۔ کبھی چار پانچ لفنگے جمع ہو کر

جو شراب سے شوق فرماتے ہیں۔ اور اگر گرمی میں ایرکنڈیشن کمروں میں صاحب لوگ بند ہوں تو ڈرائنگ روم میں بھی بستر لگ جاتے ہیں، جو صبح دودھ لانے کے وقت خالی کر کے صفائی ہو جاتی ہے۔

شکر ہے برسات کے بہاؤ میں چھپکلی کی صورت کی چھوکری بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ سڑی گلی ڈسٹ بن میں پھینکی ہوئی ترکاریوں کے چھلکوں کی بھاجی کھانے والی ماں کا دودھ پی کر موٹا تازہ بچہ بھی دم توڑ دیتا وہ تو پھر بھی ناچیز چھپکلی تھی۔

بچی کی موت نے جیسے ڈھونڈی کے دن پھیر دیے کہ بائی لوگ کے مختلف دھندے جاگ اُٹھے اور نوکروں کا توڑا پڑ گیا۔ ڈھونڈی نے بلڈنگ کے چھبیس فلیٹوں میں سے آٹھ دس مار لیے اور صبح سے شام تک کپڑا برتن جھاڑو کٹکا کر کے خوب کمانے لگی۔

راؤ نے روپیہ بھیج کر اپنی محبوبہ کو پردیس بلا لیا اور ڈھونڈی نے لال ہری دھوتیاں خرید کر ترکاری والی بائی کے پاس بیٹھنا شروع کر دیا جہاں بوجھ بجھکڑ یعنی شنکر کی بوڑھی ماں ناتجربہ کار بائی لوگ کو زندہ رہنے کے تیر بہدف نسخے بانٹتی۔ ڈھونڈی بڑے دھیان سے اس کے بھاشن سنتی اور سر دھنتی۔

کام نمٹا کر یہ بائی لوگ شام کو نہا دھو کر سولہ سنگار کرتی ہیں۔ نکڑ سے پان کے بیڑے خرید کر کلا گرم کرتی ہیں اور تازی ہوا کھانے میرین ڈرائیو پر سمندر کے کنارے منڈیر پر بیٹھ کر تبادلہ خیالات کرتی ہیں کھل کر ہنستی بولتی ہیں۔ راہ گیروں سے آنکھیں بھی لڑاتی ہیں۔ وہیں پہلی بار چھ فٹ اونچے رگھو ناتھ گھاٹے سے ڈھونڈی کی آنکھ بھی لڑ گئی۔ راؤ کے بعد اُسے مرد کی آنکھ میں آنکھ ڈالنے کی مہلت ہی نہ ملی تھی۔ تین چار بار رگھو اس کے سامنے سے بڑے بانکپن سے ترچھی نظر ڈالتا گذرا۔ ایک بار ٹھہر کر بیڑی بھی سلگاتا رہا۔ پھر کچھ دور منڈیر پر بیٹھ گیا۔ دو چار دن میں دوری کم ہوتی گئی اور قربت بڑھتی گئی۔ کبھی پکوڑیاں سینگ چنا بھی پیش کیا۔ پہلے تو ڈھونڈی سر ہلاتی رہی تھی۔ شنکر کی ماں کی آنکھ کا اشارہ پا کر کانپتے ہاتھوں سے دو چنے بھی اُٹھا لیے جو اس کی مٹھی میں پسیجتے رہے۔ منہ میں ڈالنے کی ہمت نہ ہوئی ـــــ قصہ مختصر ایک دن گھنٹی بجی، کھولنے پر چھ فٹ اونچے رگھو کے ساتھ چار فٹ کی ڈھونڈی شرمائی لجائی کھڑی تھیں۔

"بائی ہم سادی بنایا۔ گنگا بائی کو بولایا، کل سے وہ کام پہ آئے گی۔" انھوں نے

بکھ سرپٹ مراٹھی میں دو لھیاں کو کچھ ہدایات دیں اور خود اندر آگئیں۔

"ہمارا حساب کر دیو بائی۔ تیس روپیہ مہینہ کے حساب سے ۲۵ دن کے پچیس ہوتے تھے میں نے دس دس کے تین نوٹ پکڑا دیے۔ ڈھونڈی کے مکھ سے پھول جھڑ رہے تھے۔ چھوٹے تلے کی لال لانگ والی فوگزی دھوتی اور اودی چولی میں ڈھونڈی کا سیاہ رنگ پھوٹا نکل رہا تھا۔ بالشت بھر کی ٹھابد صورت عورت میں بلا کی سیکس اپیل تھی۔ پتلی کمر بھاری کولھے۔ پیروں میں نئے چاندی کے توڑے ماتھے پر اٹھنی برابر سندور کا ٹیکہ سو سو بہاریں دکھا رہا تھا۔ بار بار منگل سوتر کو چھو رہی تھی جیسے اطمینان کرنا چاہتی ہو کہ معاملہ قطعی معقول ہے۔

یاد نہیں کتنے سال گذرے کہ ایک دن چلی آرہی ہیں بی ڈھونڈی۔ پونے دو برس کے چھوکرے کا ہاتھ تھامے پورے دن کا پیٹ سنبھالے، منہ پر ٹھیکرے ٹوٹ رہے تھے منگل سوتر غائب پیروں کے توڑے اڑن چھو۔

"بائی کوئی کام دیو"

گنگا بائی نے اپنے وجود کا اعلان ایک عدد چھینک سے دیا اور چائے کی ٹرے تنبیہاً میز پر ایک جھٹکے سے پٹخ دی تاکہ میں اُن کے ری ایکشن کو نوٹ کر لوں۔

کیا ہوا ڈھونڈی؟ رگھوناتھ کا کیا حال ہے؟"

جواب میں انھوں نے سرپٹ مراٹھی میں جواب کھڑکھڑا یا۔ ساونڈ ایفکٹ سے میں نے فوراً ان کا مطلب سمجھ لیا۔ معاملہ گمبھیر ہے۔

جب بیاہ کر سسرال پہنچیں تو پتہ چلا کہ رگھو کی بیوی میکے پٹخوا دی گئی تھی کیوں کہ اس کی ساس سے ایک منٹ نہیں بنتی تھی۔ چار چوٹ کی مار دیتی تھی۔ اب ڈھونڈی کو بھی مارتی تھی ہلکٹ۔ اتنے برس بمبئی میں رہی اور ہلکٹ کے معنی بھی میرے پلّے نہیں پڑے۔ ہاں اتنا پتہ چلا کہ ہلکٹ کے معنی بہت ہی خراب۔ بدمعاش مرکھنی چال باز عورت۔

"اُس نے تجھے مارا اور پٹ لی۔ تو بھی مارتی بڑھیا کو"

"کائے کی بڑھیا، بس ڈھونڈی سے سال دو سال چھوٹی ہی ہو گی۔ لمبی تڑنگی مردانی عورت پھونک مارے تو ڈھونڈی جیسی چوہیا وہ جائے۔ بڈھے کو روز نوٹاک منگتا بچ۔ یعنی اگر ٹھرّے کا پوا نہ ملے تو طوفان برپا کر دیتا ہے۔ اس کی عورت تو رگھو دس بارہ سال

کا تھا تب ہی خلاص ہو گئی تھی۔ اس کے بعد رگھو کا باپ اِدھر اُدھر منھ مارتا رہا۔ راج مزدور کا کام کرتا تھا۔ بمبئی میں بڑے زوروں سے بلڈنگیں کھڑی ہو رہی تھیں، خاک دھول پھیپھڑوں میں جمتی گئی، سیلن کی وجہ سے گٹھیا بھی ہو گئی اور دمہ تو ہے ہی دَم کے ساتھ۔ اس وقت تک رگھو کا بیاہ ہو چکا تھا مگر کوئی مستقل روزگار آج تک نہیں جڑا۔ بڈھا گاؤں گیا تو کسی بہت سی چھوکریوں کے باپ نے ایک عدد اس کے سر منڈھ دی۔

بڈھا تو کسی کرم کا نہیں تھا۔ رگھو اور سوتیلی ماں بھوری بائی کا ٹانکہ جڑ گیا جس پر اُس کی بہنی نے بڑے فیل مچائے۔ رگھو نے ہلکٹ کی مدد سے اُسے مار کوٹ کر میکے پہنچ دیا کیوں کہ اس چڑیل نے بھی چھوکری تھوپ دی تھی۔

بڈھے کو جوان بیوی اور بیٹے کے تعلقات پر قطعی کوئی اعتراض نہ ہوتا اگر اس کی نوٹانک پابندی سے ملتی رہتی۔ مگر اتنا ٹھرا خریدنے کے لیے جو تینوں کو پورا پڑ جائے۔ بھوری تو ان دونوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتی اور پانی کی طرح دارو ڈکار جاتی تھی۔ دارو کا توڑا پڑتا تو جوتم پیزار شروع ہو جاتی۔ رگھو جب بھوری کی ٹھکائی کرتا تو بڈھے کے دل میں کلیاں چٹخنے لگتیں۔ رقابت کا جذبہ تو کبھی کا مر چکا تھا کہ یہ نازک احساس دھن کی چھاؤں میں ہی پھلتا پھولتا ہے۔ بوڑھے کی رگ رگ پھوڑا بن چکی تھی تب ہی رقابت کی رگ بھی سڑ گل کے رس گئی ہوگی۔ اُسے تو بس لگن تھی اور وہ دارو کی کہ سب سے بڑا مرہم مدہوشی ہے۔

پتہ نہیں بڈھے کے خاندان کے فرد اقلیت کی فہرست میں آتے ہیں کہ نہیں۔ آدھا بمبئی تو اسی قبیلے کا نظر آتا ہے جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ پچھلی دفعہ بڑا اُدھم مچا تھا۔ بڈھے نے بہو اور رگھو کے ساتھ جا کر ووٹ بھی ڈالا تھا۔ تمام دیواریں گائے بیل گھوڑے کی تصویروں سے بھر گئی تھیں۔ بڑی مشکل سے دو برساتوں میں دھلیں۔ اُسے قطعی پتہ نہیں تھا کہ وہ ان کو ووٹ کیوں دے رہا ہے۔ اُسے لاری میں لے جایا گیا اور اُسے جو بتایا گیا تھا اسی تصویر پر نشان لگا دیا تھا۔ نیلی سیاہی کا نشان اُس نے حسبِ ہدایت فوراً انگوچھے سے رگڑ ڈالا تھا۔ اُسے گنتی نہیں آتی اور نہ یادداشت کام کرتی ہے پر اُس دن اُس نے کتنے ہی پرچے ڈبوں میں ڈالے اور اُس دن سب کو ملا کر پورے اڑتالیس روپے ہاتھ لگے تھے تب کی دن جی بھر کے ٹھرا اور بڑا گوشت اُڑایا تھا ــــ پتہ نہیں کون گدی پر بیٹھا کون اُترا، پرچیوں پر بنی تصویریں خاموش ہیں نہ دیواروں پر لگے اونٹ گھوڑے کی زبان جانتا ہے جو اپنے مشکلات کا کسی سے

حل پوچھے ـــــ اور تب بھوری بائی کے دماغ آسمان پر چڑھنے لگے تھے۔ گھر کا چرخہ چلانے کے لیے وہ جھونپڑی والی بائی کی مدد سے دھندہ کرنے لگی تھی۔ وہیں اُس کی ایک فلم والے سے بھینٹ ہو گئی۔ اور وہ اُسے بھیڑ کے سین میں ایکسٹرا بنا کے لے گیا۔ اُسی دن سے بھوری بائی اپنے کو فلم اسٹار سمجھنے لگی ہے اور دھرتی پر پیر نہیں ٹکتے۔

ادھر ڈھونڈی کی کمائی کی خبر دور دور تک پھیل رہی تھی۔ آٹھ دس گھروں کا کام سمیٹتی ہے۔ فی گھر تیس پینتیس مار لیتی ہے۔ پیر میں پازیب بھی جھنکتی ہے اور سود پر روپیہ بھی چلانے لگی ہے۔ تبھی رگھو ایک جان چھوڑ ہزار جان سے اُس پر عاشق ہوا۔ مگر ڈھونڈی کے نصیب ہی کھوٹے ہیں بلکٹ نے فیل مچائے کہ فلم والے نے اُسے ہیروئن بنانے کا پکا وعدہ کیا ہے۔ رگھو کی بیوی جو میکے چلی گئی تھی اُس کا بھائی نہیں بھیجتا کہ وہاں نئی کالونی میں بہت کام ہے۔ جو مزدور دور کے گاؤں سے آکر جٹے ہیں وہ گھروالی تھوڑے سنگ لے کے آئے ہیں۔ اُن کی بھی تو ضروریات ہیں۔ رگھو گیا بہت ہاتھ پیر جوڑے مگر بھائی ٹس سے مس نہ ہوا۔ اُس کی چھوکری مر گئی، اچھا ہوا اب اُس کی گود میں چھ مہینے کا لونڈا ہے۔ رگھو کو تاؤ آتا ہے اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اُس کا سالا بہن کی کمائی کھا کھا کر سانڈ ہو رہا ہے۔

کیا ونڈ میں اب بھی جھگڑا چل رہا ہے۔

بڑی مشکل سے سمجھ میں آتا ہے کہ ڈھونڈی پر کسی نے قاتلانہ حملہ نہیں کیا بلکہ ڈھونڈی نے اپنی پتی کی ناک چبا ڈالی۔ تھو کی بھی نہیں شاید نگل گئی۔ پولیس رگھو کو لے گئی مگر ڈھونڈی ارتکاب جرم کے بعد سٹک گئی۔

رگھو بے ہوش ہے۔ شاید مر رہا ہے یا مر چکا ہے۔ اس کا مطلب ہے ڈھونڈی اسی عمارت کے کسی فلیٹ میں انڈر گراؤنڈ ہو گئی ہے مگر چوکی دار اندر سے تالا مار کر بیٹھ گیا ہے۔ صبح سے پہلے نہیں کھولے گا۔ مجھے سخت بے چینی ہے۔ چھوکرے چوکی دار پر آوازے کس رہے ہیں پر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ صبح جب پولیس ڈھونڈی کی تلاش میں آئے گی تب دروازہ کھلے گا۔

مجھے ڈھونڈی سے ڈر لگ رہا ہے۔ اُس نے پتی کی ناک چبا ڈالی۔ میں نے آج تک ایسی بات نہیں سُنی کہ کسی عورت نے غصہ یا رقابت میں پتی کی ناک کاٹی ہو۔ ہاں مردوں کی ناک تب ضرور کٹ جاتی ہے جب اُن کی بہن، بیوی یا بیٹی کسی کے سنگ بھاگ نکلیں یا حرام

کا بچہ جن بھیں، پر عورت ذات پربتی کی ناک سچ مچ کاٹ ڈالنا بالکل نہیں سجتا۔

میں بڑی ترقی پسند بنتی ہوں۔ عورت اور مرد کی برابری کی شدت سے قائل ہوں مگر ڈھونڈی کا ناک چبا ڈالنا بہت ویسا لگ رہا ہے۔ شاید اس لیے کہ دنیا کی تاریخ میں میرے علم کے حسابوں یہ پہلا حادثہ ہے۔

"ارے سالی چبا کے گٹ گئی، تھوکی بھی نہیں۔" نیچے منڈیر پر بیٹھا کوئی تبصرہ کر رہا ہے۔ "ہم نے بہت ڈھونڈی نہیں ملی شاید کسی کی چپل میں چپکی چلی گئی۔"

اور ڈھونڈی کسی بات کا جواب نہیں دیتی۔ اس کی چپ کا سناٹا میرے کانوں کے پردے پھاڑے دے رہا ہے۔ اف اس کی آنکھیں کہاں گم ہو گئی ہیں۔ ان میں کس بلا کا خالی پن ہے۔ آخر صبح ہو گئی۔ پھاٹک کا تالا کھلا مگر پولیس نہیں آئی۔ لوگ بالکنیوں پر کھڑے انتظار کر رہے ہیں۔ فٹ پاتھ پر بھی جماؤ جمے ہیں۔

ڈھونڈی سہمی ہوئی اتر کر فٹ پاتھ پر قدم تول تول کر چل رہی ہے ۔۔ بائی لوگ آپس میں بدبد کر رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں اس عورت کے لیے سہمی ہوئی نفرت ہے جیسے زہریلی ناگن نے کسی مقدس چیز کو ڈس لیا ہو۔

ڈھونڈی مجرم سہی بنی صفائی پیش کر رہی ہے۔ اس نے پتی دیو کی ناک نہیں کاٹی نشہ میں دھت جب وہ اس پر پل پڑا اور کپڑے پھاڑنے لگا تو اس نے کاٹا نوچا تو بہت مگر وہ پتی کی ناک ہرگز نہیں کاٹ سکتی۔ ہو سکتا ہے وہ اس کے ہونٹ چومنے جھکا ہو اور ناک ڈھونڈی کے دانتوں کی زد میں آگئی ہو۔ ہاں اس پر دھوکا خون تو برسا کیوں کہ اس کے جسم پر کوئی زخم نہیں۔ اس کے کپڑوں پر پتی کے خون کے داغ دھو کر بھی پوری طرح نہیں چھوٹے۔

مگر بائی لوگ اس سے آنکھیں چرا رہی ہیں۔ اس نے بڑی بے جا کی۔ پتی بھگوان سمان ہوتا ہے۔ خدائے مجازی ہوتا ہے۔ اکثر عورتوں نے اپنے پتیوں کا غیظ و غضب کی حالت میں خون کر دیا ہے اسیلے میں خنجر اتار دیا ہے۔ ڈھونڈی بھی اگر رگھوناتھ کا نرخرہ چبا ڈالتی ہی کی آنکھیں پھوڑ دیتی تو بھی کچھ نہ جاتا۔ مگر مرد کی ناک اُف وہ چاہے چاقو سے کاٹی جائے یا دانتوں سے بڑی گھناونی حرکت ہے جو ہرگز قابل معافی نہیں۔

دن ڈھلا دوپہر ہوئی اور سمندر پر ڈوبتے ہوئے سورج نے آگ سی لگا دی فضا میں نحوست سی طاری ہے۔ ڈھونڈی دیوار سے لگی بیٹھی ہے۔ نہ وہ گئی اور نہ کسی فلیٹ

سے اُس کی پکار آئی۔ نہ جانے کیوں سب ہی چاہ رہے تھے کہ رگھو مر جائے اور ڈھونڈی کو پھانسی ہو جائے کہ قصہ پاک ہو۔

کوئی پانچ ساڑھے پانچ کا عمل ہوگا کہ چرچ گیٹ اسٹیشن کی اور سے لونڈوں کی بھیڑ میں گھرا لمبا بانس جیسا رگھو ناتھ گھاٹے آتا دکھائی دیا۔ لونڈے اُچک اُچک کر اُس کی ناک دیکھ رہے تھے۔

رگھو کی ناک پر ٹانکوں تک کا نشان نہیں تھا۔ معجزہ ہوگیا، ضرور دھوبیلے نے کیس ہینڈل کیا ہوگا۔ بھئی کمال ہے نہ پھایا نہ پٹی۔ یہاں تک کہ کھرونچ تک نہیں۔ لوگ گُم سُم اُس کی ناک کو تک رہے ہیں۔ اور رگھو سب کی اور مشتبہ نظروں سے دیکھتا بکا چلا آرہا ہے۔

"کون بولا ناک کاٹا" رگھو بگڑ کر کھڑا ہوا۔ جب جاستی پیا تو ناک سے لہو آتا۔ پھر اس ہلکٹ نے ہم کو ٹکر مارا، ابھی ہم بے ہوش ہو گیا۔"

ایک دم ڈھونڈی چنگھاڑ چنگھاڑ کر رونے لگی اور سرپٹ مراٹھی میں نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔

بالکنیوں سے صاحب لوگ جھک جھک کر نہ جانے کیا کہہ رہے تھے۔ سب ایک دم بول رہے تھے اور کسی کو دوسرے کی بات سمجھنے کی فرصت نہ تھی۔ اور کچھ سمجھنے کی بات بھی نہ تھی۔ سب ہی کچھ بوکھلائے ہوئے تھے۔ رگھو جلدی جلدی ڈھونڈی کا گوڈ ٹریٹمنٹ رہا تھا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد مجمع کچھ مایوس سا ہو کر بکھر گیا۔ اتنے دھانسو ڈرامے کا انجام اتنا پُھس پُھسا۔ بجلی کے کھمبے کی روشنی میں رگھو کی ناک اور ڈھونڈی کے منہ سے خون اُبلتا دیکھ کر کسی منچلے نے پولیس کو فون کر دیا۔

ہسپتال کے ڈاکٹر بھی بے حد خفا تھے کہ نکسیر کے کیس کے لیے ان کی نیند حرام کی۔ پولیس شرمندہ تھی کہ غنڈوں نے جان بوجھ کر بے وقوف بنا دیا۔

خود میرے اوپر سخت کھسیان پن طاری تھا۔ جس کا الزام میں کسی نہ کسی پڑھوسنے کے منصوبے بنا رہی تھی۔ میں جو خود کو نہایت روشن خیال دکھی طبقہ کا ہمدرد اور عام انسان سے بے حد قریب سمجھتی ہوں، ان کے بارے میں بس اتنا جانتی ہوں کہ نکسیر کو قتل کی واردات یقین کر بیٹھی ہوں۔ مرد و عورت کے برابر حقوق کی علم بردار ہوں۔ ناک کاٹتا ہے تو نفرت کرتی ہوں مگر عورت مرد کی ناک کاٹے تو دہل جاتی ہوں۔ اُف کتنی شرم کی بات ہے